2014ء کی
بہترین ایجادات

شہید ٹیچر کے
بریگیڈیئر شوہر کا نذرانۂ عقیدت

بھارت میں پاکستانی
ڈراموں کی مقبولیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

دعا مانگنے کے آداب

جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ جب دعا مانگیں تو چاہیے میرا حکم مانیں۔O (سورۃ البقرہ:186:2)

اس کو پکارو خالص اس کی بندگی کرتے ہوئے۔ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔O (سورۃ مومن:65:40)

اور تمھارے رب کا ارشاد ہے کہ تم مجھ سے دعا مانگو کہ میں تمھاری دُعا قبول کروں۔O

(سورۃ مومن:60:40)

رسول ﷺ کا فرمان

دعا پورے اعتماد سے مانگیں

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص جب دعا مانگے تو بڑے عزم و اعتماد سے اللہ تعالیٰ سے سوال کرے۔ یہ ہرگز نہ کہے: اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھے دے دے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جسے کوئی مجبور کرنے والا نہیں ہے۔'' (امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرتا ہے اپنی خوشی اور مرضی سے کرتا ہے اس لیے بندے کو یہ شرط لگانا کہ اگر تو چاہے تو ایسا کر دے مناسب نہیں۔ اس میں ایک طرح کی بے پروائی جھلکتی ہے۔ غلام کو چاہیے کہ اپنے آقا سے بہ اصرار اور گڑگڑا کر مانگے۔ اور اس حقیقت کا علم کہ دینا مناسب ہے یا نہ دینا اس کے لیے چھوڑ دے وہ بہتر جانتا ہے)۔''

(بخاری کتاب 80: باب: 21 مسلم کتاب الذکر۔ باب 3)

BMA
Since 1952
60 سال سے زائد عرصے سے
®
چلڈرن سیرپ
بچوں کی اچھی صحت اور
بہترین نشوونما کے لیے
BMA
120 ملی لیٹر
چلڈرن سیرپ
بچوں کی اچھی صحت اور
بہترین نشوونما کے لیے
/BMA.PHARMA

تبدیلی کا سال

۱۶ دسمبر کو پیش آنے والے سانحہ پشاور نے ہمارے دل زخمی کر دیے۔ ہر آنکھ اشکبار ہے۔ یہ سانحہ ماؤں اور بچوں کے دل و دماغ پر بہت گہرے اور عدم تحفظ کے اثرات چھوڑ گیا۔ جس دن سے یہ واقعہ پیش آیا ہے، میری بچی گھر سے باہر جانے سے گھبرانے لگی ہے۔ اکثر اوقات ٹی وی دیکھتے دیکھتے زاروقطار رونے لگتی ہے۔ وہ مجھ سے کئی طرح کے سوالات پوچھتی ہے جن میں سے اکثر کے جوابات میرے پاس نہیں ہیں۔

پشاور سانحہ میں شہید ہونے والے بچوں کے والدین کو دلاسہ دینے کی ہمت بھی مجھ میں نہیں ہے۔ صرف دعا... کہ اللہ تعالیٰ شہدا کے وارثین کو صبر جمیل عطا کرے اور پھر کبھی ہماری سرزمین اس طرح کے حادثے سے دوچار نہ ہو اور ان کی قربانی رائیگاں نہ جائے۔

بڑے دکھ اور کرب کی بات ہے کہ ہمارا ملک پچھلے عشرے سے حالت جنگ میں ہے لیکن ہماری قوم اور ارباب اختیار نے اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ آپ کو یاد ہوگا جب مشرف نے نائن الیون کے واقعہ کے بعد امریکا اور نیٹو کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور قوم کو "سب سے پہلے پاکستان" کا نعرہ دیا تو ساتھ ہی ملک میں روشن خیالی کے نام پر فیشن شوز، کیٹ واک، میراتھن اور بسنت بہار کے میلے شروع ہو گئے۔ ملک میں ایک طرف ڈرونز اپنا کام دکھا رہے تھے اور دوسری طرف نیٹو اور اتحادی فورسز افغانستان میں کارروائیاں کر رہی تھیں۔ جس کا ردعمل آنا فطری تھا۔ ہماری افواج ملک کی سرحدوں پر اور ملک کے اندرونی مقامات پر بہادری سے لڑتے ہوئے قربانیاں دے رہی تھیں۔ لیکن قوم کو اس جنگ کے لیے تیار نہیں کیا گیا۔ ملک کی مقبول لیڈر بےنظیر بھٹو کو شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد دہشت گردی کے واقعات کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ملک میں دو انتخابات بھی منعقد ہوئے جس کے نتیجے میں مرکز اور صوبوں میں مختلف سیاسی جماعتوں کی حکومتیں قائم ہوئیں اور ان کے لیڈر بھی دہشت گردی کا نشانہ بنتے رہے۔ لیکن پچھلے پانچ سال کرپشن کے اسکینڈلز اور عدلیہ کے ساتھ محاذ آرائی میں گزار دیے اور

جنوری 2015ء
ربیع الاول 1436ھ
جلد 55 شمارہ 1

urdudigest.com www.urdudigest.pk

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی
سید محمد محمود
غلام محی الدین
حافظ فاروق حسن، نوید اسلم صدیقی، سمیع اعوان
فاروق اعجاز قریشی
افنان کامران قریشی
خادم الدین
عبدالرحمن، اشرف سکندر

ڈائریکٹر: [illegible] اعجاز قریشی 0300-8460093

advertisement@urdu-digest.com
منیجر ایڈورٹائزمنٹ: محمد سلیمان احمد 0300-4116792
لاہور: ندیم حامد گوجرانوالہ: احسن الدین
اسلام آباد: محمد سلیم کراچی: شازیہ قمر 0345-2558648

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdu-digest.com
19/21 سید محمد سمن آباد، لاہور فون 92 42 37589957
پاکستان 1500 روپے، 1000 روپے
بیرون ملک 60 امریکی ڈالر
بیرون ملک سے خریداری کی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A C No. 600380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore)
Branch Code No. 110

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdu-digest.com

[illegible] قریشی نے [illegible] 24 [illegible] سے چھپوا کر [illegible] سے شائع کیا

حیرتوں اور حقیقتوں کے ملاپ سے جنم لینے والی دلچسپ سرگزشت

رضی الدین سید

راشدہ علوی

سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے
سرکہ بہترین سالن ہے۔ اے اللہ تو سرکہ میں برکت
ڈال کہ یہ مجھ سے پہلے نبیوںؑ کا سالن تھا اور وہ گھر
غریب نہ ہوگا جس میں سرکہ موجود ہے۔ (ابن ماجہ)
Doctor's
GRAPE VINEGAR
Doctor's
JAMBOLAN VINEGAR
Doctor's
Natural
T.M.
Doctor's
Unpasteurized, Unfiltered & Living
Natural
With Mother
100% Pure
انتہائی خالص اور پاک وصاف
WONDERFUL DRUG OF YESTERDAY & TODAY
کھٹاس بڑھانے کیلئے تیزاب یا ترش اشیاء سے پاک بغیر کسی مصنوعی خوشبو اور رنگ کی آمیزش کے صاف ستھرے پھلوں سے تیار کردہ۔
آسان ترکیب
روزانہ ایک سے تین بار کھانے سے آدھا گھنٹہ پہلے دو ڈھکن A.C.V ایک گلاس پانی میں ڈال کر پینے سے بھی۔
وزن کم کرتا ہے پیٹ اور کولہوں کی فالتو چربی تحلیل کر کے سمارٹ بناتا ہے۔
کولیسٹرول کم کر کے بلڈ پریشر، امراض دل اور فالج سے بچاؤ میں معاون ہے۔
شوگر کنٹرول کرنے میں مدد کرتا ہے۔ نظام انہضام، جگر اور پتے کی اصلاح کرتا ہے۔
ACV کا روزانہ استعمال جسم کو چستی اور توانائی دیتا ہے۔
Osteoporosis اور جوڑوں کے درد میں کمی کرتا ہے۔
چہرہ کی خوبصورتی اور کینسر سے بچاؤ میں معاون انتہائی خالص اور پاک وصاف قدرتی انگوری سرکہ بھی دستیاب ہے۔
شوگر کنٹرول اور دیگر فوائد کیلئے انتہائی خالص اور پاک وصاف قدرتی سرکہ جامن استعمال کریں۔
ڈاکٹر اصغر علی (ایم۔بی۔بی۔ایس) 0321-8823321
حافظ مبشر علی 0321-9785644
62-P مرغزار کالونی، ملتان روڈ، لاہور۔
طاہر جاوید لاہور 0321-4435960
کراچی 0300-2486243
اسلام آباد 0321-4585442 0512558079
وہاڑی 0300-7722899 067-3362310
ڈسکہ 0321-6144189
دینہ 0300-9518621
پشاور 0300-9596240 0344-3202020
جہانیاں 0306-7821929

سرد و خشک موسم میں اپنی
جلد کو دیجئے بھرپور تحفظ
TIBET
TIBET
تبت کولڈ کریم
تبت حنی لوشن
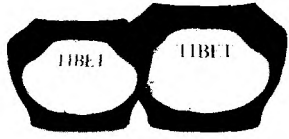
پشاور کے بعد قوم جس طرح دہشت گردی کے خلاف متحد ہوئی ہے اور ہر قربانی کے لیے آمادہ ہے، وہ ایک تابندہ مستقبل کی نوید ثابت ہو سکتی ہے۔ ہماری مسلح افواج سالہا سال سے دہشت گردوں کی یلغار کے آگے صف آرا ہیں اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہی ہیں۔ اس خونریز جنگ میں پچاس ہزار شہری بھی موت کی آغوش میں جا چکے اور پاکستان کو معاشی طور پر ساٹھ ارب ڈالروں کا نقصان ہو پہنچا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہمارے ارباب اقتدار عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے اور عوام کو غربت اور جہالت کی تاریکیوں میں دھکیلتے رہے۔ وہ اپنی سکیورٹی پر لامحدود وسائل خرچ کرتے جبکہ ملکی داخلی سلامتی سے غافل رہے۔ اب جب آرمی پبلک اسکول پشاور میں لوگوں نے پھول سے بچوں کو درندوں کے ہاتھوں ذبح ہوتے دیکھا، تو وہ غم اور غصے کی حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے، تب ہمارے حکمرانوں کو بھی احساس ہوا کہ اگر دہشت گردی کا مکمل صفایا نہ کیا گیا، تو پاکستان کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی اور تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ آخری دہشت گرد اور اس کے معاونوں کے خاتمے تک ہم آپریشن جاری رکھیں گے اور عوامی حمایت سے یہ جنگ ضرور جیت جائیں گے۔

ہم نے یہ خوش آئند منظر بھی دیکھا کہ وزیراعظم کی دعوت پر پارلیمان کے تمام قائدین پشاور پہنچے۔ انھوں نے عظیم الشان قومی جذبے کا مظاہرہ کیا اور اتفاق رائے سے ایک قومی ایکشن پلان بھی منظور کر لیا۔ اس پلان پر عمل درآمد کے لیے وزیراعظم کی سربراہی میں ایک نگران کمیٹی بھی بنا دی گئی اور پندرہ ذیلی کمیٹیاں بھی تشکیل پا چکی ہیں۔ ان میں سب سے اہم وہ کمیٹی ہے جس نے آئین اور قانون میں ایسی ترامیم پیش کرنا ہیں جو فوجی عدالتوں کے لیے آئینی جواز پیدا کر سکیں گی۔ یہ تمام کام ہنگامی بنیادوں پر کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت اور فوج اس چیلنج کو غیرمعمولی سنجیدگی سے لے رہی ہیں اور تیز تر مشاورت کا عمل جاری ہے۔ ہم ان کوششوں کی کامیابی کے لیے دعاگو ہیں اور اپنی قوم سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ دہشت گردی کی لعنت سے نجات پانے کے لیے ہر قسم کی بازی لگا دے۔ قانونی موشگافیوں میں الجھنے کے بجائے اصل اہداف پر نگاہ مرتکز رکھے اور فوج کے شانہ بشانہ کھڑی نظر آئے۔ ان سیاہ اور سفاک چہروں کو تختہ دار پر لٹکانے کے ساتھ ساتھ جو انسانوں کے سروں سے فٹ بال کھیلتے اور بچوں کو ذبح کرتے ہیں، ہمیں اس مائنڈ سیٹ کو تبدیل کرنے کے لیے ایک مشنری جذبے سے کام کرنا ہوگا جو ہماری اخلاقی، انتظامی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی بگاڑ اور تباہی کا ذمے دار ہے۔ یہ وہ مائنڈ سیٹ ہے جو معاشرے کے ہر طبقے میں اوپر سے نیچے تک پایا جاتا ہے اور اس کا سامنا روزمرہ زندگی میں قدم قدم پہ ہوگا۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے اور قطار توڑنے والے، کمزوروں کے حقوق

غصب کرنے والے اپنے پیشوں میں رشوت کی آگ بھڑکانے والے ٹیکس چوری کرنے والے دفتروں اور تعلیمی اداروں میں اپنے فرائض سے کوتاہی برتنے والے اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے والے طاقت کے زور پر اپنی بات منوانے والے اور ایک فرد کو ناحق قتل کر دینے والے اور بستیاں اجاڑ دینے والے ایک ہی خطرناک ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ اس ذہنیت کو تبدیل کرنے کے لیے تعلیم و تربیت اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے مستقل بنیادوں پر جہاد کرنا ہوگا۔ ہماری آج سب سے بڑی ضرورت ہمارے ذہنی رویوں میں ایک عظیم تغیر پیدا کرنا ہے۔

دوسری اہم بات صحیح ترجیحات کا تعین ہے۔ ہمارے منصوبہ سازوں کو داخلی سلامتی کی اہمیت اور تقاضوں کا ٹھیک ٹھیک ادراک بے حد ضروری ہے۔ ہماری غلط ترجیحات اور ہمارے غیر متوازن رویوں نے پاکستان کا پورا انفراسٹرکچر تباہ کر ڈالا ہے جس کے باعث سیکیورٹی کے ادارے صحیح طور پر کام کر رہے ہیں نہ تحقیقاتی ایجنسیوں کے درمیان ایک مضبوط اور مربوط کوآرڈینیشن موجود ہے کیونکہ وہ مجرموں اور دہشت گردوں کے بجائے سیاسی اور معاشی مفاد کا تعاقب کرتی رہی ہیں۔ مزید برآں سیاسی جماعتوں کے اندر اور سول اور فوجی قیادتوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش بڑے بڑے بحران پیدا کرتی رہی۔ اس لیے ایک طرف وزیراعظم کو پوری سنجیدگی کے ساتھ نئی اتھارٹی کے ذریعے قومی سلامتی کے خدوخال کی صورت گری کے علاوہ اس کے لیے وسائل مہیا کرنا ہوں گے اور دوسری طرف سیاسی جماعتوں کے اتحاد اور یگانگت کو قائم رکھنے کے لیے آپس کے اختلافات طے کر لینا ازبس لازم ہے۔ اگر ایک بار پھر سیاسی بے یقینی عود کر آئی تو دہشت گردوں کو اپنے ناپاک منصوبوں پر عمل کرنے کا موقع مل جائے گا۔

پوری قوم شدت سے محسوس کر رہی ہے کہ ہم چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں اور اس کے اندر ایک ہیجانی کیفیت پائی جاتی ہے، مگر ریاست جو ایک ماں کی طرح شفیق ہوتی ہے اسے سخت سے سخت قدم بھی سوچ سمجھ کر اور مہذب انداز میں اٹھانا چاہیے۔ اس امر کا پورا پورا خیال رکھنا ہوگا کہ فوجی عدالتوں سے کسی بے گناہ کو سزا نہ دی جائے اور ان عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس طرح یہ بات بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ دہشت گردوں سے وابستہ سیاسی اور معاشی مفادات ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نظریاتی اسباب کا بھی قلع قمع کیا جائے۔ اس کے لیے حکومت کو راست فکر علما اہل دانش اہل قلم اور میڈیا کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ ہمارے تجربے کے مطابق ملک میں ادارے بھی موجود ہیں انتہائی قابل ماہرین بھی اور تجربے کار تنظیمیں بھی، مگر وہ سیاسی مداخلت اور کرپشن کے غیر معمولی پھیلاؤ کے باعث غیر فعال ہیں اور تمام تر بار گراں فوج پر آن پڑا ہے۔ کمیاں اور کمیوں کے دائرے سے باہر آ کر ہماری مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتیں اس پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیں کہ ان کا ہر فیصلہ اور بڑے مناصب پر تقرر میرٹ کے مطابق ہوگا، قرابت داروں کا حکومت میں کوئی عمل دخل نہیں ہوگا، پولیس کے سربراہ خود مختار ہوں گے اور انٹیلی جنس کے ادارے سیاسی شخصیتوں کے بجائے مجرموں کا تعاقب کریں گے جبکہ حکمران اور حکام سادہ زندگی کا نمونہ پیش کریں گے تو ہر سو توانائی کے چشمے بہہ نکلیں گے دہشت گردوں کو کہیں بھی جائے پناہ نہیں ملے گی اور قوم جنگ جیتنے کے لیے میدان میں اتر آئے گی۔ اور یہی ہماری تاریخ کا فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوگا۔"

الطاف حسن قریشی

ایک بلند پایہ قانون داں جنھوں نے آمریت کا مردانہ وار مقابلہ کر کے قومی عدلیہ کی تاریخ میں زندہ و تابندہ روایت قائم کر دی

انٹرویو پینل: الطاف حسن قریشی، نجیب اعجاز قریشی اور نصیر احمد سلیمی

ہم

کراچی کی ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے بنگلے میں جس عظیم المرتبت شخصیت سے انٹرویو کر رہے تھے انھیں قومی ہیرو کا مقام حاصل ہے کہ انھوں نے ۲۰۰۰ء کے اوائل میں پی سی او (پروویژنل کنسٹی ٹیوشن آرڈر) پر حلف اٹھانے سے کمال جرأت اور بلند ہمتی سے انکار کر دیا تھا اور ہماری عدالتی تاریخ کے صفحات پر ایک تابندہ روایت کا لازوال نقش ثبت کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ وہ اعلیٰ فوجی حکام کی چکنی چپڑی باتوں اور خوفناک دھمکیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آئین کی بالادستی پر ڈٹے رہے اور ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا جس پر قوم فخر کرتی رہے گی۔ پچھلے دنوں ملک میں ایسے حالات پیدا ہوئے جن میں عدالت عظمیٰ کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوتا گیا۔ یوں لگا کہ وہ ایک فیصلہ کن کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں آگئی ہے چنانچہ ہم نے محسوس کیا کہ سابق چیف جسٹس سعید الزماں صدیقی سے نہایت حساس موضوعات پر تبادلہ خیال ہمارے قارئین کے لیے بہت مفید رہے گا۔ اس کے علاوہ ان عوامل کا سراغ لگانا بھی غایت درجے دلچسپی کا باعث ہوگا جنھوں نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ان سے کئی بار پہلے بھی ملاقاتیں رہیں اور ہر ملاقات نے ان کی فکری اصابت اور ذہنی استحکام کا احساس دلایا۔ ان کا مزاج سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا دلکشا بھی ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ ستر کے پیٹے میں تھے لیکن وہ کرسی پر اس طرح تن کر بیٹھے تھے جیسے وہ پوری طرح تازہ دم ہوں اور ایک مشنری جذبے نے انھیں ماہ و سال سے ماورا کر دیا ہو۔

میرا ان سے پہلا سوال تھا کہ عدالت عظمیٰ کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچنے کی پوری کہانی کیا ہے اور آپ کی تربیت میں خاندان، اساتذہ اور آپ کے تجربات کا حصہ کیا کیا ہے؟ انھوں نے کسی تامل کے بغیر اپنے حالات زندگی سنانا شروع کر دیے جو سادہ ہونے کے باوجود نہایت دلچسپ لگے:

''نومبر ۱۹۳۷ء میں کلکتے میں پیدا ہوا جہاں میرے پردادا لکھنو سے ہجرت کر کے گئے تھے جن کا بہت اچھا کاروبار

تھا۔ میرے والد صاحب اپنے خاندان میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے پہلے فرد تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں میرے دادا جی کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے بجائے ریلوے میں ملازمت اختیار کر لی لیکن جب اسی سال جاپان نے کلکتے پر بمباری کی تو ہم دوبارہ لکھنو آ گئے۔ میں نے ابتدائی تعلیم اسی شہر میں حاصل کی لیکن میٹرک ڈھاکے سے کیا کیونکہ تقسیم ہند کے بعد ہم نے پاکستان ہجرت کر لی تھی۔"

ڈھاکے کا ذکر آیا تو میں نے پوچھا اس وقت وہاں حالات کیسے تھے اور آپ نے کیا تاثر لیا تھا؟ جسٹس صاحب نے بڑی صفائی سے جواب دیا:

"ہم نے وہاں آباد ہونے کی بڑی کوشش کی مگر ماحول کچھ سازگار نہیں تھا اور وہاں نفرت پائی جاتی تھی۔ دراصل مغربی پاکستان سے جو افسر وہاں بھیجے گئے انھوں نے حالات بہت خراب کیے تھے کیونکہ اُن کا بنگالیوں کے ساتھ رویہ اہانت آمیز تھا۔ میں نے جگن ناتھ کالج ڈھاکہ سے انٹر سائنس میں کیا۔ اس وقت تک وہاں اردو زبان کے مسئلے پر خونیں فسادات ہو چکے تھے اور "شہید مینار" تعمیر کر لیا گیا تھا۔ پھر ۱۹۵۴ء میں وہاں انتخابات ہوئے جن میں "جگتو فرنٹ" نے مسلم لیگ کو عبرت ناک شکست دی۔ مولوی فضل الحق کی حکومت بنی مگر چٹاگانگ پیپر مل میں ہولناک فسادات ہوئے جو کھلنا تک پھیل گئے۔ ان کے نتیجے میں گورنر راج نافذ ہوا اور فضل الحق کی حکومت ختم کر دی گئی جس میں شیخ مجیب الرحمان وزیر تھا۔ ہم ۱۹۵۶ء کے دستور کی تدوین سے پہلے ہی کراچی آ گئے تھے اور مسلم لیگ کوارٹرز میں رہنے لگے۔ بی اے میں نے ایم اے قریشی کالج سے کیا جو ٹین کی چادروں سے بنایا گیا تھا، مگر وہاں کے اساتذہ بہت قابل اور فرض شناس تھے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ بی اے آنرز کرنے کے بعد ایس ایم لا کالج سے قانون کی ڈگری لی۔"

میں نے پوچھا، آپ اکنامکس سے قانون کی طرف کیسے مائل ہوئے۔ انھوں نے ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ کہنے لگے:

"میرے پڑوس میں ایک معروف قانون دان غلام علی میمن رہتے تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ایم اے کرنے کے

بجائے قانون کی تعلیم حاصل کرو، وکالت ایک معزز پیشہ ہے اور اس میں بڑی آزادی ہے۔ گھر والوں نے بھی میمن صاحب کے مشورے کو درست سمجھا۔ چنانچہ میں نے ۱۹۶۰ء میں ایس ایم لا کالج سے لا کیا جس کے پرنسپل حسن علی عبدالرحمان تھے جن کے چھوٹے بھائی طفیل علی عبدالرحمان جنرل یحییٰ خاں کے زمانے میں سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنے، مگر بھٹو صاحب ان سے ایک معاملے میں سخت ناراض ہو گئے تھے۔''

اتنے میں چائے آ گئی اور سلسلۂ کلام ٹوٹ گیا جبکہ میں اس واقعے کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے بے قرار تھا جو دونوں کے درمیان تنازع کا باعث بنا تھا۔ میرے چہرے پر تجسس کے آثار دیکھتے ہوئے جسٹس صاحب نے رواں لہجے میں کہنا شروع کیا:

''سیشن جج سانگھڑ نے ایک ایسے شخص کو ضمانت پر رہا کر دیا جسے بھٹو صاحب سزا دلانا چاہتے تھے۔ اس پر انھوں نے سیشن جج کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے۔ انھوں نے ضمانت کے لیے ہائی کورٹ میں درخواست دی۔ چیف جسٹس طفیل علی عبدالرحمان نے انھیں ضمانت پر رہا کر دیا اور ان کی گرفتاری پر احتجاج بھی کیا۔ اس پر بھٹو صاحب ناراض ہو گئے۔ وہ اپنی ناراضگی کا اظہار مختلف انداز میں کرتے تھے اور متعلقہ شخص کی بے عزتی کرنے پر بہت خوش ہوتے تھے۔ میں اس ضمن میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جو ان کی جبلت کا مظہر ہے۔ ہمارے زمانے میں غلام علی رانا ایڈیشنل جج تھے اور انھیں کنفرم نہیں کیا جا رہا تھا۔ جب ان کی کنفرمیشن کا وقت آیا تو بھٹو صاحب نے انھیں اسلام آباد بلایا۔ ان دنوں ایوانِ صدر راولپنڈی میں تھا اور صدر بھٹو کے دفتر میں صرف دو کرسیاں رکھی ہوتی تھیں۔ ایک پر وہ خود بیٹھتے اور دوسری کرسی پر ملاقاتی۔ جج صاحب سے ملاقات کرتے وقت دوسری کرسی اٹھا لی گئی۔ وہ بیچارے شریف آدمی تھے، بھٹو صاحب کے سامنے کھڑے رہے اور کہا کہ آپ نے مجھے یاد کیا ہے۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے علاوہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے رہے کہ ابھی تک آپ کو جج کی حیثیت سے کنفرم نہیں کیا گیا۔ جب وہ جانے لگے تو بھٹو صاحب نے کہا کہ میرے قریب

آ جایئے۔ جب وہ قریب گئے تو بھٹو صاحب نے پوچھا' جج صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کو بیٹھنے کے لیے کرسی کیوں نہیں دی؟ پھر خود ہی کہنے لگے کہ میں جب طالب علم تھا اور پاسپورٹ بنوانے پاسپورٹ آفس گیا' تو آپ کے والد پاسپورٹ افسر تھے۔ انھوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے کرسی نہیں دی تھی' اس لیے میں نے آج آپ کو کھڑا رکھا تھا۔''

ہم اس واقعے سے مبہوت ہو کے رہ گئے کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص اس قدر تنگ ذہنیت کا ثبوت بھی دے سکتا ہے۔ میرے ذہن کی اسکرین پر اور بہت ساری تصویریں اُبھرنے لگیں جو بڑی روح فرسا تھیں۔ میں نے اپنے ذہن کو جھٹکا دیا اور اپنی توجہ دوبارہ جسٹس صاحب کے منظر در منظر سفر پر مرکوز کر دی اور اُن سے پوچھا کہ آپ وکالت میں کب آئے اور اس کے اندر کے پیچ و خم کیسے لگے تھے؟ انھوں نے داستان حیات کے ورق الٹتے ہوئے کہا:

''یہ پیشہ ۱۹۶۱ء میں اختیار کیا اور جناب ادریس قریشی کے چیمبر میں ایک سال تک ائرنی کے طور پر کام کرتا رہا۔ مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے میں نے ۱۹۷۰ء میں پی پی آئی بلڈنگ میں اپنا دفتر قائم کر لیا۔ کچھ عرصے بعد شریف الدین پیرزادہ بھی میرے برابر والے کمرے میں شفٹ کر گئے اور اُن سے بہت میل جول ہو گیا۔ وہ جنرل یحییٰ خاں کے دورِ حکومت میں اٹارنی جنرل تھے۔ جب عاصمہ جیلانی کا کیس عدالت عظمیٰ میں آیا' تو یحییٰ خاں کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے حکومت سنبھالتے ہی شریف الدین پیرزادہ کی فائل نکلوائی اور اُنھیں برطرف کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ لیکن شریف الدین پیرزادہ بڑے سیانے اور دور اندیش نکلے اور فوراً استعفیٰ دے دیا۔ اس زمانے میں تمام دوست اُن کا ساتھ چھوڑ گئے تھے اور میں واحد شخص تھا جو اُن کا ساتھ دیتا تھا۔ بھٹو صاحب نے اُن کا نام ای سی ایل میں ڈال دیا۔ شریف الدین پیرزادہ بھٹو کے دورِ حکومت میں خاموش رہے اور جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں پہلے وزیرِ خارجہ اور بعد ازاں وزیرِ قانون مقرر ہوئے۔

☆☆

سابق چیف جسٹس جناب سعید الزماں صدیقی جو بہت سارے رازہائے سربستہ کے امین ہیں' اُن کی باتیں ہمیں بہت دلچسپ لگیں اور یہ جاننے کی جستجو پیدا ہوئی کہ عاصمہ جیلانی کیس کی ہماری قومی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ انھوں نے سادہ الفاظ میں کہنا شروع کیا:

''عاصمہ جیلانی کیس واحد کیس ہے جس میں فیصلہ آیا کہ جنرل یحییٰ خاں غاصب ہے۔ چیف جسٹس حمود الرحمان نے فیصلہ دیا تھا جو آج بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ بھٹو کی حکومت کی برطرفی کے بعد نصرت بھٹو کیس کا جو فیصلہ سپریم کورٹ نے دیا، اس پر بھی عاصمہ جیلانی مقدمے کا فیصلہ سایہ فگن رہا تھا۔

''اصل میں ہوا یہ تھا کہ یحییٰ خان کے دور میں عاصمہ جیلانی کے والد غلام جیلانی قید کر لیے گئے۔ اس پر اُن کی بیٹی عاصمہ جیلانی نے لاہور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی۔ وہاں عبدالعزیز خاں چیف جسٹس تھے جنھوں نے رٹ خارج کر دی۔ اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی۔ اس وقت حمود الرحمان چیف جسٹس تھے۔ اس میں سب ججوں کا متفقہ فیصلہ

سامنے آیا جو ڈوسو کیس میں دیے گئے سپریم کورٹ کے فیصلے سے یکسر مختلف تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ طاقتور فیصلہ جسٹس یعقوب علی نے لکھا جس کا عدالتوں کے اندر حوالہ دیا جاتا ہے۔ انھوں نے قدرے گہرائی سے آئینی اور قانونی نکات کا جائزہ لے کر بڑی صراحت اور تفصیل سے فیصلہ لکھا تھا۔ فیصلہ سنانے والا بنچ سات جج صاحبان پر مشتمل تھا۔''

جسٹس صاحب نے اپنی گفتگو میں ڈوسو کیس کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے سوال کیا کہ ہماری تاریخ پر کون کون سے عدالتی فیصلے اثر انداز ہوئے اور آپ آئندہ سپریم کورٹ کا کردار کیسا دیکھتے ہیں؟ انھوں نے تاریخی حوادث کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان کرتے ہوئے کہا:

''میں آپ کو بڑے بڑے عدالتی فیصلوں کے بارے میں بتائے دیتا ہوں۔ ایک بڑا فیصلہ تمیزالدین خان کیس میں ہوا جو ۱۹۵۴ء میں سامنے آیا۔ اس کے بعد ڈوسو کیس بہت اہم ہے جس میں چیف جسٹس محمد منیر نے ایوب خان کے فوجی انقلاب کو سند جواز عطا کی اور اس میں ''کامیاب انقلاب'' کا نظریہ ایجاد ہوا۔ یہ ۱۹۵۸ء میں فیصلہ ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں یحییٰ خان کے غاصب ہونے کا فیصلہ سامنے آیا۔ اس کے بعد نصرت بھٹو کا کیس آیا جس کا فیصلہ چیف جسٹس انوار الحق نے سنایا اور جنرل ضیاءالحق کی فوجی بغاوت کو جائز قرار دیا تھا۔''

جسٹس صاحب نے چار اہم عدالتی فیصلوں کا حوالہ دیا جو ہماری تاریخ پر غیرمعمولی طور پر اثر انداز ہوئے تھے اور ان کے اثرات آج بھی محسوس کیے جاتے ہیں' چنانچہ میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان میں ہمارے بڑے وکلا اور قانون دانوں کا رول کیا رہا؟ اُن سے پوچھا کہ عاصمہ جیلانی کیس میں کون سے نامور وکیل پیش ہوئے اور کیا دلائل دیے تھے؟ انھوں نے بے ساختہ کہنا شروع کیا:

''شریف الدین پیرزادہ اس وقت اٹارنی جنرل تھے' لیکن انھوں نے کہا کہ میں ریاست کے بجائے عدالت کے معاون کے طور پر پیش ہوں گا۔ ریاست کی طرف سے اے کے بروہی پیش ہوئے۔ انھوں نے وہ دلائل دیے جن پر ڈوسو کیس کا فیصلہ ہوا تھا' جبکہ شریف الدین پیرزادہ نے وہ لائن اختیار نہیں کی۔ وہ بہت ہوشیار آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جب آئین موجود ہے، تو اس کے مطابق امورِ مملکت چلانا ضروری ہیں۔ انہی کے دلائل پر جنرل یحییٰ خاں کو غاصب قرار دیا گیا جو ججوں کو پسند آئے تھے۔ انھوں نے یہ بھی فیصلہ دیا کہ اگر عوام کی فلاح میں کوئی اچھا قدم اٹھ چکا ہوتا' تو آپ اسے ریورس نہیں کریں گے' یعنی ججوں نے ماضی میں جو فیصلے اس بنیاد پر دیے ہیں' ان پر نظرثانی نہیں ہوگی۔ میرے خیال میں ''نظریہ ضرورت'' میں بھی کوئی خرابی نہیں۔ ہمارے ہاں جو خرابی پیدا ہوئی وہ یہ ہے کہ اسے قانونی جواز کا نظریہ بنا دیا گیا۔ آپ چیف جسٹس منیر کا فیصلہ پڑھیں' تو آپ اس کی معقولیت کے قائل ہو جائیں گے۔''

انٹرویو کے بعد میں نے نظریہ ضرورت' کے بارے میں چیف جسٹس منیر کا ایک لکھا ہوا نوٹ پڑھا جس میں تحریر تھا:

''ہم ایک خندق کے کنارے آ پہنچے ہیں جہاں ہمارے سامنے تین راستے ہیں۔ (۱) جس راہ سے ہم یہاں تک آئے ہیں' اسی راہ واپس مڑ جائیں۔ (۲) خندق پر ایک قانونی پل تعمیر کر کے اسے عبور کر لیں۔ (۳) خندق میں چھلانگ لگا کر تباہی کا شکار ہو جائیں۔''

میں نے محسوس کیا کہ ریفرنس نمبر ایک میں فیڈرل کورٹ نے گورنر جنرل ملک غلام محمد اور جسٹس منیر کی کھودی ہوئی

خندق کو عبور کرنے کے لیے جو قانونی پل فراہم کیا تھا‘ وہ قانونی ضرورت کے ستونوں پر کھڑا تھا۔

جناب صدیقی نے تاریخی واقعات کو ترتیب دیتے ہوئے اپنی گفتگو جاری رکھی:

’’میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں۔ ۱۹۵۴ء میں جب تمیز الدین کیس چلا‘ تو سندھ چیف کورٹ نے گورنر جنرل کے اقدام کو غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دے دیا‘ جبکہ چیف جسٹس منیر نے میرٹ پر فیصلہ دینے کے بجائے کہا کہ سندھ چیف کورٹ نے جو رٹ جاری کی ہے‘ اس کا اُسے قانونی اختیار حاصل نہیں‘ کیونکہ وہ آرٹیکل اے ۲۲۳ کے تحت جاری ہوئی ہے جس کی توثیق گورنر جنرل نے نہیں کی تھی‘ اس لیے یہ لاگو نہیں ہوتی۔ اب وہ فیصلہ تو آ گیا‘ لیکن اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک جتنے قانون بنے تھے‘ وہ کالعدم قرار پائے۔ ان میں کسی پر بھی گورنر جنرل کے دستخط نہیں تھے۔ پھر یوسف پٹیل کیس میں جسٹس منیر ہی کا فیصلہ ہے کہ جتنے قوانین کالعدم ہو چکے ہیں‘ اُن کی پچھلی تاریخوں سے منظوری دینا گورنر جنرل کے اختیار میں نہیں۔ یوں ایک ہولناک قانونی بحران پیدا ہو گیا اور حکومت نے اس خطرناک صورت حال کا حل تلاش کرنے کے لیے فیڈرل کورٹ کو ریفرنس نمبر ایک بھیجا۔

’’جب یہ ریفرنس جسٹس منیر کے پاس آیا، تو اس نے فیصلہ دیا کہ نئی اسمبلی بنے گی اور اس میں سارے قوانین پیش ہوں گے۔ اگر یہ قوانین پاس ہوئے، تو لاگو ہوں گے ورنہ ختم ہو جائیں گے۔ یہ ہے نظریہ ضرورت جو جسٹس منیر نے ریفرنس نمبر ایک میں نکالا، تو یہ فیصلہ اپنی جگہ بالکل درست تھا۔ اس کے بعد نئی اسمبلی بنی جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں طرف کے نمائندے آئے جنھوں نے کالعدم قوانین کی توثیق کی اور ۱۹۵۶ء کا دستور منظور کیا تھا۔‘‘

ماضی کے واقعات سے یہ بات واضح ہوتی جا رہی تھی کہ اقتدار کے پجاریوں نے قانون اور آئین پر بار بار شبخون مارے اور بار بار خطرناک صورت حال پیدا ہوئی تھی۔ اب میں شیر دل جسٹس سعید الزماں صدیقی سے اس شبخون کا حال سننا چاہتا تھا جو جنرل پرویز مشرف نے اکتوبر ۱۹۹۹ء میں ڈرامائی انداز میں مارا تھا۔ انھوں نے سلسلہ ہائے روز و شب کا حساب کرتے ہوئے کہا:

’’۱۲؍اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جنرل مشرف نے حکومت پر قبضہ کیا‘ تو ۱۴؍اکتوبر کو ہمارے گھر اسلام آباد آیا۔ چیف جسٹس ہاؤس تو ابھی نہیں بنا تھا‘ لیکن بنگلہ نمبر ایک جسٹس ہاؤس قرار دے دیا گیا تھا۔ وہ اپنی پوری پلٹن کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ میں سری لنکا سے آ رہا تھا‘ کہ نواز شریف نے ہمارا طیارہ ہائی جیک کر لیا۔ وہ ایک طویل کتھا سناتا رہا۔ میں نے اس سے دو باتیں کیں۔ پہلی یہ کہ آپ عدالتوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ دوسری یہ کہ پی سی او آئے گا نہ کوئی جج اس کے تحت حلف لے گا۔ اس نے مجھے دونوں باتوں کی ضمانت دی۔ چار مہینے تک وہ اس پر کاربند بھی رہا‘ لیکن اس دوران پشاور ہائی کورٹ کا جج ریٹائر ہو گیا۔ اُن کی جگہ میاں اجمل کو حلف لینا تھا۔ میرے پاس اٹارنی جنرل عزیز منشی آیا اور پوچھا کہ میاں اجمل سے کون سا حلف لینا ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کا چیف آیا تھا اور مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئین کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ یہ بھی کہا کہ نصرت بھٹو کیس کے فیصلے میں لکھا ہے کہ آئین ملک کا سپریم

قانون ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اجمل میاں سے صرف آئین پر حلف لوں گا۔

’’پھر نومبر کے مہینے میں جنرل صاحب نے ایک آرڈیننس نکالا۔ اس میں لکھا تھا کہ آئندہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں جو بھی ججوں کی تقرری ہوگی‘ ان سے وہی حلف لیا جائے گا جو آئین میں درج ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ عدالتوں سے کسی قسم کا تصادم نہیں چاہتا تھا‘ لیکن ۲۵؍جنوری ۲۰۰۰ء کو پی سی او جاری ہو گیا۔ ۲۴؍جنوری کو مشرف کے پرنسپل سیکرٹری کا مجھے پیغام آیا کہ جنرل صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں‘ تھوڑی دیر کے لیے پرائم منسٹر ہاؤس آ جائیں۔ خیر میں وہاں چلا گیا۔ وہ اپنی جنرل کی آؤٹ فٹ میں تھا اور کہیں باہر سے آ رہا تھا۔ اس نے بیٹھتے ہی کہا کہ صدیقی صاحب! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کل پی سی او جاری کر دیا جائے گا اور تمام جج صاحبان کو نیا حلف دیں گے۔ میں نے کہا آپ نے وعدہ کیا تھا کہ عدالتی امور میں مداخلت نہیں کریں گے۔ کہنے لگے یہ ٹھیک ہے کہ میں نے کمٹمنٹ کی تھی اور میں اب بھی آپ سے اتفاق کرتا ہوں، لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ ہم اس کے بغیر حکومت نہیں چلا سکیں گے۔

میں نے کہا، آپ ان کی بات سن لیں یا جو مجھ سے وعدہ کیا تھا اس پر کاربند رہیں۔ کہنے لگے، اچھا جن صاحب نے مجھے یہ مشورہ دیا ہے‘ میں ان کو بلا لیتا ہوں‘ آپ ان سے بات کر لیں۔ میں نے کہا کہ جب آپ میرے گھر آئے تھے، تو صرف آپ سے میری بات ہوئی تھی اور کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا، یہاں تک کہ آپ نے اپنے سیکرٹری کو بھی نکال دیا تھا۔ اب میں تیسرے آدمی سے کیا بات کروں؟ جب انھوں نے اصرار کیا‘ تو میں نے کہا کہ انھیں بلا لیں۔ وہ شریف الدین پیرزادہ تھے جو وہیں بیٹھے تھے۔ وہ اور عزیز منشی دونوں آ گئے۔ دراصل اگلے دن یعنی ۲۶؍جنوری کو میرے پاس ظفر علی شاہ کا کیس لگا ہوا تھا جس کے لیے میں نے ۱۲ججوں کا بنچ بنایا تھا۔ ان کو یہ شبہ تھا کہ میں نصرت بھٹو کے فیصلے کو اوور رول کرنے والا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو کل حلف دیں گے۔ میں نے کہا میں حلف نہیں لے رہا کیونکہ میں پہلے ہی انکار کر چکا ہوں۔ خیر انھوں نے بہت کوشش کی اور خاصی گرما گرمی بھی ہوئی۔

میں نے کہا آپ کا بھی وہی حشر ہوگا جو ایوب خان کا ہوا تھا۔ آپ کے لیے وعدہ خلافی مناسب نہیں۔ میں نے واضح کیا میں کسی قیمت پر حلف نہیں لوں گا۔ اس پر بڑی تلخی بھی ہوئی۔ میں اٹھ کے چلا آیا، تو عزیز منشی میرے پیچھے پیچھے آیا۔ میں نے کہا، کتنے بے وقوف آدمی ہو! کہنے لگا، یہ تو ٹھیک ہے‘ مگر میں کیا کروں، یہ جو کچھ ہوا ہے، شریف الدین پیرزادہ نے کیا ہے۔ یوں میں وہاں سے گھر آ گیا‘ تب مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ رات ۹ بجے مجھے جی ایچ کیو سے فون آیا کہ دو تین جرنیل آپ سے ضروری بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا، آ جائیں۔ کوئی ساڑھے نو بجے کے قریب جنرل معین الدین حیدر، احسان الحق اور جنرل محمود آئے۔ ان کے ساتھ دو تین آدمی اور بھی تھے۔ وہ تو اٹھ کے باہر چلے گئے اور یہ تینوں میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں نے کہا، جی کیسے آئے ہیں؟ کہنے لگے، ہم آپ کے لیے چیف صاحب کا پیغام لائے ہیں کہ کل صبح چیف جسٹس کا حلف آپ لیں۔ میں نے کہا، میں تو آپ کے چیف کو وزیراعظم ہاؤس ہی میں انکار کر آیا ہوں۔ خیر وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ جنرل محمود بہت جوشیلا تھا‘ وہ تحکمانہ لیکچر دینے لگا۔

جسٹس صدیقی صاحب نہایت اہم راز افشا کر رہے تھے اور میں نصرت بھٹو کیس کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا فیصلہ چیف جسٹس انوارالحق نے سنایا تھا اور میں عدالت کے اندر موجود تھا۔ انھوں نے جنرل ضیاء الحق کی حکومت کو سندِ جواز عطا

کرنے کے علاوہ اسے دستور کے اندر ترمیم کا حق بھی دیا تھا۔ حالانکہ عاصمہ جیلانی کیس میں عدالت عظمیٰ نے متفقہ فیصلہ دیا تھا کہ آئین سپریم ہے اور اسے تحلیل یا معطل کرنے والا شخص غاصب ہے۔ میں نے سابق چیف جسٹس سے دریافت کیا کہ چیف جسٹس انوارالحق نے ماضی کے فیصلوں سے انحراف کیوں کیا تھا۔ انھوں نے جواب میں ایک چشم کشا واقعہ سنایا:

''یہ قصہ مجھے خود شریف الدین پیرزادہ نے سنایا جو اس وقت غالباً وزیرِ قانون تھے۔ نصرت بھٹو کیس میں فیصلہ محفوظ کرنے کے بعد کسی دعوت میں چیف جسٹس انوارالحق ان سے ملے۔ میں ان دنوں شاہراہ فیصل پر رہتا تھا اور شریف الدین پیرزادہ سے میری بہت دوستی تھی۔ وہ ایک رات دو بجے میرے پاس آئے۔ میرے گھر کے عقب میں انیکسی تھی جس کو لائبریری بنا رکھا تھا۔ میں ان کو وہاں لے گیا۔ انھوں نے پوچھا کہ جسٹس انوارالحق کا جو فیصلہ آیا ہے کیا آپ نے دیکھا ہے؟ میں نے کہا، ہاں اس نے انھیں دستور میں ترمیم کا بھی اختیار دے دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ کیسے ہوا؟ پھر اس نے بتایا کہ جب میں جسٹس صاحب سے ملا' تو انھوں نے انکشاف کیا کہ میں کل یا پرسوں فیصلہ جاری کر دوں گا۔ اس پر میں نے کہا، وہ قطعی تاریخ بتا دیں جب آپ فیصلہ سنانے والے ہیں۔ انھوں نے دریافت کیا، آپ وہ تاریخ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہم اسی روز ایک تقریب کریں گے۔ چیف جسٹس نے پوچھا، یہ تقریب کس لیے ہوگی؟ میں نے جواب دیا کہ جسٹس یعقوب علی کو ہٹا کر ہم نے آپ کو چیف جسٹس بنایا تھا۔ جسٹس یعقوب علی کو مسٹر بھٹو نے چھٹی ترمیم کے ذریعے چیف جسٹس بنایا تھا اور ضیاءالحق نے اس ترمیم کو ختم کر کے آپ کو چیف جسٹس بنایا ہے' جبکہ آپ اصل آئین کے مطابق چیف جسٹس نہیں بن سکتے تھے۔ اگر آپ فوجی حکمران کو آئین کے اندر ترمیم کا اختیار نہیں دیتے' تو چھٹی ترمیم بحال کر دی جائے گی اور ایک نئے چیف جسٹس حلف اٹھا لیں گے۔ میری بات سننے کے بعد انھوں نے اپنے تحریر شدہ فیصلے میں اضافہ کرتے ہوئے جنرل ضیاءالحق کو آئین میں ترمیم کا اختیار دیا تھا۔''

''میں نے کہا، میں نے فیصلہ نہایت سوچ سمجھ کے کیا ہے۔ یہ کوئی رات گیارہ بجے تک مجھ سے بحث مباحثہ کرتے رہے۔ پھر جاتے وقت کہہ گئے کہ آپ مزید سوچ لیں، صبح ۶ بجے ہمارا آدمی آئے گا اور آپ کا آخری جواب معلوم کرے گا۔ ٹھیک ۶ بجے میرے پاس ایم آئی کا ایک میجر آیا اور پوچھا کہ سر! آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ میرا فیصلہ وہی ہے جو میں آپ کے چیف صاحب کو بتا چکا ہوں۔ اس نے برملا کہا کہ جی ایچ کیو کی طرف سے دوسرا پیغام آپ کے لیے یہ ہے کہ گیارہ بجے تک گھر سے باہر نہیں جائیں گے۔ ان کو شبہ تھا کہ اگر میں باہر چلا گیا، تو مبادا کوئی اور جج بھی حلف لینے سے انکار کر دے۔ چھے جج تو پہلے ہی باہر ہو گئے تھے اور سندھ کے سارے ججوں نے حلف لینے سے انکار کر دیا تھا۔ میرا تصادم کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ انھوں نے میرے گھر کے چاروں طرف پولیس اور فوج تعینات کر دی کہ کوئی شخص باہر جا نہ سکے۔ ۱۲ بجے کے قریب انھوں نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ حلف برداری ہو گئی ہے اور اب آپ گھر سے باہر جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد میڈیا کے لوگ آ گئے اور بہت ہنگامہ رہا۔''

میں نے دل ہی دل میں اُن کی عزیمت کو سلام کیا کہ وہ پہلے بہادر اور بااصول چیف جسٹس ہیں جنھوں نے پی سی او

کے سامنے سر جھکانے کے بجائے اسے مسترد کر دیا' فوجی آمریت سے کوئی سمجھوتا نہیں کیا اور آئین کے ساتھ وابستگی کی ایک درخشندہ روایت قائم کی ہے۔

چائے کی پیالی سے بھاپ اُٹھ رہی تھی اور اس کی خوشبو دعوت نوش دے رہی تھی۔ دو چار گرم گرم چسکیاں لیں تو جسٹس صاحب کی باتوں کا لطف دو آتشہ ہو گیا۔ وہ اپنی حکایت جانفزا سنا رہے تھے:

''چیف جسٹس سجاد علی شاہ پہلے سندھ ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے۔ ان کے بعد میں چیف جسٹس بنا تھا۔ شاہ صاحب کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ انھیں سپریم کورٹ بھجوانے میں میرا ہاتھ ہے۔ وہ سندھ ہائی کورٹ ہی سے ریٹائر ہونا چاہتے تھے۔ میرے چونکہ وزیر قانون شریف الدین پیرزادہ سے تعلقات تھے اس لیے سجاد علی شاہ سمجھتا تھا کہ یہ سب میرا کیا دھرا ہے' حالانکہ یہ بات بالکل نہیں تھی۔ معاملہ بڑا سادہ تھا۔ انھوں نے عدالتی معاملات میں گڑبڑ کی تھی اور وہ زرداری کے قریب تھے اور انھوں نے زرداری کو ایک کیس میں ضمانت بھی دی تھی۔ میں نے جب وہاں چیف جسٹس کا حلف لیا، تو مجھے ایسی تصویریں ملیں جن سے لگتا تھا کہ ان کے زرداری صاحب سے خاندانی تعلقات ہیں۔ اس کے بعد آغا رفیق کا معاملہ سامنے آیا۔ وہ زرداری کا ہم جماعت تھا۔ بےنظیر نے اسے ۴۴ ججوں کو نظر انداز کر کے سپریم سیٹ دی تھی۔ اس پر سجاد علی شاہ نے موقف اختیار کیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر زرداری نے بڑی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا اور اسے کہا کہ ''سالے تم کیسے جج بن گئے تھے، تم بھی تو جونیئر تھے۔'' سجاد علی شاہ چوتھے نمبر پر تھا جب وہ چیف جسٹس بنایا گیا تھا۔ ان کی فائل پر بےنظیر نے یہ لکھا تھا کہ ''وہ ابھی جوان ہے اور اجمل میاں انتظار کر سکتا ہے۔'' اور دوسری بات یہ لکھی تھی کہ وہ بہت مددگار رہے۔

''اس کے فوراً بعد صوبہ سرحد میں گورنر راج نافذ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی عدالت عظمیٰ میں رٹ دائر ہوئی جسے صرف سب سے سینئر جج ہی سن سکتے تھے۔ ہم سات ججوں کا بنچ تھا۔ سجاد علی شاہ مجھے تو بنچ سے نکال نہیں سکتے تھے کہ میں کنفرم جج تھا۔ اس نے دو جونیئر جج نکالے اور اڈہاک پر دو جج لے آئے۔ دو تین جج پنجاب کے تھے جن کے تعلقات ان کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ اگر آپ وہ فیصلہ پڑھیں، تو محسوس کریں گے کنفرم ججوں کا فیصلہ اور ہے اور اڈہاک ججز کا کچھ اور۔ انھوں نے پانچ کنفرم ججوں کا فیصلہ نظر انداز کر دیا اور اڈہاک ججوں کا فیصلہ درست قرار دے دیا۔ ہم چونکہ پانچ جج تھے، تو ہمیں کاؤنٹر کرنے کے لیے ان کو بھی پانچ ججز کا بنچ بنانا پڑا' چنانچہ انھوں نے دو اڈہاک پر لیے اور تین پنجاب کے جج ان کے ساتھ تھے' یوں کل پانچ ججوں کا بنچ بنا دیا۔ پھر اس کے عوض بےنظیر نے انھیں مرسیڈیز گاڑی دی۔ ہم نے تو اسی وقت واپس کر دی کہ ججوں کے لیے جو ۱۵۰۰یا ۱۶۰۰سی سی گاڑی ہے' وہی ٹھیک ہے۔ سجاد علی شاہ نے ایک کام اور غلط کیا کہ کبھی فل کورٹ میٹنگ نہیں بلائی۔ فل کورٹ میں تمام جج ہوتے ہیں جو سال بھر کا پروگرام بناتے ہیں۔ وہ ۱۹۹۴ء میں چیف جسٹس بنے' لیکن ۱۹۹۴ء سے لے کر ۱۹۹۶ء تک انھوں نے کبھی فل کورٹ میٹنگ نہیں بلائی۔ اس نے ایک کام اور کیا کہ جتنے سینئر جج تھے' ان میں سے کسی کو کوئٹہ' کسی کو کراچی اور کسی کو کہیں اور بھیج دیا اور مجھے پشاور بھیج دیا۔ تین جج کوئٹہ' تین کراچی اور دو پشاور میں۔ پنجاب سے جو پانچ جج یہ لائے تھے' وہ ان کے ساتھ اسلام آباد بیٹھے رہتے تھے۔

''پھر یہ ہوا کہ کوئٹہ کے تین جج ان کے خلاف ہو گئے۔ ۱۹۹۶ء میں الجہاد ٹرسٹ کی رٹ پر چیف جسٹس کی تقرری کے حوالے سے جو ججز کا فیصلہ آیا تھا وہ سجاد علی شاہ نے دیا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ سینئر موسٹ جج ہی چیف جسٹس بن

سکتا ہے۔ سجاد علی شاہ نے اس میں یہ بھی لکھا کہ اس فیصلے کا مجھ پر اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ پہلے ہی اس کے تقرر کے خلاف پشاور میں ایک رٹ دائر تھی کہ وہ سب سے سینئر جج نہیں تھے۔ کوئٹے میں لوگ درخواست پر درخواست دے رہے تھے کہ اس فیصلے پر عمل کیا جائے۔ کوئٹے میں مولانا خلیل الرحمٰن، ارشاد حسن خان اور جسٹس ناصر اسلم زاہد سپریم کورٹ کے بنچ پر تھے۔ اس کے بعد پشاور میں میرے پاس صاحبزادہ سعید نے رٹ دائر کی اور اس میں براہ راست یہ الزام لگایا کہ ججز کیس کے مطابق سجاد علی شاہ کی تقرری درست نہیں۔ ہم نے نوٹس دیا‘ لیکن کوئی حکم صادر نہیں کیا کہ انجنکشن پہلے ہی کوئٹہ عدالت کا موجود تھا۔ جب نوٹس ہوا‘ تو انھوں نے سارے ججوں سے کہا کہ انھیں میرے خلاف کیس سننے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ سجاد علی شاہ نے کہا کہ آرٹیکل ۱۸۴/۳ کے تحت چیف جسٹس فیصلہ کرے گا کہ یہ کیس کون سنے گا۔ ہم نے کہا، یہ غلط بات ہے‘ کیونکہ عدالتی معاملے میں اگر کوئی ۱۸۴/۳ کے تحت رٹ دائر کرے گا، تو کوئی بھی جج جو وہاں موجود ہے‘ مقدمہ سن سکتا ہے‘ لیکن جب اس کا روسٹر فکس کرنے کے لیے جائے گا‘ تو وہ چیف جسٹس کے پاس جائے گا پھر وہ اپنا فیصلہ دے گا۔ میں نے پھر صاحبزادہ سعید کی فائل پر اپنا فیصلہ لکھا اور اسے اپنے سینئر جج میاں اجمل کو بھیج دیا کہ آپ اس کیس کا فیصلہ کریں۔ وہ چونکہ کراچی میں تھے‘ اس لیے انھوں نے لکھا کہ میں فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔ ان کے بعد سینئر جج میں تھا اور فائل دوبارہ پشاور آ گئی۔ میں نے پھر جتنے سینئر جج تھے‘ سب کو اسلام آباد اکٹھے ہونے کا نوٹس بھیجا۔ وہاں ہم دس ججز کا بنچ بنا جس کی صدارت میں نے کی۔ آخر میں فیصلہ یہ ہوا کہ دس ججز کا بنچ سجاد علی شاہ کا کیس سنے گا۔ عابد منٹو بار کے صدر تھے۔ انھوں نے مداخلت کی۔ ہم نے کہا کہ ہم نے جو آرڈر پاس کیا ہے‘ اس کو عدالتی قوانین کے معیار پر دیکھ لو کہ پاس ہو سکتا ہے یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ روسٹر ہم نے فکس کر دیا ہے۔ سپریم کورٹ کے دوسرے سینئر جج ہونے کی حیثیت سے جو پانچ ججز تھے‘ وہ اس زمانے میں نواز شریف کا کیس چلا رہے تھے۔ سجاد علی شاہ کا کیس میرے پاس لگا دس ججوں کے ساتھ۔ میں نے فیصلہ دے دیا کہ سجاد علی شاہ کا چیف جسٹس آف پاکستان کا تقرر غلط ہے‘ کیونکہ یہ ججز کیس کے مطابق نہیں ہے‘ اس لیے ان کی تقرری کالعدم قرار دی جاتی ہے۔ اس پر انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ ان کے بعد میاں اجمل چیف جسٹس آف پاکستان بن گئے۔ وہ سب سے سینئر تھے اور ۲ سال تک چیف جسٹس رہے۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد میں چیف جسٹس بنا۔‘‘

ہم سانس روکے داخلی کشمکش کی ایک ہوشربا داستان سنتے اور یہ سوچتے رہے کہ ہماری عدلیہ نہایت خوفناک ہیجانی کیفیت سے گزرتی رہی ہے اور جج صاحبان کے درمیان جاری کشمکش نے بڑے بڑے مسائل پیدا کیے ہیں اور بہت منفی کردار ادا کیا ہے۔ میں نے ہمت کر کے جسٹس صاحب سے یہ نوک دار سوال پوچھ لیا کہ اس طرح کی افواہیں گردش کرتی رہیں کہ کوئٹے میں سپریم کورٹ کے جج صاحبان نے سجاد علی شاہ کے خلاف جو علم بغاوت بلند کیا‘ اس میں ’’شریف بریف کیس‘‘ استعمال ہوا تھا؟ انھوں نے دوٹوک لفظوں میں کہا:

’’یہ بکواس ہے کہ رفیق تارڑ سوٹ کیس لیے پھر رہے تھے جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں ایک جج کراچی کا تھا، ناصر اسلم زاہد۔ اس کے بارے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ مولانا

خلیل الرحمٰن بھی صاف آدمی تھا۔ ایک ہی آدمی رہ جاتا ہے، جسٹس ارشاد حسن خان۔ وہ ان دونوں کی موجودگی میں ایسا کام نہیں کر سکتا تھا اور اس کے تارڑ کے ساتھ تعلقات بھی بہت کشیدہ تھے۔''

اب ہم حساس علاقے میں داخل ہونے لگے تھے۔ میں نے پوچھا، سپریم کورٹ پر حملے کے وقت آپ کہاں تھے اور حملہ آوروں سے کیسے محفوظ رہے؟ انھوں نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر کہنا شروع کیا:

''تب میں جج تھا اور یہ نون لیگ والوں نے عدالت عظمیٰ پر حملہ کیا تھا۔ ہوا یہ کہ سجاد علی شاہ روز روز وزیراعظم نواز شریف کو بلا رہا تھا۔ پارٹی کو شبہ تھا کہ وہ انھیں توہین عدالت میں سزا دینے والا ہے۔ اس نے مختیار جونیجو کو چیف الیکشن کمشنر بھی مقرر کر دیا تھا۔ شاہ صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ عدالت میں آنے سے پہلے صدر لغاری صاحب سے ملنے جاتے تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ نواز شریف کو سزا دینے کے بعد اُن کا ریفرنس اسی دن چیف الیکشن کمشنر کو بھیج دیا جائے جو اُسے نااہل قرار دے دے گا۔ اس کے ساتھ ہی حکومت برطرف ہو جائے گی۔ شاہ صاحب نے اپنے زمانے میں ایک اور سنگین غلطی یہ کی تھی کہ انھوں نے تیرھویں ترمیم یک طرفہ طور پر معطل کر دی' جبکہ اعتزاز احسن نے لاہور ہائی کورٹ میں جو رٹ دائر کی تھی' اس میں چودہ ججوں کا فیصلہ موجود ہے کہ آپ کسی بھی قانون کو معطل نہیں کر سکتے کہ عدالت کے پاس آئین کو معطل کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔

شاہ صاحب نے تیرھویں ترمیم معطل کر کے یہ پیغام دیا تھا کہ حکومت ختم ہونے والی ہے' چنانچہ نون لیگ نے اس شر سے محفوظ رہنے کے لیے عوامی طاقت کا مظاہرہ کیا۔''

داخلی حالات کی ایک انتہائی مکروہ تصویر اُبھر رہی تھی اور یہ احساس ہو رہا تھا کہ ماضی میں منتخب حکومتوں کے خلاف کیا کیا سازشیں ہوتی رہیں اور صدر اور چیف جسٹس کی ملی بھگت سے جمہوریت پر حملوں کے کیسے کیسے منصوبے تیار ہوتے رہے۔ پھر مجھے وہ دن یاد آئے جب ایوان صدر سازشوں کا گڑھ بن گیا تھا اور تمام سیاسی تخریب کار وہاں پناہ لیے ہوئے تھے۔ میں نے جسٹس صاحب سے اپنے تشنہ کام سوال پھر دہرایا، کیا آپ نے تہ در تہ سپریم کورٹ پر حملہ ہوتے دیکھا تھا؟ انھوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا:

''میں سپریم کورٹ میں جج تھا' لیکن اسلام آباد میں نہیں تھا' اس لیے حملہ ہوتے نہیں دیکھا' تاہم مناظر کی وڈیو اور ٹھوس ثبوت موجود ہیں کہ حملہ آور نون لیگ کے آدمی تھے۔ اس میں ٹی وی اینکر طارق عزیز بھی شامل تھا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ شاہ صاحب کیس کو قانون کے مطابق چلانے کے بجائے میاں صاحب کو سزا دینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے سپریم کورٹ میں توڑ پھوڑ بھی کی۔ ناصر اسلم زاہد کی قیادت میں تین ججوں کا بنچ بنایا' لیکن جو لوگ بھی پیش ہوئے' وہ گواہی نہیں دے رہے تھے۔ وہ کیس خارج ہو گیا تھا۔ چیف جسٹس بننے سے پہلے ایک اپیل پر میں نے اس کیس کی سماعت کی۔ اپیل منظور ہوئی اور میرے سپریم کورٹ سے چلے جانے کے بعد انھیں چھ چھ مہینے کی سزا ہوئی۔''

جناب سعید الزماں صدیقی ماضی کے بڑے دلچسپ اور عبرت آموز واقعات بیان کر رہے تھے اور تاریخ ایک نئے پس منظر کے ساتھ سامنے آ رہی تھی۔ میں نے اُن سوالات کی طرف رخ کیا جن کا تعلق ہمارے حال اور مستقبل سے ہے۔ اُن سے پوچھا کہ آپ کی نظر میں الیکشن کمیشن کی موجودہ شکل شفاف انتخابات کی ضمانت دے سکتی ہے اور جو احتجاج کیا جا رہا

ہے؟ اس سے حالات بہتر ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے؟ جسٹس صاحب نے قدرے محتاط الفاظ میں جواب دیتے ہوئے کہا:

''میں نے کئی دفعہ یہ بات کہی ہے کہ اسٹریٹ پاور سے نیا الیکشن ہوسکتا ہے نہ الیکشن کمیشن ختم ہوسکتا ہے۔ میرے نزدیک عدالتی کمیشن کی تشکیل سے زیادہ ضروری اس کے حدود و قیود اور قواعد وضوابط کا تعین ہے۔ مناسب ٹرمز آف ریفرنس ہوں گے، تو ایک اچھا حل نکل آئے گا۔ آپ کا ملک معاشی طور پر بُری حالت میں ہے۔ اس وقت آپ کے اوپر ۶۰ ارب ڈالر کے قرضے ہیں، وہ آپ کہاں سے ادا کریں گے؟ آپ کی صنعت نزع کی حالت میں ہے۔ آپ کے پاس بجلی ہے نہ گیس، تو آپ کا معاشی پہیہ کیسے چلے گا؟ میرے خیال میں ان معاملات کو انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے وسیع النظری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔''

اس جواب پر طیب اعجاز نے کہا کہ اس دھرنے کے دوران ایک تاثر یہ بھی پیدا ہوا تھا کہ سپریم کورٹ اس معاملے میں مصالحتی کردار ادا کرنے کی تیاری کر رہی تھی اور اس نے تمام جج صاحبان کو اسلام آباد طلب کرلیا تھا۔ آپ نے اس پوری صورت حال کو کس طرح دیکھا تھا؟ جسٹس صاحب نے فوری جواب دیا:

''یہ تاثر بالکل غلط تھا۔ ایک مرتبہ میرے پاس اے آر وائی کا صحافی کاشف عباسی آیا اور یہی سوال کیا تھا۔ میں نے قطعیت کے ساتھ کہا تھا کہ سپریم کورٹ کے پاس مصالحت کرانے کا کوئی اختیار نہیں۔ وہ تو فیصلے صادر کرتی ہے۔''

''مگر ابھی آپ نے کہا ہے کہ سپریم کورٹ کے پاس بڑی طاقت ہے۔'' طیب اعجاز نے بات کو کریدتے ہوئے کہا۔

''طاقت تو ہے اس کے پاس۔ دیکھیے اس سے پہلے چیف جسٹس افتخار چودھری تھے۔ انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ انتظامی معاملات میں مداخلت کرنا شروع کر دی اور چینی کی قیمت ۴۵ روپے کلو مقرر کر دی، جبکہ بازار میں ۷۰ روپے کلو بک رہی تھی۔ دیکھیے آپ کی ایک حد ہے۔ جب آپ اس سے تجاوز کریں گے اور کسی دوسرے اداروں کے دائرہ اختیار میں مداخلت کریں گے، تو پھر آپ کے احکامات کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔''

''مگر جناب! یہ تاثر تو پھیل گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔''

''یہ زیادہ تر میڈیا نے پھیلایا۔ میں نے اسی دن ٹی وی پر کہا تھا کہ یار! تم لوگوں نے بڑی بربادی کر دی ہے۔ جس دن افتخار چودھری ریٹائر ہوا اور جیلانی آیا' تو اس دن میڈیا رپورٹرز نے کہا کہ ہمارا کاروبار ٹھپ ہوگیا ہے۔ افتخار چودھری سماعت کے دوران ریمارکس دیتا تھا اور اس کا مقصد عوام سے داد وصول کرنا تھا' حالانکہ اُن کی قانونی لحاظ سے سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ قانونی طور پر یہ ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی ہے جس میں یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ آپ کوئی ایسا ریمارکس نہ دیں جس سے فریقین کو یہ اندازہ ہو جائے کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔''

اس پر میں نے یہ نکتہ اُٹھایا کہ عدالتی نظام کے اندر خود احتسابی کا نظام ناپید یا بہت کمزور ہے کہ کسی جج کو ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی سے روکا نہیں جا سکتا۔ اس پر جسٹس صاحب نے فوری اپنا ردِعمل دیتے ہوئے کہا:

''احتساب کا نظام قائم ہے۔ پہلے آرٹیکل ۲۰۹ کے تحت صرف صدر پاکستان کو یہ اختیار تھا کہ وہ سپریم کورٹ جوڈیشل

کونسل میں کسی جج کا کیس بھیج دے۔ افتخار چودھری کے خلاف جنرل صاحب نے جو کیس بھیجا تھا' وہ اپنی جگہ بالکل صحیح تھا۔ اس میں جو کچھ لکھا تھا وہ بھی درست تھا' کہ اس کے بیٹے نے کس طرح میڈیکل کالج میں پڑھا اور کس طرح وہ ایف آئی اے میں آیا۔ اس وقت یہ اختیار صرف صدر کے پاس تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس کسی جج کے خلاف ثبوت ہے' تو آپ جوڈیشنل کونسل میں جا سکتے ہیں' لیکن اس میں یہ ہے کہ غلط ثابت ہونے پر آپ کو سزا بھی ہو سکتی ہے۔''

''یہ تو ایک رسمی عمل ہے۔ کیا کوئی داخلی نظام بھی موجود ہے جو ایک جج کو اپنی حدود سے آگے جانے سے روک سکے؟'' میں نے وضاحت چاہی:

''سویلین کورٹس جج کی خود احتسابی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ خود احتسابی کا سلسلہ شروع ہو جائے، تو پھر وہ کہیں بھی نہیں رکے گا۔ آج کل یہ عالم ہے کہ کوئی آدمی کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جج بنچ میں نہیں بیٹھ سکتا۔ ہمارے اپنے فیصلے موجود ہیں کہ آپ کسی جج کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ یہ متعصب ہے۔ یہ بات آپ لوئر کورٹ کے جج کے لیے تو کہہ سکتے ہیں' لیکن سپیریئر کورٹ کے جج کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ ضابطہ اخلاق میں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی جج سمجھتا ہے کہ وہ کیس نہیں سن سکتا، تو وہ خود اس کیس سے دستبردار ہو جاتا ہے اور لکھ دیتا ہے کہ میرے سامنے یہ کیس نہ لگایا جائے اور وہ کیس اس کے پاس نہیں لگتا۔''

میں نے ایک اہم سوال یہ اُٹھایا کہ بھارت میں جو الیکشن کمیشن ہے' اس کے ارکان اور چیف الیکشن کمشنر عدلیہ سے نہیں لیے جاتے اور وہ ٹھیک کام کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں الیکشن کمیشن جج صاحبان پر مشتمل ہوتا ہے۔ اُن کا مسئلہ یہ ہے کہ اُنھیں کوئی انتظامی تجربہ نہیں ہوتا جبکہ انتخابات بہت بڑی انتظامی ایکسرسائز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا آپ یہ مشورہ دیں گے کہ الیکشن کمیشن کی ہیئت یکسر تبدیل کر دی جائے؟ جسٹس صاحب نے بے ساختہ کہا:

''یہ بالکل ضروری نہیں کہ اس میں تمام جج صاحبان ہی ہوں' بلکہ اُن کی مداخلت کم سے کم ہونی چاہیے۔ دوسری یہ ہے کہ جج صاحبان ۶۵ سال کی عمر میں ریٹائر ہوتے ہیں۔ اس وقت ۷۰ سال کا ہوں۔ میرا جب انھوں نے نام دیا' تو میں نے کہا کہ آپ کا دماغ خراب ہے۔ میں اس عمر میں الیکشن کمیشن کا کام نہیں کر سکتا۔ الیکشن کی مانیٹرنگ کے لیے ایک سٹیزن گروپ بنا تھا' میں اس کا صدر تھا۔ میں نے اس الیکشن میں' سندھ کے پانچ اور پنجاب کے تین انتخابی حلقوں کو خود مانیٹر کیا جو بہت مشکل کام تھا۔ یہ ایسے جج صاحبان کا کام نہیں جو ۷۰ سال کی عمر سے تجاوز کر چکے ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اس میں انتظامی کام بہت ہے جس میں عدلیہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔''

''لیکن الیکشن ٹریبونلز میں ان کی ضرورت تو ہو گی۔'' میں نے معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے پوچھا۔

''وہاں ضرورت ہو سکتی ہے' لیکن آپ جو ریٹرننگ آفیسرز عدلیہ سے لیتے ہیں' ان کی بھی ضرورت نہیں۔ دیکھیں یہ قوانین بھٹو صاحب کے دورِ حکومت میں بنے تھے۔ اس زمانے میں بیوروکریسی خاصی بدنام تھی۔ یحییٰ خان نے تین سو افسر نکال دیے تھے۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے بھی ایک فہرست تیرہ سو آدمیوں کی تیار کی تھی۔ ان کے خیال میں بیوروکریٹس ایماندار نہیں تھے اور عدلیہ کا ادارہ ہی باقی رہ گیا تھا۔ اب اس کی بھی مٹی پلید ہو گئی ہے۔''

میں نے پوچھا، کیا ان حالات میں کوئی شخص چیف الیکشن کمشنر بننا پسند کرے گا؟ اُنھوں نے بے اطمینانی کا اظہار

کرتے ہوئے کہا:

''تین جج صاحبان انکار کر چکے ہیں۔ مجھ سے ٹی وی والوں نے پوچھا' تو میں نے انکار کر دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ آپ کے پاس بیوروکریسی میں بھی بہت اچھے افسر ہیں۔ دستور میں ترمیم کیجیے جو آسانی سے ہو جائے گی' کیونکہ تمام سیاسی جماعتیں الیکشن کمیشن کی ہیئت ترکیبی میں تبدیلی چاہتی ہیں۔''

طیب اعجاز نے کہا کہ افتخار چودھری صاحب کی بحالی مہم میں عوام نے بھرپور حصہ لیا تھا' آپ اسے کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟ انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

''وہ عوام ہی کے جج بن کے رہ گئے' سپریم کورٹ کے جج نہیں تھے۔ وہ کراچی آئے تو میری اُن سے بات ہوئی تھی۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ تم نے سپریم کورٹ کا وقار کم کر دیا ہے اور کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ انھیں یہ بھی احساس دلایا کہ آزاد عدلیہ کا مطلب یہ نہیں کہ ہر معاملے میں دخل دینے لگے۔ سول کورٹ میں جا کے دیکھو کہ وہ اتنے ہی کرپٹ ہیں اور حالات بہت زیادہ خراب ہیں۔ میں نے کہا، جب تک سول کورٹس کا نظام درست نہیں ہوتا جہاں روزانہ ہزاروں افراد کا آنا جانا ہوتا ہے' اس وقت تک خودمختار عدلیہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔''

طیب اعجاز نے سوال کیا کہ ماتحت عدالتوں میں لوگوں کو انصاف نہیں مل رہا' ان کے حالات کس طرح بہتر بنائے جا سکتے ہیں؟ جسٹس صاحب نے بڑے تحمل سے جواب دیا:

''اس کا بہت آسان طریقہ ہے۔ سب سے یہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب پاکستان بنا' اس وقت کراچی کی آبادی چار لاکھ تھی اور اس وقت دو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ آپ نے کیا اسی تناسب سے عدلیہ میں توسیع کی ہے؟ بجٹ میں عدلیہ سب سے آخری ترجیح ہے۔ کوئی بھی منصوبہ ساز عدلیہ پر پیسہ خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آپ ایک وکیل کو سول جج بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس کی ماہانہ آمدنی پانچ چھے لاکھ روپے ہے' وہ کبھی موجودہ تنخواہ پر نہیں آئے گا۔ آپ نے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کی تنخواہیں بڑھا کے کہاں تک پہنچا دی ہیں۔ سات آٹھ لاکھ روپے سپریم کورٹ کے جج کی تنخواہ ہے' جبکہ پانچ یا چھے لاکھ روپے ہائی کورٹ کا جج وصول کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سول جج کو' جو سب سے زیادہ کام کرتا ہے' اسے ماہانہ تین لاکھ چار لاکھ روپے تنخواہ دی جائے اور ان کی تعداد آبادی کے لحاظ سے بڑھائی جائے۔ آپ سٹی کورٹ جا کے دیکھیں کہ ایک جج کے پاس ۴۰، ۴۰ کیس لگے ہوتے ہیں جن کی سماعت ناممکن اور ناقابلِ عمل ہے۔ پھر آپ نے عدلیہ کو ایگزیکٹو سے علیحدہ کر دیا ہے اور سول جج کو مجسٹریٹ بنا دیا ہے۔ اب وہ سول جج رہے گا یا مجسٹریٹ۔ آپ امریکہ میں جا کے دیکھیں کہ جہاں دس بارہ ہزار کی آبادی ہے' وہاں ان کے لیے تین عدالتیں ہیں: کریمنل کورٹ، سول کورٹ اور اپیلٹ کورٹ۔ وہاں جیوری کا سسٹم بھی ناکام ہوتا جا رہا ہے اور عدلیہ پر اعتماد میں اضافہ ہو رہا ہے۔''

''آپ کے خیال میں عدلیہ کی زبوں حالی کی ذمے دار حکومت ہے؟'' طیب اعجاز نے پوچھا۔

''حکومت سو فیصد ذمے دار ہے۔ زیریں عدالت میں پرانے ٹائپ رائٹر پر بیٹھا ایک شخص ٹائپ کر رہا ہوتا ہے۔ کیا

آج دنیا میں کہیں ایسا ہوتا ہے؟ دنیا کمپیوٹرائزڈ ہوگئی ہے۔ ہائی کورٹ، سپریم کورٹ میں کمپیوٹر ہے' مگر ماتحت عدالتوں میں ایسا کیوں نہیں ہے؟''

اس پر طیب اعجاز نے اپنا واقعہ سنایا کہ میں ایک سول کورٹ میں گیا، تو ریڈر بھاگا بھاگا میرے پیچھے آیا اور کہنے لگا کہ سر آپ نے شرٹ بہت اچھی پہن رکھی ہے۔ جج صاحب پوچھ رہے ہیں کہ یہ کہاں سے لی ہے۔ میں نے کہا، یار مجھے تو یاد نہیں کہاں سے لی ہے، بازار ہی سے لی ہوگی۔

جسٹس صاحب نے واقعہ سننے کے بعد بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا:

''بہت بری حالت ہے ان کی۔ ان کے پاس فرنیچر ہے نہ بیٹھنے کی جگہ۔ ٹرانسپورٹ ہے نہ بنیادی سہولتیں۔ جب جام صادق سندھ کا وزیراعلیٰ تھا' تب میں دو سال وہاں کا چیف جسٹس رہا۔ پیر پگاڑا کے کہنے پر یہ میرے پاس آیا کہ آپ پلیجو میں دو عدالتیں بنا دیں۔ میں نے کہا کہ پہلے آپ سول ججوں کی رہائش کا بندوبست کریں اور ان کے اسٹاف کا' تب میرے پاس آئیں۔ اس پر پیر صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے۔ میں نے سندھ میں قریباً دس بارہ عدالتیں بنوائیں اور علی الاعلان کہا کہ جب تک جج کی رہائش اور عدالت کی عمارت کا بندوبست نہیں ہوگا تب تک میں کسی سول جج کا تقرر نہیں کروں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سندھ کا دورہ کرتے ہوئے مجھے پتہ چلا کہ جج سیاسی پارٹی والوں کو کہتے تھے کہ ہمیں عدالت تک چھوڑ آئیں۔ وہ تانگے پر عدالت جاتے تھے۔ میں جام صادق علی کو سلام کرتا ہوں کہ اس نے مجھے کھلی اجازت دی تھی کہ جس جگہ آپ چاہیں' عدالت بنوا سکتے ہیں۔ انھوں نے تمام بنیادی سہولتیں فراہم کی تھیں۔''

''لیکن! عوام کو تو یہ معلوم نہیں کہ عدلیہ کے لیے کتنے وسائل درکار ہوتے ہیں۔ آگاہی دینے کی ذمے داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔'' طیب اعجاز نے محکم لہجے میں کہا۔

''مجھے ریٹائر ہوئے بارہ سال ہو چکے ہیں۔ یہ ادارہ جس میں ہم بیٹھے ہیں' اس کا نام ہے۔ Karachi Centre For Dispute Resolution۔ یہ ہم نے ورلڈ بینک کے تعاون سے بنایا ہے۔ ۲۰۰۷ء میں مجھے چیف جسٹس صاحب نے کہا کہ آپ اس ادارے کے لیے کام کریں۔ میں یہاں بلامعاوضہ کام کر رہا ہوں۔ ہم نے ۵۰۰ ججوں اور ۴۰۰ بیوروکریٹس کو مصالحت کار (Mediater) کی تربیت دی ہے۔ اس طرح اے سی پی اور دوسرے کئی اہم اداروں کو ہم نے ٹریننگ دی ہے۔ اب میں نے سندھ اور پنجاب حکومت کو خطوط لکھے ہیں کہ پولیس والوں کو بھی مصالحت کاری (Mediation) کی تربیت دلائی جائے۔ میاں نواز شریف نے ابھی جو کمیٹی بنائی ہے' اس پر میں نے بڑا سخت خط لکھا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ مصالحت کاری (Mediation) اور ثالثی (Arbitration) کو الگ الگ کریں۔ میں تو خود ثالثی (Arbitration) کرتا ہوں اور بیرون ممالک جا کر کیس کرتا ہوں اور ایک ایک کیس میں میری فیس اسی لاکھ روپے ہوتی ہے جو صرف ملٹی نیشنل کمپنی کے لوگ دے سکتے ہیں۔ ثالثی کے مقدمات میں یہاں نہیں سنتا' ان کے لیے دبئی یا سنگاپور جاتا ہوں۔ ۲۰۰۵ء میں اسلام آباد میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس میں ورلڈ بینک نے کہا کہ آپ یک مصالحت کاری (Mediation) کا سنٹر کھولیں۔ سوال پیدا ہوا کہ یہ سنٹر کون چلائے گا' کیونکہ ہماری فیس فقط پانچ سات ہزار روپے ہے' اس سے تو دفتر کا خرچہ ہی پورا نہیں ہوتا' چنانچہ تمام ملٹی نیشنلز کو میں نے تاحیات ممبر بنایا اور ان سے لائف ممبرشپ کے تین تین

لاکھ روپے لیے اور اُن کی ہم نے سرمایہ کاری کی ہے۔ اس سے جو آمدنی آتی ہے، ہم اُس سے ہم اسٹاف کو تنخواہ دیتے ہیں۔

''میں نے میاں صاحب سے کہا کہ مصالحت کاری (Mediation) اور ثالثی (Arbitration) کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ مصالحت کار (Mediator) کا کام صلح کرانا اور فیصلہ لکھ کے میرے پاس بھیج دینا ہے اور میں اسے عدالت میں رجسٹر کرا دیتا ہوں۔ اس میں پندرہ سے سولہ دن لگتے ہیں، مگر تنازعات حل ہوتے جاتے ہیں۔''

ہم اس ادارے کی کارکردگی سے بہت متاثر ہوئے اور جسٹس صاحب کی ہمت کو داد دی کہ وہ پیرانہ سالی میں بھی رضا کارانہ طور پر ایک مشنری جذبے سے کام کر رہے ہیں اور تربیت کے ذریعے مصالحت کاری کو فروغ دے رہے ہیں۔ رواں موضوع سے ہٹ کر میں نے قومی اہمیت کا ایک سوال اُٹھایا کہ موجودہ انتخابی نظام کے اندر وہ اُمیدوار بھی کامیاب ہو جاتا ہے جو اپنے حلقے میں ۲۰ فیصد سے بھی کم ووٹ لیتا ہے۔ کیا مناسب نمائندگی کا نظام بہتر نہیں رہے گا؟ جسٹس صاحب نے فی البدیہہ جواب دیا:

''آسٹریلیا میں ۱۰۰ فیصد ووٹنگ ہوتی ہے اور جو آدمی ووٹ نہ ڈالے، اسے سزا ملتی ہے۔ مختلف ممالک میں الگ الگ نظام ہیں۔ آپ اپنے ہاں ووٹنگ کا نظام دیکھیں۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ سارا دن قطار میں کھڑا رہے؟ امریکہ میں ووٹ پندرہ پندرہ اور بیس بیس دن ڈالے جاتے ہیں جس کو جب فرصت ملتی ہے، وہ جا کر اپنا ووٹ مشین میں ڈال آتا ہے۔ ہمارا موجودہ نظام چلنے والا نہیں، کیونکہ وہ لوگ جو ووٹ نہیں ڈالتے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میرے خیال میں مناسب نمائندگی سے بہتری آ سکتی ہے۔''

نصیر احمد سلیمی صاحب نے نشان دہی کی کہ بلوچستان کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ نے تو ڈھائی فیصد سے بھی کم ووٹ لیے تھے۔ جسٹس صدیقی صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا: ''ہمارے ہاں ووٹنگ سسٹم ایک عیاشی ہے۔ غریب آدمی کا اس میں کوئی حصہ نظر نہیں آتا۔''

ان کے اس جواب سے یہ سوال پیدا ہوا کہ عام آدمی کو انتخابات کا صحیح معنوں میں حصہ دار بنانے کے لیے سیاسی جماعتوں کے اندر کس نوع کی اصلاحات درکار ہیں۔ جسٹس صاحب نے اُلٹا ہم سے سوال کر ڈالا۔

''مجھے اس ملک میں کوئی ایک پارٹی ایسی بتائیں جو صحیح معنوں میں سیاسی پارٹی ہو۔ اگر آپ نواز شریف کو نکال دیں، تو مسلم لیگ (ن) ختم، اگر بھٹو صاحب کو نکال دیں، تو پیپلز پارٹی ختم، اگر آپ ولی خان ہاؤس کی فیملی کو نکال دیں، تو اے این پی ختم، یعنی یہ سب پارٹیاں موروثی ہیں۔ سب سے پہلے یہ اپنے اندر انتخابات کا نظام قائم کریں۔ ان کے اندر ہر سطح پر انتخابات ہونے چاہئیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ برطانیہ کے اندر ایک دو روز میں انقلاب آ گیا تھا؟ میگنا کارٹا کی منظوری کے بعد پارلیمنٹ کے اسپیکرز کی گردنیں اُڑائی گئیں۔ قوموں کی زندگی میں پچاس ساٹھ سال کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ فرانس کے اندر اٹھارہویں صدی میں انقلاب آیا، تو اب کہیں جا کے وہاں ایک مستحکم حکومت قائم ہوئی ہے۔''

میں نے ایک بڑے نازک معاملے کو موضوعِ گفتگو بناتے ہوئے دریافت کیا کہ آپ کے میاں صاحب کے ساتھ

تعلقات بڑے اچھے ہوا کرتے تھے اب کیا صورت حال ہے؟ انھوں نے قدرے دلگیر آواز میں بیان حقیقت شروع کیا:

''تعلقات اس حد تک اچھے تھے کہ انھوں نے مجھے صدر مملکت کے لیے نامزد کیا تھا۔ دراصل ہوا یہ کہ ۲۰۰۸ء کے انتخابات کے دوران مجھے چودھری نثار کا ٹیلی فون آیا کہ سر! ہم آپ کو نامزد کرنا چاہتے ہیں صدر کے امیدوار کے طور پر۔ میں نے کہا کہ پہلی شرط یہ ہے کہ میں کسی سیاسی جماعت میں شامل نہیں ہوں گا جس میں آپ کی جماعت بھی شامل ہے۔ اگر آپ اس پر تیار ہیں' تو پھر بات کی جا سکتی ہے۔ میری شرط سے میاں صاحب نے اتفاق کیا' لیکن عملی طور پر بے عقلی اور بے عملی کا ثبوت دیا۔ وہ چاہتے' تو میں بڑی آسانی سے منتخب ہو سکتا تھا۔''

مجھے قدرے حیرت ہوئی اور میں نے پوچھا کہ آپ کس طرح صدارتی انتخابات میں کامیاب ہو سکتے تھے؟ جواب میں جسٹس صاحب نے خوش بیانی کا ایک رنگ جماتے ہوئے کہا:

''میں اس وقت چودھری شجاعت سے ملا جس کے پاس ۸۸ نشستیں تھیں۔ اس نے کہا، صدیقی صاحب! آپ کا نام نواز شریف صاحب نے دیا ہے، تو اُن کو مجھ سے ملنا چاہیے۔ وہ اگر اپنی انا کی وجہ سے میرے پاس نہیں آنا چاہتے' تو وہ مجھے ٹیلی فون کر سکتے ہیں۔ میں اُن کے پاس چلا جاؤں گا اور میرے جتنے ووٹ ہیں' سب آپ کو دوں گا۔ الطاف حسین نے آج سے پانچ سال پہلے مجھے سینٹ کی نشست کی پیش کی تھی۔ میں نے کہا کہ آپ سے میرا نباہ نہیں ہو سکتا' کیونکہ آپ کی اور میری سوچ میں فرق ہے۔ کہنے لگے، آپ کیسی بات کر رہے ہیں! میں نے کہا، تمھیں آج بھی لوگ بھتہ خور کہتے ہیں۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ اس کے بعد جب صدارت کے انتخابات ہوئے' تو میں نے اسے ووٹ دینے کے لیے ٹیلی فون کیا۔ اس نے طعنہ دیا کہ میں نے جب آپ سے سینٹ میں آنے کے لیے کہا تھا' تب آپ نے انکار کر دیا تھا۔

میں نے کہا، اس وقت بات یہ تھی کہ میں کسی بھی سیاسی پارٹی میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اب میاں صاحب سے بھی یہی شرط رکھی ہے۔ کہنے لگے، اچھا آپ میاں صاحب سے کہیں کہ مجھ سے بات کریں' حالانکہ اس نے زرداری سے وعدہ کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود مجھے کہا کہ اگر میاں صاحب مجھے کہیں گے، تو میں سوچوں گا۔ پھر میں بلوچستان گیا۔ وہاں بھی سبھی لوگوں کا کہنا یہی تھا کہ میاں صاحب نے تو ہمیں ووٹ دینے کے لیے کہا ہی نہیں۔ مجھے کل ۱۵۱ ووٹ ملے' جبکہ نون لیگ کے پاس صرف ۹۶ ووٹ تھے۔ باقی ووٹ مجھے چھوٹی چھوٹی پارٹیوں اور بلوچستان کی نیشنلسٹ پارٹیوں نے دیے۔ جماعت اسلامی نے بھی مجھے ووٹ دیا۔ میاں صاحب اگر چاہتے، تو میں منتخب ہو سکتا تھا۔ اب دوبارہ جب انھوں نے چیف الیکشن کمشنر کے لیے میرا نام لیا، تو ڈان نیوز کے کسی صحافی نے مجھے ٹیلی فون کر کے اس بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ مجھ سے تو کسی نے بات نہیں کی۔ ویسے وہ جہاں کہیں بھی ملتے ہیں' میری بے انتہا عزت کرتے ہیں۔''

ہم اُن کی باتوں سے حددرجہ حیرت زدہ ہوئے۔ سلیمی صاحب نے اچانک پوچھ لیا، آپ جج کی حیثیت سے کبھی میاں صاحب سے ملے تھے؟ انھوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا:

''میں نے ۲۰ سال تک جج کی حیثیت سے کام کیا جس میں سے ۹ سال سپریم کورٹ میں اس منصب پر فائز رہا۔

اس دوران کبھی کسی سیاسی شخصیت سے نہیں ملا۔ مجھ سے ایک صحافی نے سوال کیا کہ جج کی حیثیت سے آپ پر کس قسم کے دباؤ ہوتے تھے؟ میں نے کہا، مجھ پر کسی قسم کا دباؤ نہیں تھا۔ بیس برسوں کے دوران میرے پاس کبھی کوئی شخص کسی کی سفارش کرنے نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے سفارش کا دروازہ بند رکھا تھا۔ جب آپ سیاست دانوں سے کوئی مفاد حاصل کرتے ہیں' تو پھر سفارشوں کا راستہ کھلتا ہے۔ ایک دفعہ آپ کسی سیاست دان سے فائدہ اُٹھالیں' تو وہ دس دفعہ آپ کے پاس آ کے بیٹھا رہے گا۔ میرے پاس کسی کو آنے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ میں تو اس دور میں چیف جسٹس رہا جب جام صادق علی جیسا طاقتور سیاست دان وزیراعلیٰ تھا۔''

سلیمی صاحب نے اس بات کی وضاحت چاہی کہ جام صادق علی نے ایک دفعہ صحافیوں کو بلا رکھا تھا۔ سجاد علی شاہ صاحب چلے گئے تھے' محمود ہارون قائم مقام گورنر تھے اور آپ کی عدالت میں ان کا کیس لگا ہوا تھا۔ جام صادق علی میٹنگ ختم کر کے چلے گئے اور بعد میں معلوم ہوا کہ آپ سے ملنے گئے تھے۔ جسٹس صاحب نے اپنے سر کو کھجاتے ہوئے جواب دیا:

''نہیں' میرے پاس کوئی نہیں آیا تھا۔ میں عدالت میں تھا اور شکایت ملی کہ لغاری آپ کا حکم نہیں مانتا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ لکھ کر دیں۔ پھر اگر پانچ بجے تک اس حکم پر عملدرآمد نہیں ہوتا' تو میں خود دیکھوں گا۔ تین بجے اس نے استعفا دے دیا تھا۔''

سلیمی صاحب نے دریافت کیا کہ جب آپ سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، تو آپ کے پاس زرداری صاحب کا کیس لگا تھا' اس میں کیا ہوا تھا؟ جسٹس صاحب نے بے اختیار جواب دیا:

''میں نے اس کی ضمانت مسترد کر دی تھی۔''

''لیکن تاثر یہ تھا جیسے سجاد علی شاہ اور آپ کی ملاقات کے نتیجے میں ضمانت مسترد کی گئی تھی۔'' سلیمی صاحب نے واقعات کی گہرائی میں اترتے ہوئے کہا:

''یہ آپ زرداری سے پوچھیں کہ جب میں سپریم کورٹ گیا' تو اس نے مجھے پیغام بھجوایا کہ میں آپ سے ملنا اور آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ مجھے سپریم کورٹ سے آئے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں' اسے کہو کہ اب اس کی ضرورت نہیں۔ ہوا یہ تھا کہ جب زرداری کی ضمانت کا کیس میرے پاس چل رہا تھا، تو یہ لاہور سے طالب حسین وکیل کو میرے پاس لایا۔ میں نے زرداری سے کہا کہ ابھی ثبوت پیش نہیں کیے گئے' اس لیے ضمانت کے لیے وکیل کی ضرورت نہیں۔ کسی بھی کریمنل کیس میں جب تک ثبوت پیش نہ ہو جائے، تو ضمانتی کاغذات گرانٹ نہیں کیے جا سکتے۔ زرداری وہاں بیٹھا تھا' وہ اٹھ کے میرے پاس آیا اور کہا کہ سر! میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا پوچھیے' اور اسے سمجھایا کہ تمہارا وکیل تمھیں جیل بھجوا دے گا۔ تین چار مہینے بعد ممنون قاضی نے ضمانت دے دی تھی۔''

طیب صاحب نے دریافت کیا کہ اپنے شعبے کے علاوہ آپ کس قسم کی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں؟ جسٹس صاحب نے مختصر سا جواب دیا: ''پیشہ ورانہ اور علاقائی کام سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ ہمارے پاس ثالثی کا بہت کام ہے۔''

''سر! آپ کا بیٹا کیا کرتا ہے؟''
''وہ بھی وکیل ہے۔''
''وہ کہاں پریکٹس کر رہا ہے؟''
''وہ یہاں لیاقت مرچنٹ ایسوسی ایٹس میں کام کرتا ہے۔ شہباز شریف کو میں نے ایک پراجیکٹ بنا کے دیا ہے، وہ اس پر کام کر رہا ہے اور میاں صاحب کے پاس میٹنگ میں جاتا رہتا ہے اور اس ادارے کی نمائندگی کرتا ہے۔''
''اس کے علاوہ آپ کی کیا مصروفیات رہتی ہیں؟ گاف کھیلتے، ٹی وی دیکھتے اور کیا کرتے ہیں؟''
''فلاحی کاموں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ سات آٹھ ویلفیئر انجمنیں چلا رہا ہوں۔ بہت ساری یونیورسٹیوں کے بورڈ کا رکن ہوں۔''
''ہمارے قارئین جو لا پڑھنا چاہتے ہوں، ان کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟''
''میں نے اکثر کہا ہے کہ قانون کی یونیورسٹیاں اس طرز پر ہونی چاہئیں جس طرز پر بیرون ممالک میں ہیں۔ بھارت میں بہت اچھے قانون کے ادارے ہیں۔ اس کے علاوہ نوجوان وکیلوں کی عملی تربیت بھی غایت درجہ ضروری ہے۔ قانون کی کتابیں پڑھ لینے سے وکالت نہیں آتی۔''
''سر! یہ جو جج صاحبان کے بیٹے وکیل بنتے ہیں، ان کے حوالے سے ایک منفی اثر پڑتا ہے۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟''
''یہ چلن کراچی میں بہت زیادہ نہیں، تاہم لاہور میں خاصا کام ہے۔ وحید الدین ہوتے تھے اُن کا بیٹا وجیہہ الدین ہے۔ ہمیں تو کوئی شکایت نہیں ہے ان سے۔ فاروقی صاحب کے بیٹے ہیں اور جمالی کے بیٹے بھی پریکٹس کر رہے ہیں۔ دیکھیں آپ کسی کو منع تو نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی ایک آدھ وکیل کوئی ایسا ناخوشگوار کام کرتا ہے، تو اور بات ہے۔ لاہور کے اندر یہ کلچر زیادہ ہے کہ جج صاحبان کے بیٹوں کے اپنے چیمبر ہیں اور وہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کی روک تھام کا طریقہ کار یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے بیٹوں کو وہاں پریکٹس نہ کرنے دیں جہاں آپ خود بحیثیت جج تعینات ہوں۔ پہلے جج صاحبان عوام اور رشتے داروں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ اب تو وہ ہر محفل میں موجود ہوتے ہیں۔ میں اسلام آباد میں آٹھ سال رہا اور مجھے وہاں کوئی نہیں پہچانتا تھا۔''
ہم بلند مرتبت اور اولوالعزم سابق چیف جسٹس سعید الزماں صدیقی کی صحبت سے دو گھنٹوں سے زیادہ مستفید ہوتے رہے اور ایسا محسوس کیا کہ ہم بڑے خوش نصیب ہیں کہ اُن کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ اُن کے صحت مند ذہن اور صحت مند زندگی سے ایک حوصلہ ملا اور دلوں میں اُمید کی شمعیں فروزاں ہوئیں کہ پاکستان مسائل کے گرداب سے باہر نکل آئے گا اور عوام کو ایک روز مرکزی اور بنیادی حیثیت حاصل ہو گی کہ اجتماعی بیداری آتی جا رہی ہے اور نوجوان اپنے وطن کی تعمیر کے لیے نئے جذبوں سے سرشار دکھائی دیتے ہیں۔ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ بدنظمی، ہلڑبازی اور ایک منظم اور مستعد زندگی میں فرق کرنے لگے ہیں۔ مزید خوش بختی یہ کہ وہ اپنے قائدین اور حکمرانوں کی باز پرس کرنے لگے ہیں۔ حریت فکر اور ذوق نمو اسی کا نام ہے۔

TENDER NOTICE

1. Sealed tenders based on item rates / percentage above or below on approved estimated (DNIT) amount are hereby invited, for the works mentioned below from the contractors / firms enlisted / renewed with C & W Department for the current financial year 2014-15 in the field of Buildings works

2. Tender documents can be obtained from the date of publication of invitation to bids in the newspaper from any of the below mentioned offices, upon written request accompanied with attested copies of enlistment / upto date renewal letter, PEC license, Identity Card of Contractor / Managing Partner / Director of the firm alongwith registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee in the form of CDR / Bank Draft / Cashier's Cheque from any Scheduled Bank:-

i) Chief Engineer, Punjab Buildings Department (South Zone), Lahore.
ii) Commissioner, Sargodha Division, Sargodha.
iii) Superintending Engineer, Provincial Buildings Circle, Sargodha
iv) District Coordination Officer, Sargodha / Khushab
v) Executive Engineer, Provincial Buildings Division, Sargodha
vi) Assistant Commissioner concerned.

3. Tender rates and amounts should be filled in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the tender documents. No rebate on tendered rates will be acceptable.

4. Tenders will be received in the offices of Chief Engineer, Punjab Buildings Department (South Zone), Lahore and Commissioner, Sargodha Division, Sargodha and will be opened simultaneously on fixed date and time by the respective Tenders Opening Committee at the above venues in the presence of intending contractors or their representatives who opt to be present.

5. Conditional tenders and tenders not accompanied with earnest money @ 2% bid amount in shape of CDR / Bank Draft / Cashier's Cheque of any scheduled Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

6. Any of the total bids can only be rejected on the basis of evaluation criteria, though. The procuring agency may reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of a bid or proposal as per PPRA Rules.

Sr #	Name of Work	Estimated Cost (in Rs.)	Earnest Money (in Rs.)	E.S No & Date	Tender Fee (in Rs.)	Completion Period	Last date for submission of application to purchase / issue tenders	date & time for receipt / opening of Tenders
1	2	3	4	5	6	7	8	9
1	Provision of Missing Facilities in Government College for Women Farooq Colony Sargodha (ADP No.191 for the year 2014-15	38.810 (M)	2% of Bid Amount	Under process	19425	18 Months	~~05.01.2015~~ 12/1/15	~~08.01.2015~~ 15/1/15 Receipt 01:00 P.M Opening 01:30 PM
2	Construction of Additional Class Room at Government College (Women) Jauharabad District Khushab (ADP No 347 for the year 2014-15)	29.406 (M)	-do-	Under process	14725	12 Months		
3	M/R to Surgical Burnt Unit (Ground Floor) in D.H.Q Teaching Hospital at Sargodha.	2,49,000/-	-do-	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	125	01 Month		
4	M/R to Surgical Burnt Unit (First Floor) in D.H.Q Teaching Hospital at Sargodha	3,00,000/-	2% of Bid Amount	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	150	01 Month		
5	M/R to Rehmat-ul-Aalmin Block (First Floor) in D.H.Q Teaching Hospital at Sargodha	1,35,000/-	-do-	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	75	01 Month		

Sr #	Name of Work	Estimated Cost (in Rs.)	Earnest Money (in Rs.)	T.S No & Date	Tender Fee (in Rs.)	Completion Period	Last date for submission of application to purchase / issue tenders	date & time for receipt / opening of Tenders
1	2	3	4	5	6	7	8	9
6	M/R to Sewerage System of Rehmat-Ul-Aalmin and Burnt Unit in D.H.Q Teaching Hospital at Sargodha	2,95,000/-	-do-	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	150	01 Month	05.01.2015	06.01.2015 Receipt 01:00 P.M Opening 01:30 PM
7	M/R to Mian Moula Baksh Hospital in D.H.Q Teaching Hospital at Sargodha	2,40,000/-	-do-	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	125	01 Month		
8	A/R to Government College for Women Farooq Colony Sargodha	3,00,000/-	-do-	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	150	01 Month		
9	A/R to Government College for Women Miani.	3,00,000/-	-do-	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	150	01 Month		
10	A/R to Government College for Women Chak No 36/SB District Sargodha	3,00,000/-	-do-	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	150	01 Month		
11	A/R to Government Boys Degree College Bhagtanwala District Sargodha	3,00,000/-	-do-	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	150	01 Month		
12	A/R to Government Boys Degree College Bhalwal District Sargodha	3,00,000/-	-do-	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	150	01 Month		
13	A/R to Government Boys Degree College Miani District Sargodha	3,00,000/-	-do-	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	150	01 Month		
14	A/R to Government College for Women Quaidabad District Khushab	3,00,000/-	-do-	E.E No 367/DRG dated 12.12.2014	150	01 Month		
15	M/R to Old Building of Luddewala Rest House for Counter Terrorist Department (C.T.D) at District Sargodha	9.540 (M)	2% of Bid Amount	Under process	4800	03 Months		
16	M/R to Old Civil Defence Office for Counter Terrorism Department (C.T.D) at Khushab	1.190 (M)	-do-	Under process	600	01 Month		

IPL-16598

Executive Engineer
Provincial Buildings Division
Sargodha

Superintending Engineer
Provincial Buildings Circle
Sargodha

مدرسہ معہد القرآن الحکیم کا باقاعدہ آغاز ۲۰۰۶ء میں ہوا

الحمد للہ ہر سال جگہ کی کمی ہم محسوس کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس سال جگہ کی کمی نے مجبوراً آپ سے ملاقات کروائی......

خود آیئے...... دیکھئے...... محسوس کیجیے...... اور فیصلہ کیجیے

کہ آپ اور ہم مل کر کس طرح **معہد القرآن الحکیم** کو وسعت دے سکتے ہیں تاکہ دنیا و آخرت میں سرخروئی حاصل کریں۔

مذکورہ معاملہ میں مدرسہ کے ساتھ خالی پلاٹ مدرسہ کی ضرورت بن چکا ہے۔ ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے خود دیکھنے تشریف لائیے اور مندرجہ ذیل اکائنٹ نمبر 0053801200399959 الائیڈ بینک میں اپنے آپ کے لیے، اپنے والدین کے لیے خزانہ آخرت کا جو موجب بنیئے۔

رابطہ کے لیے

مولانا محمد شفیع شاکر (ایم اے، ایم ایڈ)
0321-4731021

قاری محمد سعد
0300-4467810
0331-4494850

ایڈریس: حضرت عمر فاروقِ اعظم چوک عقب اعوان ٹاؤن مصطفیٰ پارک (ڈبن پورہ) لاہور

روزانہ اربوں کی تعداد میں ہونے والا

نبی کریم ﷺ کا ذکرِ مبارک

ایک جرمن یہودی اور ایک امریکی عیسائی کے ذوق تحقیق سے رسول اللہ پر درود و سلام بھیجنے کا بڑا اہم پہلو مانندِ روز روشن عیاں ہو گیا

پروفیسر احمد الدین مارہروی

دسمبر ۱۹۳۴ء کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ ایک علمی تحقیق کرنے میں کلکتہ گیا ہوا تھا۔ دن کا زیادہ حصہ امپیریل لائبریری میں مخطوطات کی ورق گردانی یا پھر خان بہادر محمد اسد اللہ، ناظم کتب خانہ کے ساتھ مذہب پر گرما گرم بحث میں صرف ہوتا۔ مرحوم کے دل میں اسلام

سے جو محبت تھی، اس کا اندازہ یوں لگائیے کہ انھوں نے ہندو گردی کے خلاف احتجاجاً تین مرتبہ سرکار کو اپنا استعفیٰ پیش کیا (جو کبھی منظور نہ ہوا)

سہ پہر کو مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں محفل جمتی جو اس زمانے میں کلام پاک کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ کسی ایک بحث کو لے کر خود بولتے اور دوسروں کو بھی اظہار رائے کا موقع عطا فرماتے۔ راتیں ''روزنامہ آزاد ہند'' کے دفتر کی نذر ہو جاتیں جہاں مدیر اعلیٰ، علامہ عبدالرزاق ملیح آبادی علم الکلام کے موتی بکھیرتے اور مذہب اسلام کو عقل کی کسوٹی پر کس کر بقول خود ''ملاازم'' کے بخیے ادھیڑتے۔

کلکتہ یونیورسٹی نے شعبہ اسلامیات کی ابتدا اسی سال کی تھی۔ سابق وزیراعظم پاکستان، مسٹر سہروردی کے چچا سر حسان سہروردی وائس چانسلر تھے اور ایک جرمن یہودی، ڈاکٹر ذکرایا (زکریا) شعبے کا صدر منتخب ہوا تھا۔ اتوار کے روز صبح کو ان کے ساتھ بھی مذہب کے بنیادی اصولوں پر مباحثہ خاصا دلچسپ اور بصیرت افروز ہوتا۔ غرض ایک ایسا محققانہ اسلامی ماحول پیدا ہو گیا جس کا مجھے بعد میں کبھی عشر عشیر بھی میسر نہ آ سکا۔

روز و شب کی پُرسکون کروٹیں اسی طرح جاری تھیں کہ یکایک اخبارات نے ''مانو یا نہ مانو'' (Believe it or not) کے شہرۂ آفاق خالق، رابرٹ ریپلے (Robert Ripley) کی کلکتے میں آمد کا اعلان کیا۔ پھر ایک روز وہ خود ہی ایک سوال کے سلسلے میں امپیریل لائبریری آ گیا۔ نوادرات اور عجائبات کے متلاشی تو آپ کو ہر جگہ مل جائیں گے لیکن ریپلے وہ منفرد شخص تھا جو انوکھے عملی اعجوبوں سے دلچسپی لیتا۔ لندن اور امریکا کے اخبارات میں اس کے چند ہی چٹکلے شائع ہوئے تھے کہ لوگوں نے اس پر آوازے کسنے شروع کر دیے۔ کسی نے اس کو دنیا کا سب سے بڑا دروغ گو قرار دیا تو کسی نے اسے فریبی گردانا۔ وہ بات ہی ایسی کہتا تھا کہ عقل اس کو باور کرنے سے یکسر انکار کر دیتی۔ لیکن جب تحقیق کی جاتی تو عام طور پر سو فیصد ثابت ہوتی۔

ہندوستان میں ہفتہ وار ''ٹائمز آف انڈیا'' نے بھی اس کے مضامین کی خوب اشاعت کی تھی۔ اس لیے وہ ہمارے واسطے ایک جانی پہچانی شخصیت تھا۔ اس نے اپنی ڈائری میں ہندوؤں کی چند مذہبی کتابوں کے نام لکھ رکھے تھے۔ اپنی تحقیق کے سلسلے میں وہ ان کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی کسی ایسے عالم کا متلاشی تھا جو اسے خاص موضوع پر ضروری معلومات فراہم کر سکے۔ چناں چہ پنڈت چنو پادھیا جی کو بلایا گیا کلکتہ یونیورسٹی میں جو سنسکرت سیکشن کے متبحر عالم تھے۔ لیکن ریپلے کے پہلے ہی سوال میں ان کا بھرم کھل گیا اور وہ بغلیں جھانکنے لگے۔

اس نے اپنی ڈائری کا ایک ورق کھول کر دریافت کیا کہ ہندوستان میں مندروں کی تعداد کتنی ہے اور ان میں عبادات کے اوقات کیا ہیں؟ جب پنڈت جی سراسیمہ نظر آئے، تو اس نے نہایت ملائمت سے کہا ''خیر یہ تو میں دوسرے طریقوں سے بھی معلوم کر لوں گا۔ آپ صرف مجھے اپنی عبادات کے طریقے سمجھا دیجیے۔''

پنڈت جی کے بیان پر جس طرح ریپلے کی پیشانی پر بل پڑ رہے تھے، انھیں دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس کی مایوسیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور وہ اپنی منزل سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ دو گھنٹے بعد اس کے چہرے پر اضمحلال کی ایسی گھٹائیں چھا گئیں کہ ڈائری بند کر دی اور

ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔

کہنے لگا ''میں اس ٹوہ میں نکلا ہوں کہ دنیا میں کون سی آواز سب سے زیادہ سنائی دیتی ہے؟ پہلے جانوروں کی بولیوں کا جائزہ لیا، لیکن ان میں ہم آہنگی بہت کم دیکھی۔ پھر انسان کی طرف توجہ کی، تو وہاں بھی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیں۔ ریلوے انجن کی سیٹی کا تجزیہ کیا، تو امریکی، یورپی اور افریقی سیٹیوں میں بین فرق نظر آیا۔

''اب صرف ایک امر باقی ہے کہ دنیا کے مذاہب کا جائزہ لیا جائے۔ ان میں شاید کوئی دعا، مناجات یا حمد مل جائے جو بین الاقوامی حیثیت سے عام ہو۔ دنیا میں چار بڑے مذاہب ہیں: اسلام، عیسائیت، بدھ مت اور ہندو دھرم۔ اب میں ان کا جائزہ لے رہا ہوں۔ عیسائی ممالک سے مجھے ہر قسم کی معلومات فراہم ہو چکی ہیں، لیکن ان میں بے انتہا تنوع اور افتراق نظر آتا ہے۔ بدھوں کے ہاں یکسانیت مقابلتاً زیادہ ہے، لیکن اتنی نہیں کہ اس کی کسی بالجہر عبادت کو آوازوں میں پہلا نمبر دیا جا سکے۔ ہندوستان میں ابھی آپ نے دیکھ لیا کہ اعداد و شمار جمع کرنا کتنا مشکل ہے۔ بظاہر یہاں تو کامیابی مشکل ہی معلوم ہوتی ہے۔''

قبل اس کے یہ محقق اسلام کے متعلق کچھ کہے، خان بہادر اسد اللہ نے خود ہی سوال داغ دیا کہ اسلام کے متعلق آپ کی جستجو کا ماحصل کیا ہے؟

بظاہر اس کا وہ دوٹوک جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی ڈائری کا ایک دوسرا ورق کھول کر کہنے لگا ''ابھی میں تمام اسلامی ممالک میں نہیں گھوما۔ صرف مصر، شام، عرب اور فلسطین کا دورہ کر پایا ہوں۔ ان سب میں قدر مشترک یہ نظر آئی کہ ہر جگہ عبادت عربی زبان میں ہوتی ہے۔ لیکن ان میں عبارتیں مختلف ہیں جنھیں ایک آواز کا نام نہیں دیا جا سکتا۔''

ہم دونوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ اس برگشتہ راہ کو صحیح ہدایت کی ضرورت ہے اور اس واسطے بڑی چابکدستی سے کام کرنا ہو گا۔ چناں چہ اسے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ ہندو دھرم کے متعلق آپ ازخود معلومات بہم پہنچائیے۔ اسلام کے بارے میں ہم آپ کو ایک جرمن عالم سے ملائیں گے جو ممکن ہے آپ کی راہنمائی کر سکے۔

جرمن عالم کا نام سنتے ہی رپلے کے پژمردہ چہرے پر مہتابیاں سی چھوٹنے لگیں۔ جب اسے معلوم ہوا کہ یہ عالم یونیورسٹی پروفیسر ہے جس کا ہر لفظ محققین کے نزدیک حرفِ آخر ہوتا ہے، تو اسے گونہ اطمینان ہو گیا کہ اسے نہ صرف اسلام بلکہ ہندو مذہب کے متعلق بھی پوری معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ دراصل مشہور جرمن عالم، میکس مُلر نے تمام دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ سنسکرت کے سب سے بڑے بحرالعلوم صرف جرمن پروفیسر ہیں۔ ہم نے بھی اس کی غلط فہمی کا ازالہ ضروری نہ سمجھا اور محفل برخاست ہو گئی۔

اب اسلام کو برتر ثابت کرنے کے لیے جس شد و مد سے دوڑ دھوپ ہوئی اس کا جب خیال آئے تو دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ رات کو پہلے علامہ عبدالرزاق کے دفتر میں میٹنگ ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مصروفیات کا عذر کر کے آنے سے انکار کر دیا۔ لیکن باقی لوگ تن من دھن سے اپنی اسی فکر اور جستجو میں منہمک ہو گئے۔

علامہ عرصہ دراز تک مصر، قسطنطنیہ، شام، عرب اور

فلسطین میں رہ چکے تھے۔ اخبار سے منسلک ہونے کے باعث ان ملکوں کے رسائل اور روزنامے بھی تبادلے میں آتے رہتے تھے۔ انھوں نے وہاں کی اطلاعات و نشریات کی یادداشتوں کو کریدا اور صرف ان چند ممالک میں ڈیڑھ لاکھ مساجد کا سراغ لگا لیا۔

ہندوستان میں بھی نو کروڑ مسلمان آباد تھے۔ چھے سو برس تک ان کی حکومت رہی تھی۔ گاؤں گاؤں میں مسجدیں تعمیر ہو گئی تھیں۔ ایک لاکھ سے کیا کم ہوں گی۔ اسی طرح انڈونیشیا، عراق اور افریقا کے عرب ممالک تھے۔ ان سب کی مسلم آبادی کا جائزہ لے کر تخمینا ایک تعداد مقرر کر لی اور اسے ایک رسالے کی شکل میں مرتب کر کے چھپوا لیا گیا۔

دوسری نشست حسان سہروردی کے ہاں ہوئی جو معاشرت میں بالکل انگریز مگر دل سے پکے جذباتی مسلمان تھے۔ ان کے ذمے یہ فرض عائد کیا گیا کہ ڈاکٹر ڈکرایا کو شیشہ میں اتاریں اور نووارد کے سامنے باعلان اسلام کا لوہا منوائیں۔

اب خدا کی قدرت ملاحظہ کیجیے۔ ایک بالکل معمولی سی بات نہ معلوم کیوں ہم میں سے کسی مسلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ رابرٹ ریپلے نماز کے متعلق کہہ رہا تھا کہ اس میں علیحدہ علیحدہ آوازیں سنائی دیتی ہیں جن کو ایک نہیں کہا جا سکتا۔ ہمیں اس اعتراض کا کوئی مسکت جواب نہ بن پڑتا۔

لیکن جب جرمن پروفیسر کے سامنے یہ سوال اٹھایا گیا، تو اس نے نہایت آسانی سے اس کا حل تلاش کر لیا۔ کہنے لگا ''آپ نماز کو درمیان میں نہ لائیں بلکہ اذان کو پیش کریں جو ہر جگہ یکساں ہوتی ہے۔ شیعوں کی اذان میں کچھ فرق ضرور ہوتا ہے لیکن ابتدائی کلمات اس کے بھی یکساں ہیں۔''

ریپلے کا عروس البلاد کلکتہ میں پانچواں روز تھا۔ اس دوران وہ نامعلوم کتنے پنڈتوں سے مل چکا تھا۔ کئی مندروں میں پراتھنا بھی سنی۔ وہ اپنی تگ و دو سے بالکل غیر مطمئن تھا۔ اس نے اپنی تمام امیدیں جرمن پروفیسر کی ملاقات سے وابستہ کر لیں۔ لیکن جب ڈاکٹر ڈکرایا نے بجائے ہندو دھرم کے اسلام کے متعلق گفتگو شروع کی، تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر جب انھوں نے حتمی طور پر فیصلہ صادر کر دیا کہ دنیا میں سب سے زیادہ سنائی دینے والی آواز ''اذان'' ہے، تو اسے کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا۔

علامہ عبدالرزاق کے اعداد و شمار دیکھ کر اس نے مساجد کی تعداد کو صحیح تسلیم کر لیا بلکہ اپنی ڈائری میں ان کی تفصیل بھی نوٹ کر لی۔ یہ بھی مان لیا کہ ہر مسجد میں روزانہ پانچ دفعہ اذان کہی جاتی ہے لیکن وہی یکساں کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہ بات اس کے مغرب زدہ ذہن میں کسی طرح نہ سمائی۔

مختلف مساجد میں جا کر جب اسے اذان سنائی گئی تو وہ ایک کا دوسرے سے صحیح رابطہ قائم نہ کر سکا۔ طرح طرح کے اعتراضات کرتا رہا اور یکسانیت کا قائل نہ ہوا۔ اس لیے ہم سب کو پھر سر جوڑ کر بیٹھنا پڑا کہ اب کون سا لائحہ عمل اختیار کیا جائے جو اس سنگلاخ پتھر میں جونک لگا سکے۔ متعدد تدابیر سوچی گئیں لیکن اس مرتبہ بھی ڈاکٹر ڈکرایا ہی کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ اس کے واسطے ہمیں عجیب و غریب قسم کی جدوجہد کرنی پڑی۔

اس وقت تک دنیا ٹیپ ریکارڈنگ سے ناآشنا تھی لیکن گراموفون ایجاد ہو چکا تھا۔ کلکتہ میں ''ہز ماسٹرز

وائس'' کے ریکارڈ تیار کیے جاتے تھے۔ ان سے یہ سودا کیا گیا کہ بیس مختلف مساجد کی اذانیں جداگانہ اوقات میں ریکارڈ کی جائیں پھر سب کو بیک وقت سن کر رپلے اندازہ لگائے کہ یہ ایک ہی آواز ہے یا مختلف النوع صدائیں۔

گراموفون کمپنی نے کام کے معاوضے میں خطیر رقم طلب کی جس کا ادا کرنا ہم میں سے کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن خدا بھلا کرے پنڈ دادن خان کے ملک التجار حاجی محمد امین مرحوم (بانی امین برادرس کراچی، ڈھاکہ) کا جنھوں نے کل رقم اپنی جیب سے ادا کر دی۔ دو دن کے اندر بیس ایسی مساجد کی اذانوں کے ریکارڈ تیار ہو گئے جن میں سے بعض کا فاصلہ بیس میل سے بھی زیادہ تھا۔

رپلے نے جب انھیں غور سے سنا تو پھڑک اٹھا۔ ہم میں سے ہر ایک سے اٹھ اٹھ کر ہاتھ ملاتا اور کہتا ''آپ لوگوں نے میری برسوں کی مشقت کو دور کر دیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کروں۔'' لیکن ہم سب ایک خیال میں مگن تھے..... یہ ہماری نہیں اسلام کی فتح ہے۔

جب وہ امریکا پہنچا اور ''Believe it or not'' کی دوسری جلد لکھنی شروع کی، تو ابتدا ہی میں اِس عنوان کے تحت ''دنیا کی کون سی آواز سب سے زیادہ سنائی دیتی ہے؟'' اس نے یہ جواب لکھا ''وہ مسلمانوں کی اذان ہے جس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔'' اور ثبوت کے طور پر وہ تمام اعداد و شمار شائع کر دیے جو علامہ عبدالرزاق نے مہیا کیے تھے۔

☆☆☆

ایک روز میں سورۂ الم نشرح کی تلاوت کر کے مطالب پر غور کر رہا تھا۔ اس کی یہ آیت وَرَفَعنَا لَکَ ذِکرَک ''اور اے حبیب پاک ہم نے آپ کے واسطے آپ کے ذکر کو بلند وارفع کر دیا'' دماغ کو پے در پے جھٹکے دینے لگی۔

یہ مکہ میں نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے جب حضور ﷺ کے پرستار مسلمان انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ عرب سے باہر کسی نے آپؐ کا نام بھی نہ سنا تھا نہ کوئی آپؐ کے مشن سے واقف تھا۔ اس وقت باری تعالیٰ کا یہ ارشاد خواہ کتنی ہی دور رس پیشگوئی کا حامل کیوں نہ ہو، بادی النظر میں عجیب نظر آتا تھا۔

اس وقت کس نے آیت پر غور کیا ہو گا؟ کس نے اس کی اہمیت کو سمجھا ہو گا؟ لیکن قرآن صرف پہلی صدی ہجری کی کتاب تو نہیں، اس کو تو قیامت تک زندہ رہنا اور لوگوں کو صراط مستقیم دکھاتے رہنا ہے۔

خیالات کی رو اسی طرح رواں تھی کہ یکا یک مجھے ۱۹۳۴ء کے واقعے کی یاد آئی۔ اب ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ مذکورہ بالا واقعہ ہی آیت کریمہ کی تفسیر ہے۔ مؤذن منار پر چڑھ کر اذان دیتا ہے:

اَشھَدُاَنَّ مُحَمَّدً رَّسُولُ اللّٰہ

اَشھَدُاَنَّ مُحَمَّدً رَّسُولُ اللّٰہِ

اس طرح حضور ﷺ کا نام نامی روزانہ ہر مسجد میں کم از کم بیس مرتبہ ضرور لیا جاتا ہے۔ دس دفعہ اذانوں میں اور دس مرتبہ اقامت میں!

پھر ہر دو رکعت کے بعد تمام نمازی بیٹھ کر درود شریف پڑھتے ہیں جس میں حضور ﷺ کی تعریف و توصیف ہوتی ہے۔ ہر فرض نماز کے بعد امام درود شریف کا ورد ضرور کرتا ہے۔ اس طرح ہر مسجد میں آپؐ کا ذکر دن میں ہزاروں مرتبہ کیا جاتا ہے۔

زہاد اور عبادت گزار بندوں سے قطع نظر جو دن رات درود و تسبیح میں منہمک رہتے ہیں، ایک عام دنیا دار مسلمان کی زندگی پر جس کے ہاں مذاہب عموماً روایتی رسوم کی خانہ پری کا نام رہ گیا ہے، اگر طائرانہ نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا، اس میں بھی مہد سے لحد تک حضور ﷺ کا اسم گرامی ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی جاتی ہے جس میں اسم گرامی کی تکرار ہوتی ہے۔ عقیقہ اور ختنہ کے مواقع پر بھی اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ رسول اکرم ﷺ کی سنت ہے جو ادا کی جارہی ہے۔ نکاح کا تو نام ہی عرف عام میں سنت نبوی ﷺ ہے۔ قاضی بہ موقع نکاح جو خطبہ پڑھے، بالتصریح اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

لیکن ''وَرَفَعنَا لَکَ ذِکرَک'' کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے جو ان سب سے بڑھ کر ارفع اور وزنی ہے۔ جس کی مثال نہ کسی دوسرے مذہب میں نظر آتی ہے اور نہ کسی اور پیغمبر کے متعلق اس قسم کا ارشادِ گرامی دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ ہے یہ آیت کریمہ:

ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یاایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما O (الاحزاب۔۵۶)

ترجمہ: ''خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ (خود) اور (اس کے) تمام فرشتے رسول اکرم ﷺ پر درود بھیجتے رہتے ہیں، ایمان والو! تم بھی اُن پر درود و سلام بھیجتے رہو۔''

اس دنیائے آب و گل میں تو حضور اکرم ﷺ کے ذکر مبارک کا کچھ تھوڑا سا نمونہ آپ کو درج بالا سطور میں نظر آ گیا ہوگا۔ لیکن اس آیت سے آپ کو اس رفعت کا صحیح اندازہ ہوگا جو آنحضور ﷺ کے ذکر مبارک کو عرش سے فرش تک حاصل ہے۔ چودہ سو برس سے نہیں بلکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کب سے ہو رہا ہے اور نجانے کب تک ہوتا رہے گا۔

یہ ہے اس مختصر آیت ''ورفعنالک ذکرک'' کی تفسیر ایک ہیچ مداں بندۂ عاصی کے نزدیک جس پر بہت سے مفسرین نے توجہ مبذول فرمائی۔

حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا

دنیا کی فکر دل کا اندھیرا ہے اور آخرت کی فکر دل کا نور۔

جب تم لوگوں کو اچھے کام کرتے دیکھو تو ان میں شامل ہو جاؤ اور جب بُرے کاموں میں مصروف دیکھو تو ان سے علیحدہ ہو جاؤ۔

انسان کتنا ہی مفلوک الحال ہو مگر مغلوب الحال نہ بنے۔

افضل ترین ایمان یہ ہے کہ تُو خدا کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھے۔

تلوار کا زخم بدن پر لگتا ہے مگر بُری عادت کا زخم روح پر۔

سخاوت پھل ہے مال کا، عمل پھل ہے علم کا، رضائے الٰہی پھل ہے اخلاق کا۔

ہر وہ کام دنیا ہے جس سے آخرت مقصود نہ ہو خواہ نماز جیسی نیکی ہی کیوں نہ ہو۔

دنیائے فانی کی لذتیں لینے سے عالمِ باقی کے اجر وثواب میں کمی ہو جاتی ہے۔

(مرسلہ: سعید نذیر، لاہور)

دربارِ نبوتؐ میں پایا جنھوں نے بلند مقام

مکّہ کے نابینا صحابی

ایک بلند مرتبہ مقدس شخصیت کا تذکرہ
جن کا ذکرِ خیر قرآن پاک میں فرمایا گیا

فقیر اللہ خاں

اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ مکہ کے لوگ آہستہ آہستہ پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت پر بے راہ روی کے طور طریقے چھوڑ کر حلقۂ بگوش اسلام ہو رہے تھے۔ آنحضور ﷺ کی خواہش اور کوشش تھی کہ مکہ کے بڑے بڑے سردار بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں تاکہ دین اسلام کو قوت ملے۔ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں مکہ کے چند بڑے سردار حاضر ہوئے۔ ان میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ (دونوں بھائی) عمر بن ہشام (ابوجہل)، امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ بن ولید سیف اللہ کے والد) شامل تھے۔ حضور اکرمؐ انھیں اسلامی تعلیمات سے آگاہ فرما کر دعوت اسلام کی طرف راغب کر رہے تھے۔

اچانک حضرت عبداللہؓ بن اُم مکتوم جو کہ بظاہر بصارت سے تو محروم تھے لیکن ان کا قلب بصیرت سے معمور تھا۔ آپ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے بھی بھلائی کی وہ باتیں

سکھائیں جو اللہ نے آپ ﷺ پر نازل فرمائی ہیں۔ اس وقت حضور نبی کریم ﷺ کا مخاطب اُمیہ بن خلف تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر ان سرداران مکہ میں سے ایک یا دوسردار بھی ہماری دعوتِ اسلام قبول کر لیں، تو مسلمانوں کی تقویت کا باعث ہوگا۔

اس موقع پر آپ ﷺ کو حضرت عبداللہؓ بن اُم مکتوم کی مداخلت ناگوار گزری اور آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم کی طرف بے رخی برتی۔ اللہ تعالیٰ کو رسول اللہ ﷺ کا یہ طرزِ عمل پسند نہ آیا۔ لہٰذا آپ ﷺ پر سورۂ عبس (پارہ تیس) نازل فرمائی گئیں۔ اس سورہ کی پہلی دس آیات حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم کی حمایت میں نازل فرمائیں۔ ان دس آیات کا ترجمہ یہ ہے:

''ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ نابینا اس کے پاس آ گیا۔ تمھیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو۔ جو شخص بے پروائی برتتا ہے، اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر کوئی الزام نہیں۔ اور جو شخص تیرے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ ڈر بھی رہا ہے تو اُس سے تُو بے رخی برتتا ہے۔''

(سورۂ عبس پارہ تیس)

حدیث میں ہے کہ اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد دربار نبوی ﷺ میں حضرت عبداللہؓ بن اُم مکتوم کا احترام بہت بڑھ گیا۔ آپ ﷺ ان کی طرف خصوصی توجہ دیتے اور بہت خیال فرمانے لگے۔ جب بھی آپؓ کاشانۂ نبوی ﷺ میں حاضر ہوتے، تو اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ آپؓ کی بہت خاطر مدارت کرتیں۔

آپ کا نام عبداللہ تھا۔ والد کا نام قیس بن سعد اور والدہ کا نام عاتکہ بنت عبداللہ۔ والدہ کے نام کی مناسبت سے آپ کی کنیت اُم مکتوم تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن اُم مکتوم پیدائشی نابینا تھے۔ رشتے میں رسول اکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ، ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اس لیے آنحضور ﷺ سے آپ کی عزیز داری تھی۔

جب آپ ﷺ نے پہلی مرتبہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، تو جنھوں نے اول اول دعوت پر لبیک کہا اور اسلام لے آئے، وہ ''سابقون الاوّلین'' کہلائے (یعنی اسلام قبول کرنے میں سبقت لے جانے والے لوگ)۔ ان میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی طرح عبداللہؓ بن اُم مکتوم بھی شامل تھے۔ سابقون الاوّلون میں جہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت خدیجہؓ اور بچوں میں حضرت علیؓ کا نام نامی آتا ہے وہاں حضرت عبداللہؓ بن اُم مکتوم کا نام بھی شامل ہے۔ آپ ان چند خوش قسمت اصحابہؓ میں شامل تھے جنھیں حضور اکرم ﷺ کی دعوت پر پہلے پہل اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں دو جگہ حضرت عبداللہؓ بن اُم مکتوم کا ذکر کیا ہے۔ سورۂ عبس کی پہلی دس آیات مبارکہ آپؓ کی شان میں نازل ہوئیں۔ دوسری جگہ سورۂ انساء میں بھی آپ کے جذبۂ شوق جہاد کے پیشِ نظر نہ صرف ذکر آیا بلکہ آپ کی خواہشات کے مطابق اللہ نے آیت نازل فرمائی۔ آپ حضرت بلالؓ کے علاوہ موذنِ رسولؐ بھی تھے۔ آپؓ کو رسول اللہ ﷺ ہی نے موذن مقرر فرمایا۔

حضرت عبداللہؓ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ نے کم و بیش ۱۳ مرتبہ آنحضورؐ کی عدم موجودگی میں مسجدِ نبویﷺ میں آپﷺ کی نیابت (امامت) کے فرائض انجام دیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی سعادت تھی جو انھیں نصیب ہوئی۔ سب سے پہلے جب غزوۂ بدر میں شرکت کرنے نبی کریمﷺ تشریف لے گئے، تو اپنے پیچھے آپؓ ہی کو مدینہ شہر میں اپنا نائب اور مسجد نبویؐ میں امام مقرر فرمایا۔ فتح مکہ کے وقت بھی آپؓ نے مسجد نبویؐ میں امامت کے فرائض انجام دیے۔ حضرت عبداللہؓ اُمِ مکتوم قرآن پاک کے حافظ بھی تھے۔

حضرت عبداللہ بن اُمِ مکتوم ان جانثار صحابہؓ میں شامل تھے جنھیں آنحضورؐ نے ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ مدعا یہ تھا کہ آپؓ مدینہ جا کر وہاں لوگوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیں۔ آپؓ ہجرت رسول اللہﷺ سے چند ماہ قبل حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ساتھ مدینہ آ گئے۔ جب آنحضورﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے، تو اسی سال نماز کے لیے اذان دینا شروع ہوئی۔ نبی اکرمﷺ نے حضرت بلالؓ کے ساتھ ساتھ آپؓ کو بھی موذن مسجد نبویﷺ کے منصب جلیلہ پر مامور فرمایا۔ یہ دونوں اصحابؓ آنحضورﷺ کی حیات مبارکہ میں مسجد نبویﷺ میں اذان دینے کے فرائض نہایت تندہی سے انجام دیتے رہے۔

رمضان المبارک میں یہ دستور تھا کہ لوگوں کو جگانے کے لیے حضرت بلالؓ پہلی اذان دیتے تھے اور اختتام سحر کے وقت دوسری اذان حضرت عبداللہؓ بن اُمِ مکتوم دیا کرتے۔ آپؓ کی اذان کے بعد مسلمان روزے دار کھانا پینا ترک کر دیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ مسجد نبویﷺ میں اذان حضرت بلالؓ دیتے اور حضرت عبداللہؓ بن اُمِ مکتوم اقامہ (تکبیر) پڑھتے۔

حضرت اُمِ سلمیٰؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ میں اور حضرت میمونہؓ حضورﷺ کی خدمت میں حاضر تھیں کہ اس مجلس میں حضرت عبداللہؓ بن اُمِ مکتوم تشریف لائے۔ ہم نے سوچا کہ وہ نابینا ہیں، تو ہم نے ان سے حجاب نہیں کیا۔ آنحضرتﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ حجاب کریں۔ میں نے جواب دیا کہ حضورﷺ وہ تو نابینا ہیں، دیکھ نہیں سکتے۔ آپﷺ نے فرمایا کہ کیا آپ بھی اندھی ہیں؟ آپ کی نظریں ان پر نہیں پڑ رہیں؟ اس کے بعد ہم نے حجاب کر لیا۔ اس مشہور حدیث کی روایت مشکوٰۃ، ترمذی، ابوداؤد اور مسند احمدؒ میں موجود ہے۔ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں پردے کی کس قدر تاکید کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن اُمِ مکتوم ایک دن رسول اکرمﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی ''یارسول اللہﷺ! میں نابینا آدمی ہوں۔ میرے گھر اور مسجد کے درمیان راستہ ناہموار ہے۔ کئی درخت اور جھاڑیاں بھی باعث رکاوٹ بنتی ہیں۔ میرے پاس کوئی آدمی بھی نہیں جو میری راہنمائی کر سکے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مسجد تک لا سکے۔ کیا آپﷺ میرے لیے کوئی رخصت پاتے ہیں کہ میں اپنے گھر ہی میں نماز پڑھ لیا کروں اور مسجد میں حاضر ہونے کی تکلیف سے بچ جاؤں؟''

رسول اللہﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن اُمِ مکتوم کی

مشقت اور پریشانی دیکھی۔ آپؓ کا عذر معقول تھا چناں چہ آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں! تم گھر میں نماز پڑھ سکتے ہو۔ اس کے بعد حضرت عبداللہؓ بن اُمِ مکتوم واپس چلے گئے۔

جب کفارِ مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر مسلمان مدینہ چلے آئے تو کفار مکہ کے غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ مسلمان مدینہ اور کفارِ مکہ کے درمیان غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کو کفار کے خلاف جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت عبداللہؓ بن اُمِ مکتوم چونکہ آنکھوں کی بینائی سے محروم تھےؓ اس باعث جہاد میں شرکت کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ حالانکہ ان کے دل میں جذبۂ جہاد جنون کی حد تک موجود تھا۔ اسی اثنا میں قرآن پاک کی یہ آیت اتری:

''ترجمہ: وہ مسلمان جو (بوقتِ جہاد) اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں، رہتے میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے برابر نہیں ہیں۔'' آنحضرت ﷺ کاتبِ وحی حضرت زیدؓ بن ثابت کو یہ آیت لکھوا رہے تھے کہ حضرت عبداللہؓ بن اُمِ مکتوم وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے جب یہ ارشادِ ربانی سنا تو حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا ''مجھے جہاد میں شریک ہونے کی قدرت حاصل ہوتی تو ضرور شرفِ جہاد حاصل کرتا جس سے میں محروم ہو گیا ہوں۔''

حضرت عبداللہؓ بن اُمِ مکتوم کی یہ حسرت بھری خواہش بارگاہِ خداوندی میں اتنی پسندیدہ ہی کہ اس کے بعد ایک اور حکمِ الٰہی نازل ہوا جس میں انھیں اور ان جیسے تمام معذور افراد کو جہاد میں شریک ہونے کے حکم سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ آیت ربانی یہ ہے:

ترجمہ: ''ضرر رسیدہ (معذور) افراد کے علاوہ جو مسلمان (بوقتِ جہاد) اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے ہم مرتبہ نہیں جو اپنے اموال اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں۔''
(سورۃ النساء آیت: ۹۵)

جب آپؓ نے یہ آیت سنی، تو آپؓ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ آپؓ کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ حالانکہ آپؓ کو جہاد میں شریک ہونے سے استثنیٰ مل چکا تھا، اس کے باوجود جہاد میں شریک ہونے کا شوق اس قدر تھا کہ آپؓ نے پھر بھی کئی غزوات میں حصہ لیا۔ آپؓ کہتے کہ مجھے علَم تھما دیں۔ میں ایک جگہ میدان جنگ میں اسے پکڑے کھڑا رہوں گا جس سے مسلمانوں کے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں آئے گی اور ان کے حوصلے بلند رہیں گے۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں حضرت عبداللہؓ بن اُمِ مکتوم خلیفہ رسول ﷺ کی اجازت سے ۱۴ھ میں جنگ قادسیہ میں شریک ہوئے۔ تین دن تک ایرانیوں سے معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ انھوں نے زرہ پہنی ہوئی اور علَم تھام رکھا تھا۔ تین دن بعد جب مسلمان فتح سے ہم کنار ہوئے، تو مسلمان غازیوں نے دیکھا کہ حضرت عبداللہؓ بن اُمِ مکتوم شہادت کے رتبہ سے سرفراز ہو چکے ہیں اور آپؓ نے علَم اسی طرح سے اپنے ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ یہ ۶۳۶ء کا واقع ہے۔ آخر کار نائب رسول ﷺ اور موذنِ رسول ﷺ نے شہادت جیسے رتبے کو گلے لگا کر قرآن پاک کی تفسیر کا عملی نمونہ تاریخ اسلام میں رقم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

◆◆◆

اسلام میں قانونی مساوات

بیت الحرام، اللہ کا پاک اور محترم گھر، عرب کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے زائرین سے بھرا ہوا ہے۔ لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک کی پکار ہر زبان پر ہے۔ غلام اپنے آقا کو پکار رہے ہیں۔ ان کی پکار والہیت ہے اور عجز وانکسار بھی۔ ایک بہت بڑی جماعت طواف کعبہ میں مصروف ہے۔ امیر المومنین عمرؓ بن خطاب اور ان کے ہمراہی مدینۃ النبی سے تھوڑی دیر پہلے پہنچے ہیں اور طواف کر رہے ہیں۔

مدینے کے قافلے میں عراق و شام کے نومسلم سردار بھی ہیں۔ امیرالمومنین کی معیت میں طواف کی سعادت سے بہرہ ور ہونے کے خیال سے مسجد الحرام میں موجود مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئی۔ عجب سماں ہے۔ لبیک لبیک کی دلگداز صداؤں سے فضا گونج رہی ہے۔ امیر، غریب، بادشا اور رعایا سب یکساں لباس زیب تن کیے، اللہ کے دربار میں حاضر ہیں۔ سب کی زبان پر ایک کلمہ ہے۔

تلبیہ کی اس مقدس فضا میں ناگہاں ایک کرخت آواز گونجتی ہے ''تڑاخ۔'' طواف کرنے والے رک گئے۔ لبیک اللھم لبیک کی صدائیں دھیمی پڑ گئیں۔ متجسس نگاہیں دیکھتی ہیں کہ ایک بدو سفید احرام پہنے کھڑا ہے۔ اس کی ناک کا بانسا ٹیڑھا ہو چکا اور خون بہ رہا ہے۔ بدو کے قریب ہی ایک وجیہہ وشکیل عرب اول فول بک رہا ہے۔ چہرہ غصے سے سرخ ہے اور وہ غضب آلود نگاہوں سے بدو کو گھور رہا ہے۔

اللہ نے جس مقدس گھر کو جائے امن قرار دیا، جہاں

تاریکی میں مثلِ مشعل

حصہ دوم

جن سے ملے روشنی

معرکہ خیر و شر میں بھٹکے ہوؤں کی راہنمائی کرنے والے بیش قیمت واقعات

آباد شاہ پوری

پہنچ کر ہر شخص اپنے آپ کو محفوظ اور مامون سمجھتا ہے جس کے احترام میں بڑے بڑے خودسر اور متمرد اپنی گردن خم کر دیتے ہیں۔ اس مقدس مقام پر یہ ظلم!

''بات کیا ہے؟'' لوگ بدو سے پوچھتے ہیں۔

''اس شخص کا تہ بند زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ پیچھے سے انسانوں کا ریلا جو آیا تو میرا پاؤں اس پر جا پڑا اور اس نے مجھے تھپڑ دے مارا۔'' بدو خون پونچھتے ہوئے بولا۔

''ظلم ہے ظلم۔'' ایک شخص پکار اٹھتا ہے۔

''بھیڑ بھاڑ میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ آپ کو درگزر سے کام لینا چاہیے تھا۔ دوسرا اس وجیہہ عرب سے نرمی سے کہتا ہے۔

''آپ کون ہیں صاحب؟ قصور آپ کا اپنا تھا۔ ایک مسلمان بھائی کو لہولہان کر دیا۔'' تیسرا تند و تیز لہجے میں سرزنش کرتا ہے۔

''میں؟ جبلہ ہوں غسان کا بادشاہ! اگر حدود حرم میں نہ ہوتا تو اس گستاخ کی گردن مار دیتا۔'' وہ نفرت بھری نگاہوں سے بدو کو دیکھتا اور پوچھنے والے کو بڑے تکبر سے جواب دیتا ہے۔

شام کے غسان عربوں کا حکمران جبلہ بن ایہم انصار کا ہم جد تھا' حوران اور بلقا کا تاجدار۔ چند ماہ پہلے وہ مدینۃ النبی میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا تھا۔ مسلمانوں میں اس کی آمد کی خبر سن کر مسرت اور انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ جبلہ بڑے جاہ و حشم اور تمکنت کے ساتھ سیکڑوں خدام اور مصاحبین اپنے جلو میں لیے مدینے آیا۔ شہر کے بچے' بوڑھے اور جوان سب جلوس کا نظارہ دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ خواتین بھی اپنے گھروں کی چھتوں پر اُمڈ آئیں۔

مسلمانوں کی مسرت فطری تھی۔ جبلہ اسلام اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کئی بار خبر اُڑی کہ جبلہ بھاری فوج لیے مدینے پر حملہ کرنے آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایسی ہی خبر سن کر ایک مرتبہ سخت گرمی اور قحط کے زمانے میں تبوک کی جانب مسلح ہو کر لشکر کشی کی تاکہ دشمن کو سرحد ہی پر روک دیا جائے۔ بعدازاں حضورؐ نے زید بن حارثہؓ کی قیادت میں بھی ایک فوج روانہ کی' چناں چہ موتہ کے مقام پر غسانیوں سے زبردست جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کے تین سپہ سالار کام آئے۔ خالدؓ بن ولید بڑی مشکل سے مسلمان فوج کو موت کے منہ سے نکال کر لائے۔

وہی جبلہ سرِتسلیم خم کیے اب مدینے آ رہا تھا۔ اہل مدینہ نے اس کا شایانِ شان استقبال کیا اور سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اب وہ امیرالمومنینؓ کے ساتھ حج کرنے آیا تھا۔ اُس نے اسلام کے آگے اپنا سر تو جھکا دیا۔ مگر ابھی اس کے سر سے بادشاہی کی خو بو اور نخوت نہیں گئی تھی۔ اسی نخوت کے ہاتھوں ایک مسلمان بیت الحرام کے اندر لہولہان کھڑا تھا۔

بدو جو قبیلہ فزارہ کا آدمی تھا' خون آلود احرام کے ساتھ امیرالمومنینؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امیرالمومنینؓ نے جبلہ کو بلایا' فریقین کا بیان سنا۔ پھر فرمایا:

''جبلہ زیادتی تمہاری ہے۔ اب یا تو اس فزاری کو راضی کرو یا قصاص دو۔'' جبلہ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا ''امیرالمومنینؓ مجھے آپؓ سے یہ توقع نہ تھی۔ کیا آپؓ ایک فرومایہ شخص کے بدلے مجھ سے قصاص لیں گے؟ میں ایک بادشاہ ہوں اور وہ رعایا کا ایک عام فرد۔''

''اسلام میں بلند و پست سب برابر ہیں۔ اسلامی قانون کی نظر میں بادشاہ اور رعایا سب ایک ہیں۔''

امیرالمومنینؓ کا جواب جبلہ کو حیرت میں ڈال دینے

والا تھا۔ وہ بول اٹھا ''میں تو یہ سمجھ کے مسلمان ہوا تھا کہ پہلے سے زیادہ عزت و تکریم ہوگی، لیکن آپ مجھے ایک عامی کے دوش بدوش کھڑا کر رہے ہیں۔'' اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا اور ایک جا رہا تھا۔

''جبلہ! اسلام خاص و عام میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ یہاں عزت و شرف اس شخص کو حاصل ہے جس کے اعمال نیک اور اچھا اخلاق ہے۔ اگر عمرؓ سے بھی کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اسلام کا قانون اس سے بھی باز پرس کرے گا۔ عزت چاہتے ہو تو اس بدو کو راضی کرو۔ ورنہ مجمع عام میں بدلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''یہ بات ہے تو میں اسلام سے باز آیا، میں پھر عیسائی ہو جاؤں گا۔'' جبلہ نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''عیسائی ہو جاؤ گے؟ پھر تمہاری گردن مار دی جائے گی۔ اسلام میں مرتد کی یہی سزا ہے۔'' امیرالمومنینؓ کے الفاظ سخت مگر لہجہ نہایت نرم تھا۔

جبلہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا ''امیرالمومنینؓ مجھے ایک رات کی مہلت دیجیے میں اس معاملے پر غور کر لوں۔''

امیرالمومنینؓ نے درخواست قبول کر لی۔ مسلمان مناسک حج کی ادائی میں مصروف ہو گئے۔ اگلی صبح پتا چلا کہ جبلہ اپنے ہمراہیوں سمیت بھاگ گیا ہے۔ وہ قیصر روم کے پاس پہنچا اور دوبارہ عیسائی ہو گیا۔ قیصر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے تخت پر جگہ دی۔ کسی شخص نے کہا ''امیرالمومنینؓ درگزر فرماتے تو جبلہ دشمنوں کی صفت میں نہ جاتا۔''

امیرالمومنینؓ نے سنا تو فرمایا۔ بادشاہ ہو یا عامی، اسلامی قانون ہر شخص پر لاگو ہوگا۔ عمرؓ اگر کسی شخصیت کی خاطر اسلامی قانون کو معطل کر دے تو اس سے بڑھ کر ظالم اور کوئی نہیں۔''

توجہ فرمائیے

شمارہ دسمبر میں جناب آباد شاہ پوری کا مضمون ''جس سے ملے روشنی'' شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک اسلامی واقعہ ''اسلام میں قانونی مساوات'' بوجوہ مکمل شائع نہیں ہو سکا جس پر ہم معذرت خواہ ہیں۔ یہ واقعہ زیرِنظر مضمون میں اوّل تا آخر پیش خدمت ہے۔

خدا کا شکر

حضرت زبیر بن العوامؓ کے بیٹے عروہ ابن زبیر صبر و استقامت کے پیکرِ مجسم تھے۔ بڑی سے بڑی آزمائش اور تکلیف کے موقع پر بھی زبان سے اُف نہ نکلتی۔ ایک دفعہ خلیفہ عبدالملک کے پاس شام گئے۔ ان کے لڑکے محمد بھی ساتھ تھے۔ شاہی اصطبل دیکھنے گئے۔ ایک گھوڑے نے ان کے بیٹے کو پٹک دیا۔ وہ اسی وقت جاں بحق ہو گئے۔ خود ان کے پاؤں میں سخت چوٹ آئی۔ کچھ مدت بعد عروہ کے پاؤں میں زخم ہو گیا جو ناسور کی شکل اختیار کر گیا۔ اطبا نے مشورہ دیا کہ پاؤں کاٹ دیا جائے ورنہ زہر تمام جسم میں پھیل جائے گا۔ عروہ اس وقت ضعیف ہو چکے تھے لیکن انھوں نے جوانوں سے بڑھ کر ہمت و استقلال سے کام لیا۔ پاؤں کاٹنے سے پہلے طبیب نے کہا: ''تھوڑی سی شراب پی لیجیے تاکہ تکلیف کا احساس کم ہو۔''

فرمایا: ''جس مرض میں مجھے صحت کی امید ہو، اس میں بھی حرام شے سے مدد نہ لوں گا۔''

طبیب نے کہا: ''تو بے ہوشی والی دوا ہی استعمال کر لیجیے۔''

فرمایا: ''میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ میرے جسم کا ایک عضو کاٹا جائے اور میں اس کی تکلیف محسوس نہ کروں۔''

جراحت کے وقت چند آدمی آپ کو سنبھالنے کے لیے آئے۔ عروہ نے پوچھا: ''تمہارا کیا کام ہے؟''

"زیادہ تکلیف کے وقت صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اس لیے آپ کو سنبھالنے آئے ہیں۔"

فرمایا "مجھے امید ہے تمہاری مدد کی ضرورت نہ پڑے گی۔" اور نہایت استقلال کے ساتھ پاؤں کٹوا دیا۔ پاؤں ٹخنوں سے الگ کیا گیا تو زبان پر تسبیح و تہلیل تھی۔ خون بند کرنے کے لیے زخم داغا گیا تو تکلیف کی شدت سے تڑپ اُٹھے اور بے ہوش ہو گئے، لیکن جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ اور چہرے کا پسینا پونچھ کر کٹا ہوا پاؤں منگوایا اور دیکھا۔ اُس کو الٹا پلٹا اور خطاب فرمایا: "اُس ذات کی قسم جس نے تجھ سے میرا بوجھ اٹھوایا، یہ خوب جانتا ہے کہ میں کسی حرام راستے پر گامزن نہیں ہوا۔"

ان حوادث اور مصائب کے باوجود زبان شکوہ و شکایت سے آلودہ نہ ہوئی اور ہمیشہ خدا کا شکر ہی ادا کرتے رہے۔ اکثر فرمایا کرتے:

"یااللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے چار ہاتھ پاؤں میں سے ایک ہی لیا۔ اور تین سلامت رکھے۔ ایک بیٹے ہی کو لیا اور تین باقی رکھے۔ تو نے کچھ لیا ہے تو بہت کچھ باقی رکھا۔ اگر کچھ مصیبت میں مبتلا کیا تو بہت دنوں عافیت میں بھی رکھا۔"

دولت دنیا سے بے نیازی

صفوان بن سلیم زہریؒ ان تابعین میں سے ہیں جن کے علم و فضل کا سکہ دور دور تک رواں تھا، بڑے ہی عابد و زاہد۔ انفاق فی سبیل اللہ کا یہ حال تھا کہ بدن کے کپڑے تک اتار کر دے دیتے۔ ایک رات مسجد سے نکلے۔ سخت سردی تھی۔ باہر ایک آدمی ننگے بدن نظر آیا۔ صفوانؒ نے اسی وقت اپنے کپڑے اُتار کر دے ڈالے۔ استغنا اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اموی خلیفہ، سلیمان بن عبدالملک مدینے آیا اور عمر بن عبدالعزیز کے ہمراہ مسجد نبوی میں گیا۔ ظہر کی نماز کے بعد مقصورہ کے قریب بائیں جانب دیکھا تو صفوان بیٹھے ہیں۔ سلیمان انھیں نہ پہچانتا، پوچھا: "یہ کون بزرگ ہیں؟ ان سے بہتر پیشانی میں نے آج تک کسی شخص کی نہیں دیکھی۔"

"امیر المومنین! یہ صفوان بن سلیم ہیں۔" عمر بن عبدالعزیز نے کہا:

سلیمان نے غلام کو پانچ سو دینار کی تھیلی دی اور کہا جاؤ ان بزرگ کو دے آؤ۔ غلام نے خدمت میں حاضر ہو کر تھیلی پیش کی اور عرض کیا:

"یہ امیرالمومنین کی جانب سے تحفہ ہے۔ وہ یہاں مسجد میں تشریف فرما ہیں۔"

"تمھیں دھوکا ہوا ہے، کسی اور کے پاس بھیجی ہوگی۔" صفوان نے کہا۔

"آپ صفوان نہیں ہیں؟" غلام نے پوچھا۔

"ہوں تو میں ہی۔" آپ نے فرمایا۔

"تو یہ تھیلی آپ ہی کو دی ہے۔"

فرمایا: "جاؤ دوبارہ پوچھ آؤ۔"

جونہی غلام پوچھنے گیا، صفوان جوتے اٹھا مسجد سے نکل گئے۔ پھر جتنی دیر سلیمان مسجد میں رہا، وہاں نہ گئے۔

زمین کا طوق

اندلس کے اموی حکمران الحکم نے پہاڑی کی چوٹی سے وادی کبیر کے کنارے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ بڑا دلکش منظر تھا۔ دریا کے کنارے سے بلند و بالا درختوں کی قطار چلی گئی تھی۔ عقب میں وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ سبزہ ختم ہوتے ہی قرطبہ کی عمارتیں شروع ہو گئی تھیں۔ آفتاب غروب ہونے کو تھا اور شفق کی سرخی میدان کے سبزے سے گلے مل کر عجب بہار دے رہی تھی۔ الحکم کو یہ منظر کچھ ایسا بھایا کہ میدان میں ایک عظیم الشان قصر بنوانے کا فیصلہ کرلیا۔

انجینئر اور کاری گر طلب کیے گئے۔ نقشہ تیار ہو گیا۔ زمین کی پیمائش ہوئی۔ قصر سے حسن دوبالا کرنے اور باغات لگوانے کے لیے قرب و جوار کے مکانات گرانے کا فیصلہ ہوا۔ مالکوں سے بات چیت کی گئی۔ سب نے معقول معاوضہ لے کر مکان دے دیے، لیکن ایک بیوہ خاتون نے اپنا مکان بیچنے سے صاف انکار کر دیا۔ شاہی حکام نے ہر چند کہا، دوسرے لوگوں سے کئی گنا قیمتی پیش کی، دباؤ ڈالا، ڈرایا دھمکایا، مگر بیوہ تحریص کے دام میں آئی نہ دھمکیوں سے مرعوب ہوئی۔ معاملہ الحکم تک پہنچا۔ وہ سخت چراغ پا ہو گیا۔ فوراً فرمان جاری کیا: ''مکان زبردستی لے لیا جائے اور قصر کی تعمیر شروع کر دی جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ کوتوال نے بیوہ کو زبردستی مکان سے کال دیا۔ کدال اور پھاوڑے حرکت میں آ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مکان زمین بوس ہو گیا۔ چند ماہ بعد اُس کی جگہ ایک خوش نما قصر سر اُٹھائے کھڑا تھا۔

عورت نے عدالت میں بادشاہ پر استغاثہ دائر کر دیا۔ قاضی سے کہا: ''میں ایک غریب بیوہ ہوں، بادشاہ نے میرے یتیم بچوں کا حق غصب کر لیا ہے۔ بادشاہ کے مقابلے میں انصاف کی توقع کم ہے، لیکن اگر آپ آزادی اور جرأت سے کام لیں اور انصاف کریں تو میرے بچے کبھی اپنے حق سے محروم نہیں رہ سکتے۔''

''بی بی بے فکر رہو، میں عدل و انصاف سے کام لوں گا۔ بادشاہ اور ایک غریب عورت میری نظر میں یکساں ہیں۔ اگر تمہارا حق بنتا ہے تو کوئی تمھیں اس سے محروم نہیں کر سکتا۔'' قاضی نے جواب دیا۔

قاضی، بادشاہ کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ وہ بڑا تند خو اور شعلہ صفت انسان تھا۔ ایک بار اُس نے دھوکے سے اپنے تین سو مخالفین قتل کر کے اُن کے سر محل پر لٹکوا دیے تھے۔ کسی کو اُس کے سامنے بولنے کی مجال نہ تھی۔

قاضی نے عورت کو لمبی تاریخ دی اور الحکم کے نام عدالت میں حاضر ہونے کے سمن جاری کر دیے۔ عورت لمبی تاریخ ملنے کے بعد مایوس ہو گئی لیکن قاضی چاہتا تھا کہ سماعت کی نوبت نہ آئے اور دوسری تدبیروں سے غریب عورت کا حق مل جائے۔

قصر تعمیر ہو چکا تھا، باغات لگ رہے تھے۔ ایک روز قاضی کو خبر ملی کہ بادشاہ قصر کا معائنہ کرنے تنہا جا رہا ہے۔ قاضی گدھے پر خالی بورا لادے پہنچ گیا اور عرض کی کہ غلام اس جگہ کی مٹی بطور اعزاز اپنے پائیں باغ میں ڈلوانا چاہتا ہے۔ ایک بورا بھرنے کی اجازت مرحمت فرمائیے۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ قاضی بورا بھر چکا تو کہنے لگا: ''تھوڑا سا ہاتھ بٹائیے میں بورا گدھے پر رکھ لوں۔'' بادشاہ تمسخر کے انداز میں ہنس دیا اور بوجھ اٹھانے میں مدد دی، لیکن بورا بہت بھاری تھا اُٹھ نہ سکا۔

قاضی نے کہا: ''اے امیر! آپ ایک بورے کا بوجھ دوسرے کی مدد سے بھی نہیں اُٹھا سکتے، پھر قیامت کے روز جب حاکموں کا حاکم ذرا ذرا حساب لے گا اور عدل و انصاف کے لیے رعایا اور بادشاہ اور فقیر و غنی سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دے گا، جب غریب و بے نوا اپنے اچھے اعمال کی بدولت ناانصاف بادشاہوں پر سبقت لے جائیں گے اور جب وہ غریب بیوہ عورت جس کا مکان زبردستی چھین کر آپ نے یہ محل بنوایا ہے، بارگاہِ الٰہی میں آپ کے خلاف استغاثہ دائر کرے گی اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا کہ اس زمین کا طوق آپ کی گردن میں ڈال دیا جائے تو آپ اس کا بوجھ کیسے اُٹھا سکیں گے؟''

الحکم قاضی کی تقریر سن کر رونے لگا۔ اسی وقت حکم دیا کہ محل اور باغات مع ساز و سامان کے اس بیوہ عورت کو دے دیے جائیں۔

امیر المومنین عمرؓ بن الخطاب اپنے احباب کی محفل

میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی: آپ گورنر بناتے ہیں تو اس پر شرائط عائد کرتے ہیں، مگر پھر نہیں دیکھتے کہ وہ ان شراط کی پابندی کر رہا ہے یا نہیں؟''

حضرت عمرؓ کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے اور جوابدہی کا خوف آ لیتا ہے۔ پوچھتے ہیں: ''کیوں بھائی کی بات ہے؟ کس گورنر کی بات کر رہے ہو؟''

''مصر کے گورنر عیاض بن غنمؓ کی۔ وہ آپ کی شرائط کی پابندی نہیں کرتا' ان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔''

امیرالمومنین اسی وقت دو آدمیوں کا ایک تحقیقاتی کمیشن روانہ کرتے ہیں کہ جاؤ صورت حال کا پتا کرو' اگر یہ شخص سچ کہتا ہے تو اُسے میرے پاس لے آیو۔''

دونوں اصحاب مصر پہنچتے ہیں اور لوگوں سے دریافت کرتے ہیں۔ شکایت درست نکلتی ہے۔ پھر گورنر ہاؤس پہنچتے ہیں اور باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔

''اس وقت ملنے کی اجازت نہیں۔'' گورنر کہلا بھیجتا ہے۔

''انھیں کہہ دو باہر نکلیں ورنہ ہم دروازے کو آگ لگا دیں گے۔'' امیرالمومنین کے فرستادہ کہتے ہیں۔ ایک جا کر آگ لے آتا ہے۔ گورنر کو خبر ملتی ہے تو وہ باہر نکل آتے ہیں۔

''ہم عمرؓ بن الخطاب کے قاصد ہیں۔ آپ کو ابھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔'' دونوں کہتے ہیں۔

عیاضؓ کہتے ہیں۔ ''ذرا ٹھہریئے' میں زادِراہ لے لوں۔''

قاصد کہتے ہیں۔ ''نہیں آپ گھر نہیں جا سکتے۔'' وہیں باہر ہی سے انھیں ساتھ لیتے اور منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے امیرالمومنین کی خدمت میں لا حاضر کرتے ہیں۔

عیاضؓ بدو تھے' مصر کی آب و ہوا میں خاصے گورے چٹے اور موٹے ہو گئے تھے۔ سلام کرتے ہیں' تو امیرالمومنینؓ پوچھتے ہیں: ''افسوس ہے تو کون ہے؟''

''عیاض بن غنمؓ آپ کا گورنر مصر۔''

''میں نے تمھیں گورنر کچھ شرائط پہ بنایا تھا' مگر تم نے انھیں قابل اعتنا تک نہیں سمجھا بلکہ ان کی خلاف ورزی کی' بخدا میں تمھیں سخت سزا دوں گا۔'' پھر عمرؓ اپنے غلام کو حکم دیتے ہیں ''اون کا ایک جبہ' ایک لاٹھی اور بیت المال کی تین سو بکریاں لاؤ۔''

حکم کی تعمیل ہوتی ہے۔

''یہ جبہ' لاٹھی ار بکریاں لو اور فلاں جگہ چلے جاؤ اور چراؤ۔'' امیرالمومنین عیاضؓ سے کہتے ہیں۔

گرمیوں کا موسم اور پھر یہ مشقت۔ عیاض بن غنمؓ سنائے میں آ جاتے ہیں۔ وہ تذبذب کے عالم میں کھڑے ہیں۔ انکار کی مجال ہے اور نہ تعمیل کا یارا۔ انھیں متذبذب پا کر امیرالمومنین کہتے ہیں: ''کیوں؟ تمھیں تامل ہے؟ میں نے تمہارے باپ کو دیکھا ہے۔ یہ جبہ اس کے جبے سے اور یہ لاٹھی اس کی لاٹھی سے بہتر ہے۔ اُٹھو اور بکریاں لے جاؤ اور چراؤ...... ہاں کسی سائل کو اس کے دودھ سے محروم نہ رکھنا۔ یہ بھی جان لو کہ عمرؓ کے گھر والوں نے بیت المال کی ان بکریوں سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ نہ دودھ پیا اور نہ ہی ان کا گوشت کھایا۔''

عیاض بن غنمؓ ابھی تک دم بخود کھڑے ہیں۔ عمرؓ فرماتے ہیں: ''سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

عیاضؓ پھر بھی چپ رہتے ہیں۔ عمرؓ تین بار یہی الفاظ کہتے ہیں۔ تیسری بار عیاضؓ زمین پر گر پڑتے ہیں' مگر عمرؓ کا فیصلہ اٹل ہے' وہ اپنی سزا نافذ کر کے رہتے ہیں۔ چند روز بعد عیاضؓ کو طلب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

''اب اگر میں تمھیں واپس مصر بھیج دوں اور تمہارا منصب بحال کر دوں' تو تم کیسے انسان ثابت ہو گے؟''

''جیسا آپ چاہیں گے۔'' عیاضؓ جواب دیتے ہیں۔

امیرالمومنین انھیں گورنری پر بحال کر دیتے ہیں۔

عیاضؓ مصر پہنچتے ہیں تو وہ بالکل بدلے ہوئے انسان ہیں۔ عمر کے درۂ احتساب نے ان کی گورنری کے کس بل نکال دیے ہیں۔

اور پھر وہ بہترین گورنر ثابت ہوتے ہیں۔ ◆◆◆

علاقہ کیریبین کے کمیونسٹ جزیرے

کیوبا میں پہلی مسجد

ترک وزیراعظم، طیب اردگان کی سعی سے اب کمیونسٹوں کے گڑھ میں بھی اذان کی بابرکت آواز گونجے گی

ہادی محمود

اورتا کوے مسجد

اسلامی خبریں

ترک صدر، طیب اردگان چاہتے ہیں کہ لاطینی امریکا میں اسلام کا امن و سلامتی والا پیغام پھیلایا جائے۔ چناں چہ ان کی خواہش پر ۱۵ نومبر ۲۰۱۴ء کو استنبول میں لاطینی امریکا کے مذہبی راہنماؤں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں ۴۰ ممالک کے ۷۶ علما شریک ہوئے۔ اسی کانفرنس میں ترک وزیراعظم نے یہ اعلان کر کے دنیائے مغرب میں خاصی ہلچل مچا دی کہ امریکا کرسٹوفر کولمبس نہیں مسلمانوں نے دریافت کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جب ایشیا تا افریقا مسلمانوں کی حکومت تھی، تو مسلم جہاز رانوں نے دور دراز کے سفر کیے۔ یہ مسلم جہاز راں بڑے ذہین، دلیر اور قابل تھے۔ انھوں نے جہاز رانی میں استعمال ہونے والے کئی آلات ایجاد کیے۔ ان میں بعض اب بھی قابل استعمال ہیں۔ چناں چہ یہ عین ممکن ہے کہ اس زمانے میں مسلم جہاز

ران امریکا جا پہنچے تھے۔
المسعودی ممتاز عرب جغرافیہ دان گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب، مروج الذھب و معادن الجواہر (شائع شدہ ۹۵۶ء) میں ذکر کیا ہے کہ قرطبہ، اندلس کے ایک نوجوان، خشخاش بن سعید نے بحراوقیانوس پار کیا اور دوسری سمت جا نکلے۔ وہ طویل عرصے بعد ۸۸۹ء کو واپس اندلس لوٹے۔ گویا مسلمان جہاز ران کولمبس سے بہت پہلے براعظم امریکا دریافت کر چکے تھے۔ کولمبس تو ۱۴۹۲ء میں وہاں پہنچا۔

طیب اردگان نے دوران تقریر یہ بھی ذکر کیا کہ کولمبس نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے، اسے کیوبا کے ساحل پر مسلمانوں کی عبادت گاہ (مسجد) نظر آئی۔ ترک وزیراعظم کی خواہش ہے کہ مسلمانوں نے براعظم امریکا میں اپنے علم و فضل سے آگاہی کی جو روشنی پھیلائی، اسے اجاگر ہونا چاہیے۔ یوں دنیا والوں پر آشکار ہوگا کہ جدید تہذیب و تمدن کی نمود و نشوونما میں مسلمان علما و فضلا کا بھی اہم کردار ہے۔

ترک وزیراعظم کی یہ بھی تمنا ہے کہ لاطینی امریکا کے مختلف علاقوں میں مساجد تعمیر کی جائیں۔ یہ ان کے جوش و جذبے ہی کا نتیجہ ہے کہ کیوبا کی کمیونسٹ حکومت بھی دارالحکومت ہوانا میں مسجد تعمیر کرنے پر سنجیدگی سے غور و فکر کر رہی ہے۔

کیوبا ۱۹۵۹ء سے کمیونسٹ ملک چلا آ رہا ہے۔ لاطینی امریکا کے اس جزیرے میں اسلام ان مسلم طلبہ نے پھیلایا جو وہاں تعلیم حاصل کرنے گئے۔ اس وقت ملک میں تقریباً نو ہزار مسلمان آباد ہیں۔ ان کی اکثریت ہوانا میں بستی ہے۔

کمیونسٹ مملکت ہونے کے باعث یہ مسلمان اسلامی رسوم کھلے عام ادا نہیں کر سکتے۔ نماز عموماً گھروں میں پڑھتے ہیں۔ گویا پورے کیوبا میں ایک بھی مسجد موجود نہیں۔ نماز جمعہ کسی کے بڑے گھر میں پڑھی جاتی ہے۔ کئی سال قبل سابق کیوبن صدر، فیدل کاسترو نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے لیے ایک عبادت گاہ تعمیر کی جائے گی تاہم وہ ایفا نہیں ہو سکا۔

چند ماہ قبل طیب اردگان نے ایک سرکاری وفد کیوبا بھجوایا۔ اس کے ایجنڈے میں مسجد تعمیر کرنے کی اجازت حاصل کرنا بھی شامل تھا۔ ترک اور کیوبن حکومتوں کے مذاکرات کامیاب رہے۔ اور کیوبن حکومت نے مسجد تعمیر کرنے کی ہامی بھر لی۔

اس معاملے میں پیش رفت ماہ نومبر میں ہوئی جب ترک حکومت نے ہوانا میں پانچ ایکڑ قطعہ اراضی خریدا۔ اس قطعے پر استنبول کی مشہور اورتاکوئے مسجد کی طرز پر مسلم عبادت گاہ بنانے کا منصوبہ ہے۔ اورتاکوئے مسجد انیسویں صدی میں ترک خلیفہ عبدالمجید اول نے تعمیر کرائی تھی۔

مسجد کی تعمیر کے بعد وہاں پانچ سو مسلمان نماز پڑھ سکیں گے۔ شہر کے کچھ کٹر کمیونسٹ لیڈر مسجد کی تعمیر کے مخالف ہیں۔ تاہم ترک حکومت کو یقین ہے کہ یہ مخالفت جلد دم توڑ جائے گی۔ یاد رہے، ترک حکومت جزیرہ ہیٹی میں بھی اپنے خرچ پر پہلی مسجد بنوا رہی ہے۔ وہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔

اسلام کی بڑھوتری کے لیے ترک حکومت کی کاوشیں قابل تعریف ہیں۔ طیب اردگان کی قیادت میں ان کی جماعت رفتہ رفتہ ترکی میں شعائر اسلام متعارف کروا رہی

ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں ترک قوم کی منفی مغربی رسوم و رواج سے چھٹکارا پالے گی۔ مثلاً بیہودہ لباس پہننا، غیر اخلاقی ٹی وی ڈرامے و پروگرام وغیرہ۔

باحجاب خاتون کا انتخاب

۱۲/اکتوبر ۲۰۱۴ء کو بوسنیا و ہرزیگووینیا میں عہدہ صدارت اور قومی اسمبلی کے لیے انتخابات ہوئے۔ صدارتی انتخابات میں اس یورپی مملکت میں آباد مسلمانوں نے باقر عزت بیگووچ کو بطور صدر منتخب کیا۔ آپ مشہور بوسنیائی صدر، عالیجاہ عزت بیگووچ کے صاحبزادے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں پہلی بار منتخب ہوئے تھے۔

یاد رہے کہ بوسنیا و ہرزیگووینیا میں بوسنیائی مسلمان، سرب اور کروٹ اپنے اپنے صدر اوراراکان اسمبلی منتخب کرتے ہیں۔ مملکت کی قومی اسمبلی میں کل ۴۲ نشستیں ہیں۔ ان میں سے ۲۸ مسلم و کروٹ اور ۱۴ سربوں کے لیے مخصوص ہیں۔

باقر عزت بیگووچ سیاسی جماعت، پارٹی آف ڈیموکریٹک ایکشن کے سربراہ بھی ہیں۔ یہ بوسنیائی مسلمانوں کی اہم جماعت ہے۔ اس نے حالیہ پارلیمانی انتخابات میں ۱۰ نشستیں جیتی ہیں۔ ایک نشست پر پارٹی کی خاتون امیدوار، کانیلا زوکو بھی منتخب ہوئیں۔

۳۸ سالہ کانیلا زوکو کو نہ صرف قومی اسمبلی کی پہلی خاتون امیدوار ہونے کا اعزاز حاصل ہوا بلکہ خاص بات یہ کہ وہ حجاب بھی پہنتی ہیں۔ کانیلا دس سال قبل سیاست میں آئیں۔ ان کے سامنے ایک خاص مقصد تھا۔۔۔۔۔ وہ یہ کہ اپنی صلاحیتیں ملک وقوم کی ترقی میں کام لائیں۔ وہ تین بچوں کی ماں اور اپنی گھریلو و سیاسی ذمے داریاں بہ احسن وخوبی نبھا رہی ہیں۔

کانیلا زوکو فاطمہ ایسوسی ایشن کی سربراہ ہیں۔ پارٹی آف ڈیموکریٹک ایکشن کی یہ تنظیم ان بچوں کی فلاح و بہبود پر مامور ہے جن کے والدین بوسنیا خانہ جنگی میں شہید ہوگئے تھے۔

بوسنیا و ہرزیگووینیا کا ۵۱ فیصد علاقہ مسلمانوں اور کروٹوں جبکہ ۴۹ فیصد بوسنیائی سربوں کے پاس ہے۔ بدقسمتی سے ان تین نسلوں کے مابین اختلافات اور بداعتمادی کی فضا موجود ہے۔ اس لیے مملکت کی معاشی و معاشرتی ترقی موزوں انداز میں انجام نہیں پا رہی۔

بوسنیا کی باحجاب خاتون، کانیلا زوکو

سکڑتے سمٹتے بھارتی مسلمان

بھارت میں مسلمانوں کی آبادی ۱۸ تا ۲۰ کروڑ کے مابین ہے۔ گویا وہ کل آبادی کا ۱۴ تا ۱۶ فیصد ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے لوک سبھا (بھارتی قومی اسمبلی) میں ان کی ۵۵ تا ۶۰ نشستیں ہونی چاہئیں۔ لیکن موجودہ لوک سبھا میں صرف ۲۲ مسلم ارکان بھارتی مسلمانوں کی نمائندگی کررہے ہیں۔

لوک سبھا میں مسلم ارکان کی بہت کم تعداد کے باعث یہ خطرہ پیدا ہو چکا کہ بھارتی مسلمان معاشی،

معاشرتی اور سیاسی طور پر نہ صرف مزید زوال پذیر ہوں گے بلکہ معاشرے سے کٹ جائیں۔ یہ خطرہ جنم لینے کی بڑی وجہ آر ایس ایس اور بی جے پی کے روپ میں انتہا پسند ہندوؤں کا عروج پانا ہے۔

بھارت کے ماہر سیاسیات، رشید قدوائی کہتے ہیں:

''بھارت دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ عمدہ اور متحرک جمہوریت میں تمام نسلی و مذہبی گروہ اپنی آبادی کے حساب سے نمائندگی پاتے ہیں۔ لیکن بھارتی مسلمانوں کو ہر سطح پر کم نمائندگی حاصل ہے۔''

مسلمانوں کو رجھانے میں کیا مودی کامیاب ہے؟

۱۹۵۷ء میں بھی لوک سبھا میں صرف ۲۳ ارکان مسلمان تھے۔ لیکن اس بار ان کی تعداد تو کم ترین ریکارڈ بن گیا۔ پچھلی لوک سبھا میں مسلمان ارکان کی تعداد ۲۸ تھی۔ جبکہ اس سے پچھلی میں ۳۶ مسلم امیدوار منتخب ہوئے تھے۔

بھارت کی ریاستی اسمبلیوں میں بھی مسلمان ارکان کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ مہاراشٹر اور ہریانہ کی حالیہ ریاستی میں بی جے پی انتخابات جیت کر برسر اقتدار آ چکی۔ ماہرین سیاسیات کا دعویٰ ہے کہ اسمبلیوں میں مسلم ارکان کی کم ہوتی تعداد کا چلن مزید چند سال برقرار رہے گا۔ وجہ یہ کہ ہندو عوام اپنے ہی ہم مذہب امیدواروں کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ لہٰذا جن حلقوں میں مسلم آبادی زیادہ ہے، مثلاً کشمیر، بنگال اور کیرالہ وغیرہ میں، وہیں سے مسلمان امیدوار الیکشن جیت سکیں گے۔

باشعور اور تعلیم یافتہ بھارتی مسلمانوں کا کہنا ہے:

''جب اسمبلیوں میں ہمارے نمائندے ہی نہ ہوں، تو مسلم حقوق کی خاطر کون آواز بلند کرے گا؟'' اسی لیے انھیں تشویش ہے کہ غربت، جہالت اور بیماری مسلمانوں کے گرد گھیرا مزید تنگ کر دے گی۔

بھارت میں اب مسلم راہنماؤں کی کوشش ہے کہ آبادی کے تناسب کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں میں نمائندگی دی جائے۔ ۱۹۳۹ء میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اسی لیے ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات ''تناسب آبادی'' یا پروپورشنل ری پریزنٹیشن (Proportional Representation) کے اصول پر منعقد ہوئے تھے۔

اگر بھارتی حکومت بھی درج بالا اصول تسلیم کر لے، تو قدرتاً اس سے بھارتی مسلمانوں کو بہت فائدہ ہو گا۔ وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ لوک سبھا میں کم از کم ''۶۰ مسلم ارکان'' پہنچ سکیں۔ یوں لوک سبھا میں مسلمان طاقتور گروہ کی حیثیت اختیار کر کے اپنے مطالبات منوا سکیں گے۔ ابھی تو ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی مانند جاتی ہے۔ ◆◆◆

ہم دوپہر ساڑھے بارہ بجے وہاں پہنچے۔ یہ ضلع گھوٹکی کے ایک چھوٹے سے شہر، قادرپور سے چھے کلومیٹر دور دریائے سندھ کے دائیں پشتے کے ساتھ بہتی ایک بہت بڑی نہر، گھوٹکی فیڈر پر بنا بند تھا جسے ''گھوٹکی بند'' کہتے ہیں۔ اس بند کے ذریعے گھوٹکی فیڈر سے چار چھوٹی نہریں نکالی گئی ہیں۔ یہ بڑی نہر کے دائیں کنارے مختلف زاویے بناتی ایک دوسرے سے دور ہوتی اور ضلع گھوٹکی اور ملحق اضلاع کی زرعی زمین سیراب کرتی ہیں۔ بند کے قریب ان نہروں کو غور سے دیکھنے پر یہ ہاتھ کی پانچ انگلیوں کی طرح نظر آتیں۔

ان کے درمیان موجود خشک جگہوں کو نہروں پر کنکریٹ، بجری اور مٹی کی مدد سے پل بنا کر جوڑا گیا تھا۔ پہلی نہر اور گھوٹکی فیڈر کے درمیان قدرے زیادہ جگہ تھی۔ اسی پر محکمہ زراعت کا چھوٹا سا بنگلہ بنا تھا۔ دوسری نہروں کے درمیان خالی جگہوں میں زندگی سرگرم نظر آتی۔ وہاں

ایک دیہاتی سندھی کا نعرہ مستانہ

''یہ جامن سندھ کے ہیں''

نفرت کے بھڑکتے الاؤ کو جب محبت کی مہکتی خوشبو نے گل و گلزار بنا دیا......

ایک دل گداز قصہ جو مدتوں یاد رہے گا

محمد عابد عباسی
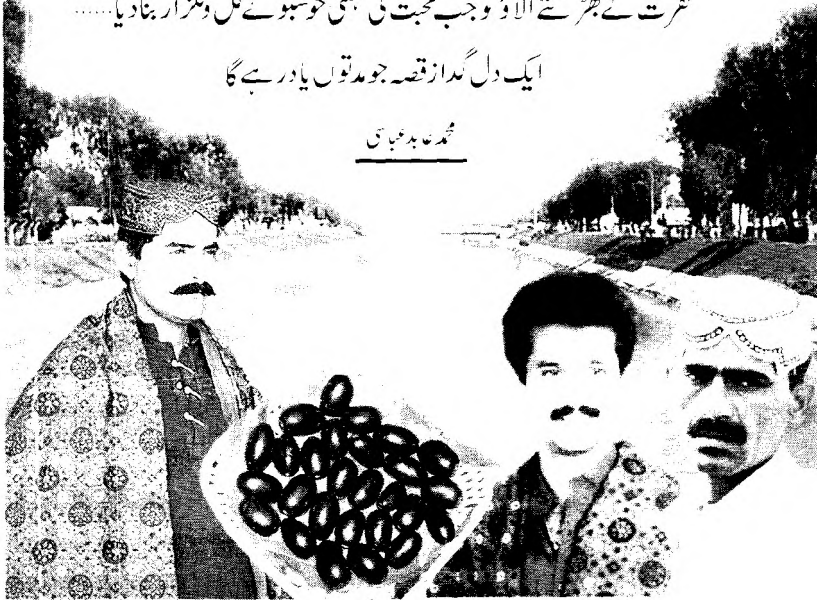
پرچون کی ایک بڑی دکان، زرعی اجناس کا کاروبار کرنے والوں کی بغیر دروازوں والی دکانیں، لوہار کی بھٹی اور بڑھئی اور نائی کے ٹھیے بنے تھے۔ اس سارے منظر کے سرسری جائزے ہی سے مجھے محسوس ہو گیا، ایسی جگہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔

ہم نے فوری طور پر اپنا کام شروع کر دیا۔ وائرلیس سیٹ اور اس کا انٹینا ٹرک سے اتار زمین پر رکھا۔ بیٹری، جنریٹر، لوہے کا پلنگ اور دیگر متعلقہ سامان بھی نیچے اتار دیا۔ ہمارے ساتھ کمیونی کیشن پولیس کے ڈویژنل ہیڈکوارٹر خیرپور سے ٹیکنیکل عملہ بھی آیا تھا۔ اب وائرلیس اور انٹینا نصب کرنے کا مرحلہ باقی تھا۔ اس کے لیے جگہ کا تعین میجر اشفاق نے کرنا تھا۔ انھیں ہماری راہنمائی کے لیے پنوں عاقل چھاؤنی سے وہاں آنا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں میجر اشفاق فوجی جیپ میں اپنے چند جوانوں کے ساتھ آ گئے۔ انھوں نے مخصوص انداز میں اپنا تعارف کرایا پھر ہمیں سیدھا بنگلے پر لے جا کر ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا "آپ وائرلیس اس کمرے میں سیٹ کر لیں۔ انٹینا چھت پر نصب کریں۔ جب آپ کا کمیونیکیشن ہو جائے تو اپنے ہیڈکوارٹر سے کہنا، مجھے اطلاع کر دیں۔"

اس کے ساتھ میجر اشفاق نے "صوبیدار آچر صاحب" کہہ کر ایک شخص کو آواز دی۔ وہ صاحب تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور میجر صاحب کو غیر پیشہ ورانہ انداز میں سلیوٹ کیا۔ انھوں نے ان کا تعارف کرایا "صوبیدار آچر فرنٹیئر فورس کی کمپنی کے صوبیدار اور اس چیک پوسٹ کے انچارج ہیں۔"

انھوں نے صوبیدار صاحب کو ہمارا خیال رکھنے کا کہا اور ساتھ ہی کہنے لگے کہ وہ باقر کو ہم سے ملوا دیں۔ یہ ہدایت دے کر وہ روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد صوبیدار آچر نے ہمیں باقر سے ملوا دیا۔ وہ دبلا پتلا شخص محکمہ زراعت کا ملازم تھا۔ بند پر آبی بہاؤ کی اونچ نیچ سے اسی نے ہمیں آگاہ رکھنا تھا۔ ہم لوگ اپنے کام پر جت گئے۔ دو گھنٹوں کی محنت کے بعد نہ صرف انٹینا نصب ہوا بلکہ ہمارا رابطہ کراچی، تمام بیراجوں اور اہم بندوں پر قائم فلڈ اسٹیشنوں سے ہو چکا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر ٹیکنیکل عملہ روانہ ہو گیا۔ میں اور رب نواز وہاں رہ گئے۔ اب اگلے چار ماہ تک ہم دونوں کو وہیں رہنا تھا۔ رب نواز گھوٹکی شہر کا رہنے والا تھا۔ پہلے روز ہی شام کو اگلی صبح آنے کا کہہ کر شہر چلا گیا۔

شام کو چھے بجے باقر ایک تھال میں میرے لیے کھانا لایا جو دو روٹیوں اور مچھلی کے سالن پر مشتمل تھا۔ مجھے سخت بھوک لگی تھی، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ وائرلیس سیٹ کے لیے ہمیں جو کمرا ملا وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس میں بمشکل ایک میز و کرسی سما سکتی تھی۔ وہاں ایک چارپائی پہلے ہی پڑی تھی۔ میں نے کمرے کے اندر روشنی کے لیے بیٹری کی مدد سے ایک چھوٹا بلب لگا لیا۔ کمرے سے باہر درخت کی ایک شاخ پر بھی ایک بلب لٹکایا۔ نوارٌ سے بنا پولیس کا مخصوص پلنگ گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے کمرے کے سامنے کھلی جگہ پہ بچھا دیا۔ رات ہوتے ہی میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا مگر نجانے کیوں نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں پچھلے ایک سال میں اپنی زندگی کے حیران کن اتار چڑھاؤ پر غور کرنے لگا۔

یہ محض ایک سال قبل جون ۱۹۸۷ء کی بات تھی کہ میں زندگی کی ناہمواریاں پاٹنے کی جستجو میں تعلیم ادھوری

چھوڑ محکمہ پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ پولیس کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ میری اہلیت اور تعلیم صرف اسی محکمہ میں کھپ سکتی تھی۔ نیز کمیونیکیشن پولیس کو اسی لیے چنا کہ بطور وائرلیس آپریٹر معززانہ طریقے سے ملازمت کر سکوں۔ لیکن تربیت سے فارغ ہوتے ہی پتا چلا، یہ محکمہ تو پورے سندھ پر محیط ہے اور کسی بھی ضلع میں تقرری ہو سکتی ہے۔ لہٰذا مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر خیرپور ڈویژنل ہیڈکوارٹر رپورٹ کرنے کا حکم ملا۔

گھر والوں سے دور ہونے کے احساس اور کچھ اندرون سندھ کی امن و امان کی بگڑتی صورت حال خصوصاً لسانی جھگڑوں کے پس منظر میں یہ تعیناتی مجھے اچھی نہیں لگی۔ وہ سارا ہفتہ میں پریشان رہا لیکن سوائے تعمیل کے کوئی راستہ نہ تھا۔

خیرپور میرس ایک چھوٹا مگر خوبصورت شہر ہے۔ انگریز دور میں ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ دو سے تین گھنٹوں میں آپ پیدل ہی پورے شہر کی سیر کر سکتے ہیں۔ مجھے خیرپور کا چھوٹا مگر انتہائی صاف ستھرا اسٹیشن بہت پسند آیا۔ وہاں کی خاص جگہوں میں اس کا بازار، پنج گلہ، ریڈیو اسٹیشن، خیرپور یونیورسٹی اور کھجوروں کی منڈی قابل ذکر ہیں۔ مجھے یہاں آئے چھ ماہ گزرے تھے اور وقت اچھا ہی گزر رہا تھا کہ مون سون کا موسم آ پہنچا۔ چنانچہ مجھے چار ماہ کے لیے گھوٹکی بند پر عارضی فلڈ اسٹیشن قائم کرنے بھیج دیا گیا۔ اب میں اس بند پر موجود تھا۔ ”واہ ری قسمت، میں تو خیرپور آنے کو تیار نہ تھا چہ جائیکہ یہ جنگل۔“ میں مسکراتے ہوئے بڑبڑایا۔ انھی خیالوں میں الجھے کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔

دوسری صبح سات بجے رب نواز نے مجھے اٹھایا۔ وہ وائرلیس سیٹ چلا کام میں مصروف ہو گیا۔ میں کمرے سے باہر نکلا اور نہر کے قریب لگے برمے پر منہ ہاتھ دھویا۔ حر فورس کے جوان کھانا پکانے میں مصروف تھے۔ اس جگہ زندگی رواں دواں تھی۔ قریب کے دیہات سے کسان اپنی بیل گاڑیوں میں سبزیاں اور دیگر اجناس لیے بند پر پہنچ رہے تھے۔ بیوپاری یہ اشیا خرید کر گھوٹکی اور دیگر چھوٹے قصبات سے آئے دکانداروں کو فروخت کرتے۔ یہاں یہ سارا کاروبار علی الصباح شروع ہو کر نو بجے ختم ہو جاتا۔ پھر تمام لوگ اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ اس کے بعد بند پر سارا دن آس پاس کے گوٹھوں سے اکا دکا لوگوں کی آمد ہی رہتی۔ کوئی اپنے زرعی آلات کی مرمت کرانے آتا اور کوئی پرچون کا سودا سلف خریدنے۔

دونہروں کے پار ایک چھوٹی سی مسجد واقع تھی۔ وہاں ظہر و مغرب کے اوقات میں تو تھوڑا بہت ہجوم ہوتا مگر عشا اور فجر میں چند لوگ ہی نماز ادا کرتے۔ وہ بند کے نزدیکی گاؤں میں رہتے۔ یا پھر بند پر کسی نہ کسی تعلق سے ڈیوٹی پر مامور تھے۔ باقاعدگی سے نماز پڑھنے والوں میں مسجد کے امام جو موذن بھی تھے، اریگیشن کا ملازم باقر، حر فورس کے جوان اور اب میں بھی شامل تھا۔

حر فورس پیر صاحب پگارا کے مریدوں پر مشتمل ایک نیم فوجی مسلح دستہ ہے۔ سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس ان کے پچیس جوان جنگلوں میں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن میں فوج و پولیس کی مدد کے لیے بند پر تعینات تھے۔ چونکہ یہ لوگ مقامی تھے اور اپنے جنگلات سے واقف، اس لیے فوج آپریشن میں ان کی مدد حاصل کرتی تھی۔ میرے آنے سے کچھ عرصہ قبل تک تو فوج کی پوری ایک کمپنی اس بند پر باقاعدہ تعینات تھی۔ مگر حالات بہتر ہونے پر فوج بند کا چارج حروں کے حوالے کر کے چلی

گئی۔ تاہم کم و بیش روزانہ ہی فوج کا ایک میجر اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ ۲۴ گھنٹوں کی رپورٹ لینے وہاں آتا۔ آج کل میجر اشفاق یہ ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔

پولیس ٹیلی کمیونیکیشن محکمہ سندھ پولیس ہی کا ایک ذیلی ڈیپارٹمنٹ ہے۔ اس کا کام وائرلیس پر پولیس سے رابطے بحال رکھنا ہے۔ ہر سال بارشوں کے موسم میں جب دریاؤں میں پانی کی آمد اور اخراج بڑھ جائے تو یہ محکمہ اریگیشن ڈیپارٹمنٹ کی مدد کے لیے سندھ کے ہر بند اور بیراج پر عارضی فلڈ اسٹیشن قائم کرتا ہے۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ دریاؤں میں پانی کے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھی جائے جس سے سیلاب کے خطرات کم کرنے اور آبی ذخائر کی حفاظت میں مدد ملتی ہے۔ کھوکی بند پر ہمارا کام دریائے سندھ پر بالائی بیراجوں یعنی گدو اور تونسہ وغیرہ میں پانی کی آمد و اخراج کی ریڈنگ لے کر سکھر، کوٹری اور کراچی نوٹ کرانا تھا۔ یہ ریڈنگ ہم دن میں صرف دو بار لیا کرتے۔ یعنی صبح آٹھ بجے اور پھر شام کو چار بجے۔ رب نواز صبح سویرے بند پر آتا اور شام چار بجے کام سے فارغ ہو کر شہر واپس چلا جاتا۔

میں کچھ ہی دنوں میں اس علاقے کی تمام سرگرمیوں سے واقف ہو گیا۔ ان پانچوں نہروں کے درمیان صبح سویرے متحرک ہو جانے والی زندگی ہر شام ہی تھم جاتی۔ چاند راتوں کے علاوہ مغرب کے فوراً بعد ہر سو گہرا اندھیرا چھا جاتا۔ دن میں چھاؤں کی راحت دینے والے بڑے بڑے درخت سیاہ ہیولوں میں بدل جاتے۔ البتہ چاندنی راتوں میں دور دور تک زمینوں میں بکھری لہلہاتی فصلیں بڑا خوبصورت منظر پیش کرتیں۔ اگر آسمان بادلوں سے صاف ہو تو تارے غیر معمولی چمکتے دکھائی دیتے۔ میں نے کبھی کراچی میں اتنے تارے نہیں دیکھے تھے۔ ایسا لگتا کہ اس جنگل میں تاروں کی تعداد شہر سے زیادہ ہے۔

حر فورس کے بیشتر جوان بنگلے کی چھت پر چارپائیاں بچھا کر سو جاتے، کچھ ہال میں اور کچھ سامنے کھلی جگہ پر۔ جبکہ چار جوان شام چھے سے رات بارہ اور چار رات بارہ سے صبح چھے بجے تک اپنی رائفلیں لیے بند کے پل پر ڈیوٹی انجام دیتے۔ یہ سلسلہ دن میں بھی جاری رہتا۔ یہ بند کھوکی شہر کو دریائے سندھ والے کچے کے علاقے سے جوڑتا تھا۔

دن میں دو باوردی جوان بنگلے کے سامنے مٹی کے تندور پر تمام لوگوں کے لیے کھانا پکاتے۔ اس کے لیے ہر ایک اپنی تنخواہ سے ماہانہ نوے روپے ادا کرتا۔ ہفتے میں دو بار گوشت کا سالن پکتا۔ صبح صرف چائے کی ایک پیالی ملتی۔ دوپہر کا کھانا گیارہ بجے کھایا جاتا جبکہ شام کا کھانا پانچ بجے۔ صوبیدار آچر کے کہنے پر میں بھی نوے روپے کے اس میس میں شامل ہو گیا۔ یوں کھانا پکانے کے جھنجھٹ سے بچ نکلا۔

پانچوں نہروں کے کناروں پر شیشم، نیم، برگد اور جامن کے درخت قطار در قطار دور تک چلے گئے تھے۔ کبھی کبھی مجھے تجسس ہوتا اور دل چاہتا کہ ان نہروں کے کنارے کنارے چلتا ان کے آخری سروں تک جا پہنچوں۔ لیکن میں کبھی چند فرلانگ سے آگے نہیں گیا۔

یہ جون کے گرم دن تھے۔ جامن کے درختوں پر بور آ کر جھڑ چکا تھا۔ ننھے ننھے پھل دکھائی دینے لگے تھے۔ مگر ابھی ان کے پکنے میں شاید دو تین ہفتے باقی تھے۔ ایک درخت تو بالکل ہمارے کمرے کے سامنے تیس فٹ کے فاصلے پر اپنی طویل شاخیں پھیلائے لاتعداد پھلوں سے لدا کھڑا تھا۔ اسی درخت کی شاخ پر میں

نے بلب لگایا تھا۔

خروں سے میری قرابت قائم ہو چکی تھی۔ ان میں سے کچھ میرے دوست بھی بن گئے جیسے مٹھل اور نور محمد۔ رات کو نماز کے بعد وہ درخت کی شاخ میں جھولتے بلب کی روشنی میں اکثر میرے ساتھ پلنگ پر آ بیٹھتے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام بلند آواز میں سناتے۔ نور محمد کی آواز بہت اچھی تھی۔

سائیں سدائیں کریں سندھ مٹھی سکار
دوست مٹھا دلدار عالم سب آباد کریں

(اے اللہ سائیں! آپ سندھ دھرتی کو سدا آباد کر دیں..... اے میرے پیارے دوست، میرے دلدار اللہ، سارے عالم کو بھی آباد کر دیں)

کس قدر خوبصورت کلام ہے! پہلے اپنی زمین اور پھر تمام دنیا کے لیے دعا۔ یہی وہ محبت کا درس تھا جو شاہ صاحب کے کلام کا خاصا ہے جس نے سندھ کی سرزمین کو محبتوں کا گلزار بنا دیا۔ رفتہ رفتہ کھل مل جانے پر میں بھی ان کے ساتھ گانے کی مشق میں شامل ہو گیا۔ میں اکثر مہدی حسن کی گائی غزلیں یا پھر احمد رشدی کے طربیہ نغمے سناتا۔ مٹھل بہت ہی اچھا انسان تھا۔ باوجود اس کے کہ ہر شخص کو اپنی زبان سے محبت ہوتی ہے، وہ بارہا میرے ساتھ بیٹھے ہوئے کہا کرتا: ''اوا، اردو بڑی میٹھی زبان ہے۔''

''مٹھل سندھی بھی بہت اچھی زبان ہے۔'' میں کہتا۔

''اوا! سچی بات یہ کہ اردو میں ورائٹی ہے۔ سندھی میں گانے والے بس ایک ہی طرح سے گاتے ہیں۔''

اس کی متوازن اور غیر متعصبانہ گفتگو کراچی میں سندھ کے حوالے سے سنے ہوئے تمام تعصب اور نفرتوں کے قصے غلط لگنے لگتے۔ میں سوچتا کہ سندھ کا عام سندھی تو اب بھی معصوم اور مہمان نواز ہے۔ اس نے سندھ میں آنے والے ہر مظلوم کو پناہ دی، گلے سے لگایا، پیار دیا اور ان کی دادرسی کی۔

لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ کچھ لوگوں نے ایک ماہ گزرنے کے باوجود نہ بھی مجھ سے علیک سلیک کیا تھا اور نہ میرے سلام کا بہتر جواب دیا۔ مجھے

لوگ کیا کہیں گے؟

فوتیدگی کی غیر ضروری اور فضول رسموں سے لوگ تنگ ہیں۔ یہ رسمیں امرا تو اس لیے اپناتے ہیں کہ وہ کر بھی سکتے ہیں لیکن غریب لوگ بھی نبھانا اپنا فرض سمجھتے اور یہی سوچتے ہیں کہ سب کر رہے ہیں اور اگر ہم نے نہ کیں تو ''لوگ کیا کہیں گے؟''

فوتیدگی والے گھر میں جہاں صدمے کی وجہ سے چولھا تک نہیں جلایا جاتا تھا اور تین دن سوگ رہتا تھا، اب یہ حال ہے کہ وہاں اس دن دیگیں پکائی جا رہی ہیں۔ قل خوانی کے نام پر اس گھر میں تازہ پھولوں کی بے قدری ہوتی ہے۔ سات پھل پورے کیے جاتے ہیں۔ ٹینٹ لگتے ہیں۔ دریاں بچھتی ہیں۔ مسجد میں اہتمام ہوتا ہے اور گھر پر بھی بندوبست کیا جاتا ہے۔ دور نزدیک سے ڈھیروں مہمان آتے اور پیٹ بھر کر پھل اور کھانا کھاتے ہیں۔

چالیسویں تک ہزاروں روپے کا پھل لوگ کھا جاتے ہیں لیکن عموماً یہ ہوتا ہے، مرنے والے کے لیے بیماری کے دنوں میں آدھا کلو سیب اس لیے نہ آ سکے کہ مہنگائی بہت ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ موت کا ایک دن معین ہے۔ لیکن مرنے والے کی رسوم ادا کرنے پر جتنا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اس سے بھی بہت کم اسے زندگی میں دے دیا جائے تو یقیناً اس کی حالت بہتر ہو جائے۔

(مرسلہ: احسن کمال یوسفزئی، اسلام آباد)

واضح طور پر محسوس ہوتا کہ وہ دانستہ مجھ سے دوری برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی جب میں شام کو باہر پلنگ پر لیٹا ہوتا تو دور سے مجھے ان کی نظریں چبھتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ خاص طور پر شمس جو اکثر چھوٹی نہر کے پل کی منڈیر پر بیٹھا اپنی گھنی داڑھی اور ان میں گم ہوتی مونچھوں میں کنگھی کرتے مجھے گھورتا رہتا۔ نجانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ان لوگوں کو میری یہاں موجودگی اچھی نہیں لگتی۔ میں ان لوگوں کے اس ناروا رویے کی وجوہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا تو مجھے اس کے تانے بانے پاکستان اور خصوصاً سندھ کی گزشتہ دس سالہ سیاست سے جڑے نظر آتے۔

اپریل ۱۹۷۹ء میں ہونے والی ایوان انصاف کی ناانصافی نے اہل سندھ کو بدگمان کر دیا۔ مگر وہ درد تو سانجھا تھا، اسے محض سندھ کا دکھ کس نے بنا دیا؟ یقیناً یہ سازش تھی جبر سے جنے والے امیر وقت کی جس نے اقتدار کے محلات طول دینے کے لیے گورے آقاؤں کا ''تقسیم کرو حکومت کرو'' والا پرانا آزمودہ نسخہ آزمایا۔ ہماری عاقبت نااندیشی نے اس کی افادیت کو نصف صدی بعد بھی کم نہیں ہونے دیا۔

یہ اسی سازش کا نتیجہ تھا کہ سندھ میں اردو اور سندھی بولنے والوں میں نفرتیں بڑھیں۔ ۱۹۸۰ء کے پورے عشرے میں دونوں قومیتوں کے درمیان خونریز فسادات دیکھنے میں آئے۔ بڑی تعداد میں اردو بولنے والوں نے سندھ کے دیہی علاقوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی کی۔ جبکہ کراچی اور دیگر شہروں میں آباد سندھی محفوظ مقامات پر منتقل ہونے لگے۔

کراچی میں لسانی بنیاد پر تفریق کی ابتدا غاصب اوّل کے دور میں ہوئی جب وہاں پشتونوں اور مہاجروں کا تصادم کرایا گیا۔ غاصب سوم کے دور میں یہ عمل تیز ہو کر سرطان کی طرح دوسری قومیتوں تک پھیل گیا۔ یہاں تک کہ آج کراچی میں زبانوں کی بنیاد پر قائم حد بندیوں کے اثرات دو ملکوں کے درمیان سرحدوں کی طرح محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ پاکستانی قوم کو کس طرح تقسیم کیا گیا، اس کی عملی صورت کراچی میں نمایاں ہے۔

لسانی سیاست میں ہم زبانوں کو عدم تحفظ کا شکار کرنا مجبوری ہے۔ خصوصاً کراچی میں علاقائی طور پر راہنمائی کے خواہش مند لوگوں نے حالات کی ستم ظریفی کو اپنے لیے موقع غنیمت جانا۔ وہ علاقائی مسائل کو اپنے منشوروں میں جگہ دے کر انتخابی نعروں میں بدلنے لگے۔ ان لوگوں کو اپنی پہچان بنانے کے لیے ایسے مسائل اور تنازعات کی ضرورت تھی اور جابر حکمرانوں کو متعصب اور نام نہاد قوم پرست لیڈروں کی۔

رب نواز کا تعلق پنجاب سے تھا مگر وہ گزشتہ تیس برسوں سے کوٹری میں مقیم تھا۔ بہترین سندھی بولتا اور تقریباً روزانہ ہی شہر سے ایک سندھی اخبار ساتھ لے آتا جسے میں بھی پڑھ لیا کرتا۔ ایک اخبار صوبیدار آتا اور ان کے جوانوں کے لیے بھی آتا۔ اس بنا پر یہ اخبار ہی سندھ اور کراچی کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ تھا۔ اخبار کا ارتکاز زیادہ تر اندرون سندھ کی سیاسی و سماجی خبروں پر تھا جبکہ کراچی میں جاری فسادات کو نمایاں طور پر پیش کیا جاتا۔ اکثر کراچی میں سندھی بولنے والوں پر حملوں کی خبریں شائع ہوتیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ دیگر زبانیں بولنے والوں سے متعلق خبروں کو زیادہ اہمیت نہ دی جاتی حالانکہ پنجابی، پشتو اور خود اردو بولنے والوں کے معاملات یقینی طور پر سندھی بولنے والوں ہی کی طرح سنگین تھے۔

مجھے شمس اور اس کے دیگر ساتھیوں کی اپنی جانب

چبھتی نگاہوں کی وجہ سمجھ میں آرہی تھی۔ وہ لوگ جب اخبار میں فسادات کی خبریں پڑھتے، تو میرے لیے ان کی نظروں میں نفرت مزید بڑھ جاتی اور اس کی واحد وجہ تھی میری زبان یعنی اردو۔ وہ زبان جسے میٹھے بچوں کی زبان کہا جاتا تھا، جو مختلف زبانیں بولنے والوں کو جوڑنے والی زبان کہلاتی تھی، جو صدیوں سے لوگوں کے درمیان رابطوں اور تبادلہ خیال کا ذریعہ بنی ہوئی تھی، کراچی سے پانچ سو کلومیٹر دور دیہات میں میرے لیے وجہ نفرت بن گئی۔

ان حالات میں کبھی کبھی میں انجانے خوف میں گرفتار ہو جاتا۔ ایک دو بار میں نے اس خوف کا ذکر رب نواز سے بھی کیا مگر وہ کہتا "یہ تمھارا وہم ہے۔ ہم سرکاری ملازم ہیں۔ یہ لوگ بھی سرکاری ڈیوٹی پر ہیں۔" میں اس بات پر خاموش ہو جاتا۔

ماہ جولائی اپنا نصف اول ختم کر چکا تھا۔ جامن کے درختوں پر ننھے ننھے پھل روزانہ بڑی تعداد میں پک رہے تھے۔ صبح کمرے کے سامنے پکی زمین پر جامنی پھل ہر طرف بکھرے پڑے ہوتے۔ میں اکثر نماز فجر کے فوراً بعد چیونٹیوں کے جاگنے سے پہلے صاف پھل اٹھا لیتا۔ پھر برتن کے صاف اور ٹھنڈے پانی سے دھو کر مزے سے کھاتا۔ سچی بات تھی، ایسے میٹھے جامن میں نے کراچی میں کبھی نہ کھائے تھے۔ نرم اتنے کہ منہ میں رکھتے ہی مکھن کی طرح گھل جاتے، ذائقہ بھی لاجواب اور سب سے بڑی بات بالکل مفت۔

باقر بھی گاؤں میں رہتا تھا۔ روزانہ نماز فجر کے وقت بند پر آتا، نماز پڑھتا اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ اس کا کام بند کے کئی دروازوں کی دیکھ بھال اور مقررہ شیڈول کے مطابق مختلف نہروں میں پانی کے بہاؤ کو کنٹرول کرنا تھا۔ دوپہر کو وہ اپنے گھر واپس چلا جاتا۔ پھر شام کو پانچ بجے دوبارہ بند پر آتا اور پھر نماز مغرب کے بعد لوٹ جاتا۔

باقر سندھ کے معصوم اور مہمان نواز روایتی کردار کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ جب سے میں یہاں آیا تھا، باوجود غربت کے تقریباً روزانہ وہ میرے لیے گھر سے کچھ نہ کچھ کھانے کو لے آتا۔ کبھی اپنی تھوڑی سی زرعی زمین پر اگنے والی تازہ سبزیاں، کبھی ساگ کے ساتھ باجرے یا چاول کے آٹے کی بنی روٹیاں۔ وہ ایک سیدھا سادہ بے ضرر انسان تھا۔

یہ جولائی کا ایک گرم دن تھا۔ رب نواز معمول کے مطابق ڈیوٹی پر پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں روزانہ کی طرح اخبار تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وائرلیس سیٹ کام نہیں کر رہا۔ عموماً وہ پہلے کچھ دیر اخبار پڑھتا تھا مگر وائرلیس سیٹ کی خرابی کا سن کر سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ کافی دیر کوشش کے باوجود جب وہ خرابی سمجھنے میں ناکام رہا تو ہیڈکوارٹر اطلاع دینے کا کہہ کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پھر سارا دن واپس نہ آیا۔

اگلی صبح میں فجر کے بعد معمول کی طرح زمین سے جامن اکٹھے کر رہا تھا کہ باقر نے دور سے مجھے آواز دی: "ادا! زمین سے مت اٹھا۔ میں تجھے درخت سے توڑ دیتا ہوں۔"

"نہیں باقر، یہ بالکل صاف ہیں۔ میں بس تھوڑے ہی کھاؤں گا۔" میں نے کہا۔

مگر وہ آیا اور جھٹ پٹ درخت پر چڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں تازہ تازہ ڈھیر جامن اپنے دامن میں بھر کے نیچے اتر آیا۔ برآمدے پر جا کر مٹی کے ایک کونڈے میں وہ جامن

دھونے اور مجھے لا کر دیے اور کہا "یہ کھاؤ ادا! نیچے تو ان کو مٹی لگ جاتی ہے اور تم ہمارے مہمان ہو۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، وہ ہنستا ہوا بندر کی طرف چلا گیا۔ میں نے ڈنڈا پلنگ پر رکھا اور آرام سے بیٹھ کر جامن کھانے لگا۔ یقیناً یہ باقر کا خلوص تھا کہ آج جامن روزانہ سے کہیں زیادہ مزیدار لگے۔ صبح کے نو بجے چکے تھے۔ نہروں کے درمیان زندگی متحرک ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ شخص جو دیر سے نہر کے پل پر کھڑا مجھے گھور رہا تھا، تیز تیز قدموں کے ساتھ میری جانب آ رہا ہے۔ وہ میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ پہلی بار تھا کہ وہ میرے اتنا نزدیک آیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور جامن کھانے کا پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں سخت غصہ تھا۔ اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے کہا "یہ جامن تم نے درخت سے کیوں توڑے؟"

"کیوں! کیا مطلب؟ ظاہر ہے کھانے کے لیے!" میں نے نرمی سے کہا۔

"تمھاری ہمت کیسے ہوئی یہ جامن توڑنے کی؟" وہ غصے سے چلایا۔

"ارے بھائی اس میں ہمت کی کیا بات ہے۔ کیا یہ درخت تمھارا ہے؟"

بس اتنا سننا تھا کہ اس نے جامن سے بھرے کونڈے پر ہاتھ مارا، سارے جامن زمین پر دور تک بکھر گئے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک ہاتھ سے میرا گریبان پکڑا اور منہ سے گالیاں بکتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے مجھے مارنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں ہرگز اس سے لڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اپنے دفاع میں غیر ارادی طور پر تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ وہ طاقتور تھا لیکن پولیس کی تربیت نے مجھے بھی مضبوط بنا دیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: "تم کڑ یہ جامن نہیں کھا سکتے۔ آئی جمبو سندھ جو آ۔" (یہ جامن سندھ کے ہیں)

قریب موجود لوگ بھاگتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ نہر کے دوسری جانب سے بھی بیوپاری، خریدار اور دکاندار بیچ بچاؤ کرانے دوڑ پڑے۔ لوگوں نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا۔ صوبیدار آچر بھی وہاں آ گئے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا ہوا، کیوں جھگڑ رہے تھے؟"

میں نے ان سے کہا، اسی سے پوچھ لیں۔ لوگوں نے شخص سے پوچھا، تو وہ یہی بات کہہ رہا تھا کہ اس نے درخت سے جامن توڑ کر کھائے ہیں۔ یہ جامن سندھ کے ہیں۔ یہ انھیں کیسے کھا سکتا ہے؟

لوگوں نے مجھے کمرے میں جانے کا کہا اور اسے لے کر نہر کے دوسری طرف چلے گئے۔ میں وائرلیس روم میں بیٹھا سارے واقعہ پر حیرت سے غور کرنے لگا۔ دور سے مجھے لوگوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں:

"اس نے شخص کا گریبان پکڑا، ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"شرم کرو، وہ غریب مارو ہے، مہمان ہے۔" یہ آواز مٹھل کی تھی۔

"یہ لوگ کراچی میں ہمارے بے گناہ اور غریب سندھی بھائیوں کو مار رہے ہیں۔ ان کا کیا قصور ہے؟ یہ سندھ ہمارا ہے۔ کراچی بھی ہمارا ہے۔ یہ ہمارا سندھ اور کراچی ہم سے چھین رہے ہیں۔ اور یہ بھی ان میں سے ہے۔"

"ارے شخص... وہ اگر ان میں سے ہوتا تو اپنے

گھر سے اتنی دور تھوڑی سی تنخواہ پر ملازمت کرنے یہاں نہ آتا۔" یہ دوسری ہمدرد آواز نور محمد کی تھی۔

"نور محمد اور متحمل، تم دونوں چپ کر جاؤ، تم بزدل اور غدار ہو۔ تم جیسے لوگوں کی وجہ سے سندھ ہمارے ہاتھ سے جا رہا ہے۔"

مجھے دیر تک بحث کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ لیکن شروع میں اٹھی چند آوازوں کے بعد پھر کوئی آواز میری حمایت اور حق میں سنائی نہ دی۔ میں بڑے غور سے متحمل اور نور محمد کی آوازیں سننے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ وہاں سے چلے گئے یا پھر خاموش ہو گئے۔ رفتہ رفتہ شور کم ہوتا چلا گیا۔ اور پھر ختم ہو گیا۔ میں دیر تک اپنے کمرے کے اندر بیٹھا رہا۔ کھانا پینے بھی باہر نہیں گیا۔ نہ ہی کوئی مجھے کھانا دینے میرے پاس آیا۔ مجھے امید تھی کہ متحمل ضرور میرے پاس آ کر مجھے حوصلہ دے گا مگر وہ نہیں آیا۔

میں اپنے ہیڈ کوارٹر کو سارے واقعہ کی اطلاع دینا چاہتا تھا مگر وائرلیس سیٹ ابھی تک خراب تھا۔ شام کے وقت صرف ایک بار میں پانی بھرنے باہر گیا تو مجھے دور سے سارے نگاہیں اپنے وجود میں اترتی محسوس ہوئیں۔ آج مجھے یہاں کوئی اپنا ہمدرد نظر نہیں آ رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ مجھے مجید اشتیاق کو مطلع کرنا چاہیے لیکن وہ صبح سویرے بند پر چکر لگا کر جا چکے تھے۔ اب انھیں اگلے دن ہی بند پر آنا تھا۔ گویا میں کل صبح تک کسی کو بھی اس واقعہ سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔

نمازِ مغرب کے بعد نہر کی دوسری طرف سے ایک بار پھر شور سنائی دینے لگا۔ صوبیدار آچر اور بہت سے دوسرے لوگ پھر اسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ ایک بار پھر شمس کی تیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ اب تک غصے میں تھا۔ اگرچہ میں زیادہ سندھی نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن جو کچھ میں سمجھ پایا، اس کے مطابق شمس اور کچھ لوگوں کے ارادے میرے لیے اچھے نہ تھے۔

گھوٹکی میں واقع نہر

ایک مبہم سی امید تھی کہ صوبیدار آچر تھوڑی دیر میں مجھے بلائیں گے۔ اگر وہ شمس کو سرزنش نہ بھی کریں، تو اتنا ضرور کریں گے کہ ہم دونوں کو گلے ملا کر بات رفع دفع کرا دیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ شور رات عشا کی نماز تک کم ہوتے ہوتے رک گیا۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ شمس کے ساتھ چند لوگ اب بھی جمع تھے جو سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کوشش کے باوجود مجھے ان کی باتیں سنائی نہیں دیں۔

میں بڑا مایوس ہوا۔ سوچنے لگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد ایک غلط بات کو محض تعصب کے سبب غلط نہ کہے؟ کسی بھی قومیت میں سارے لوگ کبھی خراب نہیں ہوتے بلکہ برے لوگوں کی تعداد ہمیشہ اچھوں سے کم ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چند برے

اپنی چرب زبانی سے اکثریت پر حاوی ہو کر پوری قومیت کے عکاس بن جائیں۔ مگر یہاں سب لوگ شمس کو غلط کہنے سے کیوں گریزاں تھے؟ محض وہ آوازیں تھیں جنھوں نے سچ کہا مگر وہ بھی نجانے کہاں گم ہو گئیں؟

جوں جوں رات گہری ہوئی میرا دل گھبرانے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر ان لوگوں نے مجھے رات میں کوئی نقصان پہنچایا، تو یہ بڑی آسانی سے اسے ڈاکوؤں کی کارروائی قرار دیں گے۔ میرے محکمے اور گھر والوں کو بھی اصل بات پتا نہیں چل سکے گی۔

میں بزدل نہ تھا مگر مجھے یہ دکھ ضرور ہوا کہ اگر ان لوگوں نے ایسا کیا، تو یہ مجھے ایسے جرم کی سزا دیں گے جو میں نے کیا ہی نہیں تھا۔ کم عمر ہونے اور معمولی سیاسی شعور رکھنے کے باوجود میں نے کراچی میں مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان نفرت اور لڑائی کو کبھی اچھا نہیں سمجھا۔ میرا خیال تھا کہ پاکستان پر یہاں بسنے والی تمام قومیتوں کا حق برابر ہے۔ بلکہ ان قومیتوں کے درمیان درحقیقت کوئی کلیدی اختلاف بھی نہیں۔ یہ تو سیاستدان اپنے مفاد کے لیے لوگوں کو زبان اور علاقوں کے نام پر لڑاتے ہیں۔

تمام تر حوصلہ جمع کرنے کے باوجود میں پریشان تھا۔ کئی بار خیال آیا کہ اندھیرے میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ بہرحال وہ ساری رات میں نے کانٹوں پر گزاری۔ ہر آہٹ پر دل دھڑکنے لگتا۔ میں بڑا مایوس تھا۔ اسی کیفیت میں نجانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی:

حی علی الصلوٰۃ حی علی الصلوٰۃ

آؤ نماز کی طرف

حی علی الفلاح حی علی الفلاح

آؤ فلاح کی طرف

اذان کی آواز نے مجھے ہر خوف سے بے نیاز کر دیا۔ کمرے سے باہر نکلا اور نہر کے پل سے گزر کر مسجد پہنچا۔ مسجد میں معمول کی طرح نماز کے بعد سب نے ایک دوسرے سے سندھ کے مخصوص انداز میں بغلگیر ہوتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ کسی کے چہرے پر کل کی بات کا کوئی تاثر نہ تھا۔ کسی نے مجھ سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔ میں نے بھی گریز کیا۔ مسجد سے باہر نکلا، تو پو پھٹ چکی تھی۔ سرچشمہ نور رونمائی سے پہلے ہی ہر سو رنگ بکھیر چکا تھا۔ دور دور تک پھیلے کھیتوں کا منظر بڑا دلکش تھا۔ نہروں کے پانی سے ٹکرا کر آتی صبح کی ٹھنڈی ہوا فرحت بھری تھی۔

میں آہستہ آہستہ چھوٹے پل سے گزر کر اپنے کمرے کے دروازے تک آیا۔ قریب پہنچ کر میری نظر پلنگ پر پڑی جس پر ایک نئی اجرک اور نزدیک ہی مٹی کا کونڈا صاف ستھرے کپڑے سے ڈھکا رکھا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا، کوئی میری جانب متوجہ نہ تھا۔

میں آہستگی سے پلنگ پر بیٹھ گیا اور کونڈے پر ڈھکے کپڑے کو ہٹایا...... پکے اور دھلے ہوئے کالے کالے جامنوں سے کونڈا اوپر تک بھرا تھا۔ میں نے حیرت سے ایک بار پھر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ بند پر موجود ہر شخص مسکرا کر میری جانب دیکھ رہا تھا۔ نہر کا پل پار کر کے شمس میری طرف آ رہا تھا مگر آہستہ آہستہ...... اور اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی!

◆◆◆

نیا سال مبارک

میری دعا ہے

نیا برس ہو تمھارے جیسا
نہ دل کسی کا دکھانے والا
محبتوں کے، رفاقتوں کے
چراغ ہر سو جلانے والا
جہاں میں کوئی نہیں ہے جن کا
انھیں گلے سے لگانے والا
اجاڑ آنکھوں کو زندگی کے
دوبارہ سپنے دکھانے والا
اداس لوگوں کے آنگنوں میں
خوشی کی بیلیں لگانے والا
فقط محبت، فقط محبت!
فقط محبت سکھانے والا

نیا سال مبارک ہو

اپنے ساتھ
یادوں کی برسات
اور دعاؤں کی سوغات
اور
آنسوؤں کے بیش بہا خزانے لٹاتی
تمھاری منتظر آنکھیں
ہمارے لیے خوشیوں کی کلیاں ڈھونڈ رہی ہیں
اور کہتی ہیں
اے دل کے مکین
نیا سال مبارک ہو

یہ سال بھی آخر بیت گیا

کوئی ہار گیا کوئی جیت گیا
یہ سال بھی آخر بیت گیا
کبھی سپنے سجے آنکھوں میں
کبھی بیت گئے پل باتوں میں
کچھ تلخ سے لمحات بھی تھے
کچھ بے رنگی، کچھ بے چینی
کچھ من میں کمی ویرانی
کچھ لمحے تھے یادگار بہت
کچھ لمحوں کو برباد کیا
پر اب کے برس اے دوست میرے!
مجھے رب سے دعا یہ مانگنے دو
کوئی پل نہ تیرا اداس گزرے
کوئی روگ نہ تجھے راس گزرے
تو پھولوں کی طرح کھلا کرے
کوئی شخص نہ تجھ سے گلا کرے
تو خوش رہے، آباد رہے
تو جو چاہے وہ مل جائے
تیری معاف وہ ہر اک خطا کرے
تجھے ایسے ہی رب عطا کرے

.....

نیا سال، نئی اُمید

ریشمی ڈوری کی طرح
ہاتھ سے پھسلتا ہوا
یہ سال بھی جا رہا ہے
گزرتے اس سال سے
حساب کچھ لینا ہے
زخم جو دیے ہیں اس نے
ان کا مرہم پوچھنا ہے
اور پوچھنا ہے کہ!
جو کھو دیا اسے پائیں کہاں
یادوں کو سنہری دفنائیں کہاں
آگہی اپنی سلائیں کہاں
یقیں کریں
روٹھی پچھلے سال بھلا کر
آنے والے سال سے
دوستی کریں

دیانت دار افسر اور منفرد نظم گو

مجید امجد جب نابینا ہوئے

دلچسپ اور نایاب معلومات سے بھرپور اُردو کے طرح دار شاعر کا اچھوتا خاکہ

بشیر اصغر چودھری

مجید امجد مرحوم سے میری طویل دوستی رہی۔ روزنامہ نوائے وقت میں ملازمت ملی، تو مجھے ساہیوال چھوڑ کر ملتان منتقل ہونا پڑا جہاں میں نے ۳۵ برس گزارے ہیں۔ اب تین برس سے واپس اپنے پرانے آشیانے (ساہیوال) میں مقیم ہوں۔

میاں مجید امجد جہاں معروف و باکمال شاعر تھے، وہیں وہ محکمہ خوراک کے ایک دیانت دار اور درویش صفت افسر بھی رہے۔ یہی نہیں وہ دوستوں کے دوست اور دشمنوں پر بھی مہربان انسان تھے۔ دفتر میں ان کے کئی ساتھی بعد میں کروڑ پتی بن گئے، لیکن انھوں نے کبھی سرکاری گندم کا بلا قیمت ایک دانہ تک اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دیا۔

میاں مجید امجد جھنگ کے ایک متوسط آرائیں برادری کے سپوت تھے۔ ان کے والد نے مجید امجد کی والدہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ ان کے دو سوتیلے بھائی بھی تھے۔ بعدازاں جھنگ کی ایک معلمہ سے آپ کی شادی ہوئی۔ آپ کی ایک بیٹی بھی تھی۔ مرحوم قریباً ساری عمر منٹگمری (اب ساہیوال) میں رہائش پذیر رہے۔ جبکہ ان کی بیگم اپنی بیٹی سمیت جھنگ ہی میں رہی۔

مجید امجد ہر عید کا دن ساہیوال میں گزارتے۔ عید کے دوسرے دن وہ اپنی بیگم اور اکلوتی بیٹی کے پاس جھنگ چلے جاتے۔ ایک یا دو دن رہ کر واپس ساہیوال آتے۔ بیگم اور بیٹی نے آپ کی زندگی میں ایک بار بھی ساہیوال آنا پسند نہ کیا۔ جب مجید امجد کا انتقال (۱۹۷۴ء) میں ہوا، تو ان کی میت بذریعہ ٹرک جھنگ بھیج دی گئی۔ وہ مقامی قبرستان میں دفن ہیں۔ ان کی تربت پر انہی کا ایک معروف شعر تحریر ہے۔

کئی غم بہاروں کے سوگ میں امجد
میری غم پہ ہنسیں چودہاں گلاب کے پھول

ساہیوال میں آپ کی جائداد فرید ٹاؤن میں ایک ذی طرز کے کوارٹر اور ایک پرانا رلیے بائیسکل پر مشتمل تھی۔ یہ سائیکل انھوں نے کئی برس پہلے اس وقت خریدی جب محکمہ خوراک کی وساطت سے ملازمین کو پرمٹ پر ایک سو روپے کے عوض ملتی تھی۔ یہ شروع سے لے کر آخر تک بغیر کیے میاں مجید امجد کے ہم رکاب رہی۔ آپ جب محکمہ خوراک کے انسپکٹر بن کر ساہیوال آئے، تو پاکستان عالم وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس دور میں محکمہ سول سپلائز کہلاتا۔ شہریوں کو چینی و آٹا یا گندم حاصل کرنے کے لیے وہیں سے راشن کارڈ بنوانے پڑتے۔ یہی محکمہ لوگوں کو راشن بھی فراہم کرتا۔

اس دور میں ساہیوال کی آبادی کم وبیش ایک لاکھ نفوس سے بھی کم تھی۔ زیادہ تر لوگ ہندو یا سکھ تھے۔ اس طرح اکثر دکانیں غیر مسلموں ہی کی تھیں۔ صرف چند دکانیں مسلمانوں کی ہوا کرتیں۔ مسلمان دکانداروں کو جب اس بات کا علم ہوا کہ محکمہ سول سپلائز میں ایک مسلمان بطور انسپکٹر آیا ہے، تو انھوں نے میاں مجید امجد کا شاندار استقبال کیا۔ ان کے اعزاز میں عصرانہ بھی دیا گیا۔

جب پاکستان بنا، غیر مسلم اپنے گھر اور دکانیں چھوڑ کر بھارت چلے گئے۔ تب ساہیوال کے پہلے ڈپٹی کمشنر، راجا حسن اختر نے مجید امجد کو بطور عارضی اسپیشل مجسٹریٹ غلہ منڈی کی متروکہ دکانیں مہاجر مسلمانوں میں الاٹ کرنے کے اختیارات تفویض کیے۔ مجید امجد نے دکانوں کی الاٹ منٹ کے دوران نہایت ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیے۔ وہ اسی دور میں نیک نام اور اعلیٰ افسر قرار پائے۔

محکمہ خوراک ساہیوال کے دفتر کا ایک چپراسی مجید امجد کے ساتھ ان کے گھر میں بلا کرایہ برسوں تک رہا۔ وہ اس چپراسی کے خورونوش کا خرچہ خود برداشت کرتے رہے۔ مجید امجد عموماً دوپہر کے وقت کینٹین ڈی روز آ جاتے۔ وہاں ایک روٹی یا ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے اور دو شامی کباب خرید کر تناول فرماتے۔ یوں وہ صرف تین روپے میں ظہرانہ کر لیا کرتے۔ شام کے وقت اسٹیڈیم ہوٹل میں اپنی مخصوص محفل سجایا کرتے۔ رات کا کھانا بھی وہیں کھاتے۔

آپ کی زندگی میں پریشانیوں اور تکالیف کا دور اس وقت شروع ہوا جب ملازمت سے ریٹائر ہونا پڑا۔ معمولی رقم پاس تھی۔ جھنگ میں آبائی جائداد پر چھوٹے سوتیلے بھائی قابض تھے۔ وہاں انھیں بہت کم لوگ جانتے پہچانتے تھے۔ انھوں نے اپنی وراثتی جائداد کے حصول کی خاطر جھنگ میں دعویٰ دائر کر رکھا تھا۔ پیروی کے لیے انھیں ہر تاریخ پیشی پر جھنگ جانا پڑتا۔ ادھر حصول پنشن کی خاطر ساہیوال کے دفاتر میں چکر لگانے پڑتے۔

اسی ہنگامی دور میں وہ سانس کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ پس انداز کی گئی رقم قریباً ختم ہونے والی تھی۔ وہ پھر چھوٹے موٹے ہوٹلوں سے کھانا کھانے لگے۔ ان کی صحت پہلے ہی کمزور تھی، ناقص غذا کھانے سے وہ دن بدن کمزور ہوتے چلے گئے۔ مجید امجد بلا کے خود دار تھے۔ کسی دوست کو اپنی پریشانیوں کا ذکر تک کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ آخر کار اس قدر نحیف ہو گئے کہ بائیسکل چلانا بھی ممکن نہ رہا۔ بیماری کے اس عالم میں بھی دعویٰ کی پیروی کے لیے جھنگ جانا پڑا۔ دریں اثنا آپ کی بیگم کی بینائی قریباً ختم ہو گئی۔ یہ مرحوم کے لیے ایک اور صدمہ تھا۔

بینائی چلے جانے کے حادثے سے وہ خود بھی دوچار ہو چکے تھے۔ وہ یوں کہ قیامِ پاکستان سے قبل جب وہ ساہیوال میں ملازمت کر رہے تھے، انھیں شدید بخار ہوا۔ اس دور میں بخار کا موثر علاج کونین مکسچر دوا ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے کونین مکسچر کی ایک شیشی بھر کر انھیں دی اور بتایا کہ یہ دوائی ۶ خوراکوں پر مشتمل تین دنوں کے لیے ہے۔ مجید امجد جب واپس گھر آئے، بخار شدت اختیار کر چکا تھا۔ آپ نے نیم بے ہوشی کے عالم میں کونین مکسچر کی بھری ہوئی شیشی منہ کو لگائی۔ کڑوی ہونے کے باوجود شیشی کو اسی وقت منہ سے علیحدہ کیا جب دوا ختم ہو گئی۔

کونین کی تاثیر نہایت گرم تھی۔ جب صبح بیدار ہوئے تو انھیں بخار تو نہ تھا لیکن آنکھوں کی ۸۰ فیصد بینائی جا چکی تھی۔ خوش قسمتی سے بروقت علاج کرانے پر بینائی کافی حد تک واپس آ گئی۔ لیکن آنکھوں سے موٹے شیشے والی عینک کا رشتہ ہمیشہ کے لیے جڑ گیا۔

پاکستان معرضِ وجود میں آیا، تو محکمہ سول سپلائز کا نام تبدیل کر کے محکمہ خوراک رکھا گیا۔ تب مجید امجد اسٹنٹ فوڈ کنٹرولر بن گئے۔ برسوں تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ محکمہ خوراک کے اعلیٰ حکام نے انھیں متعدد بار ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر کے عہدے کی پیش کش کی..... شرط یہ تھی کہ انھیں ساہیوال چھوڑنا ہو گا۔ مگر مجید امجد نے ساہیوال سے کسی دوسرے ضلعی صدر مقام جانا پسند نہ کیا۔ وہ کہا کرتے تھے ''ساہیوال جیسا شہر کوئی اور نہ ہوگا۔''

تب ساہیوال میں ہر طرف بڑے بڑے سرسبز درخت اور صاف ستھری اور کشادہ سڑکیں تھیں۔ وہاں کوئی کارخانہ تھا نہ ہی چمنیوں سے اٹھنے والا زہریلا دھواں۔ شور شرابہ اور نہ ہی ٹریفک کا غل غپاڑہ۔ دریا کی

مصروفیت

عظیم انگریز مصنف ایچ جی ویلز جب سخت بیمار ہوا اور زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس کے رشتے دار، دوست اور لواحقین کی خواہش تھی کہ اس کے منہ سے کچھ ایسے کلمات نکلیں جو بطور یادگار ہمیشہ یاد رکھے جائیں۔ جب ان لوگوں نے اس عظیم ادیب کو بار بار تنگ کیا، تو اس نے تلخ لہجہ میں جواب دیا: ''آپ دیکھ نہیں رہے کہ میں مرنے میں مصروف ہوں؟''

(مرسلہ: اصدق امین، واہ کینٹ)

طرح بہتی چوڑی نہر، لوئر باری دوآب بہتی جس کے دائیں جانب عدالتیں، دفاتر، کالونیاں اور کھیلوں کے میدان واقع ہیں۔ بائیں جانب غلہ منڈی، تجارتی ادارے اور بسوں و ویگنوں کے اڈے ہیں۔

ایک بار آپ کا تبادلہ اوکاڑہ کر دیا گیا تھا۔ وہ ساہیوال سے صبح اوکاڑہ جاتے اور شام کو واپسی ہوتی۔ ایک سال بعد محکمہ کے حکام نے مجید امجد کی حالت پر رحم کھاتے ان کا دوبارہ تبادلہ ساہیوال ہی کر دیا۔ مجید امجد کی میت ساہیوال میں سپردِ خاک ہونی چاہیے تھی۔ جھنگ میں تو انھیں کوئی جانتا تک نہ تھا۔

مجید امجد نے عمر کے آخری حصے میں اپنا وراثتی اثاثہ حاصل کرنے کے لیے مقدمہ دائر کیا تھا۔ شومئی قسمت، نہ آبائی جائداد ملی اور نہ ہی پنشن ان کا مقدر بن سکی۔ انھوں نے ساری زندگی ایک درویش، صابر، خوددار اور قناعت پسند انسان کے روپ میں گزار دی۔ ان جیسا اصول پسند انسان آج کے زمانے میں شاید ہی مل سکے۔

(مضمون نگار روزنامہ نوائے وقت، ملتان سے بطور سینئر اسٹاف رپورٹر اور سب ایڈیٹر منسلک رہ چکے ہیں) ◆◆◆

ہمکتی، دمکتی، چہکتی، مچلتی زندگی کا

آخری سانس

شقی القلب ظالموں نے ایک لمحے میں خوشی سے چہکتے سیکڑوں انسانوں کی معصوم خواہشوں کا خون کر ڈالا

بشریٰ رحمٰن

لانس نائیک عبدالرؤف اسٹاپ پر آیا، تو بس تیار کھڑی تھی۔ جیسے انتظار ہی اس کا تھا، وہ اپنی نشست پر بیٹھا تو بس چل پڑی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ چند گھنٹے پہلے اس کا بھائی ٹکٹ لینے آیا اور نشست بک کرا گیا۔ آج سارے کام خود بخود ہی ٹھیک ہو رہے تھے۔ دن بھی بڑا روشن تھا۔ اس کا اجالا عبدالرؤف کے سانولے چہرے پر بھی دکھائی دیا جس میں سے سرخی امنڈی آتی تھی۔

بس تھوڑی دور آگے گئی، تو پہلو

والی جیب میں پڑا فون چھڑکنے لگا۔ کون ہے؟ اس نے جیب سے فون نکال کے نمبر دیکھا۔ نمبر کیا دیکھا اس کے اردگرد گلستان کھل اٹھا...... زبیدہ کا نمبر تھا۔

وہ یوں جھجکتا شرماتا رہا جیسے بس کے سارے مسافر اسے گھور رہے ہوں۔ ہمت کر کے بٹن دبا دیا اور ہیلو کہا تو ادھر سے فون کھٹ سے بند ہو گیا۔

عبدالرؤف ہنسا اور سوچا، شرما گئی۔

ابھی پرسوں جمعۃ المبارک کو اس کا نکاح پھوپھی زاد زبیدہ سے ہوا تھا۔ شاید گھر میں کھچڑی کافی دنوں سے پک رہی تھی۔ مگر جب وہ عیدالاضحی پر ایک ہفتے کے لیے آیا، تو ماں نے اسے خوش خبری سنائی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"ارے روفی تو بولتا کیوں نہیں کھسے؟"

ماں نے پیار سے ڈانٹا تو بغیر سر اٹھائے بولا "کیا بولوں ماں؟"

"خوش ہے کہ نہیں؟"

وہ ہنسا، بولا "ماں تجھے تو پتا ہے، میری خوشی تیری خوشی میں ہے۔"

ماں نے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا "جیوندا رہ...... اللہ تینوں بخت لاوے (جیتا رہ، اللہ تجھے بخت لگائے)"

وہ کہنا چاہتا تھا، ماں اتنی جلدی کیا ہے، ابھی تو جوان بہن گھر بیٹھی ہے۔ لیکن لفظ اس کے گلے میں پھنس گئے۔ زبیدہ کا سراپا اس کی نگاہوں میں بسا گیا۔ ہمیشہ جب وہ چھٹیوں میں گھر آتا، وہ خوشی خوشی اسے ملنے آتی۔ اس بار بس دور کھڑی اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔

"میں صدقے جاؤں، میرے پتر کے ہاتھ کیسے کالے ہو گئے...... انگلیاں ٹھٹھری ہوئی ہیں۔"

من کہ لکھاری

ملکہ سخن کے خطاب سے مشہور بشریٰ رحمن ۲۹ اگست ۱۹۴۴ء کو بہاول پور میں پیدا ہوئیں۔ ایم اے جرنلزم کرنے کے بعد کالم لکھنے شروع کیے مگر ادب کے میدان میں بھی اپنا سکہ جمایا۔ آپ کے افسانے معاشرتی مسائل بڑی خوبی سے اجاگر کرتے ہیں۔ زیر نظر افسانے میں اس انتہا پسندی کو نمایاں کیا گیا ہے جو وطن عزیز میں بدقسمتی سے اپنی جڑیں پھیلا چکی۔

"ماں! وہاں تو پورا سال برفباری ہوتی ہے جہاں میری ڈیوٹی لگی ہے۔"

"ہائے میرے پتر کو سردی نہیں لگتی؟"

"واہ ماں! فوجی کو نہ سردی لگتی ہے نہ گرمی...... نہ برف باری اس کا کچھ بگاڑتی ہے۔ وہ تو اس خیال ہی سے گرمایا رہتا ہے کہ اپنے وطن کا محافظ ہے۔"

"میں واری...... میں صدقے......" ماں اس کی بلائیں لینے لگی۔

"پتر! تو اب انکار نہ کرنا۔ میرے دل میں تیرا سہرا دیکھنے کا بڑا ارمان ہے۔"

عید سے اگلے دن گھر میں ڈھولک بجنے لگی۔ پہلی بار عبدالرؤف کو احساس ہوا کہ ڈھولک کی تھاپ بھی دل میں گدگدی کرتی ہے۔ آتے جاتے وہ لڑکیوں کے گائے سہاگ کے گیت سنتا تو ان کے مفہوم سے خود ہی شرمانے لگتا۔ رات گئے شوخ لڑکیاں چھت پر بیٹھی الاپ کرتیں:

ماہیے دی گلی جانا

وے سدا جیویں ماے دی گلی کھن آ......

میں تاں عطر ملیساں تیڈیاں تلیاں......

وے پھل نیر یندا آ......

وے سدا جیوں ماے دی گلی کھن آ......

(''تو جگ جگ جیے محبوب! میری ڈولی میرے ماموں کی گلی میں لے آنا۔ تو جب پھول بکھیرتا ہوا میرے چھپر کھٹ پر آئے گا، میں تیرے پاؤں کے تلوؤں پر عطر ملوں گی...... تو جگ جگ جیے محبوب!'')

اس کی جیب میں پڑا فون پھر پھڑپھڑانے لگا...... نمبر دیکھا، زیبو تھی۔ شاید دوبارہ اس نے حوصلہ کر لیا تھا۔

عبدالرؤف نے بھی جلدی سے بٹن دبا کر ہیلو کہا۔ ساتھ ہی بولا ''زیبو بات کیوں نہیں کرتی۔ زیادہ دور جانے سے سگنل نہیں آئیں گے۔''

ہنستی ہوئی زیبو کی آواز آئی ''ارے، تو مجھے مل کر کیوں نہیں گیا؟''

''کیسے ملنے آتا؟ ہر وقت تو دروازے میں پھوپھا پھوپھی بیٹھے رہتے ہیں۔''

''جب تو سب سے مل رہا تھا، میں کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ تو نے میری طرف دیکھا ہی نہیں......''

''بزرگوں کے سامنے کیسے نظر اٹھاتا، شرم آتی تھی۔''

''تو ساری زندگی شرم ہی کرتا رہے گا یا......''

یکا یک ایسا موڑ آیا کہ زیبو کی آواز کٹ گئی اور سگنل آنا بند ہو گئے۔

وہ بے جان فون کو دیکھ کر نجانے کتنی دیر تک مسکراتا رہا، ایسی کیف آور مسکراہٹ جو آنکھوں سے بھی چھلک رہی تھی......

اس نے خود زیبو کا نمبر ملانے کی کوشش کی۔ بیکار تھا، سگنل واقعی بند ہو گئے تھے۔ اس نے فون جیب میں ڈال لیا۔ آنکھیں بند کر کے سر بس کی کھڑکی کے ساتھ لگایا اور زیبو کی بات کا جواب سوچنے لگا۔ یا...... اس کے آگے ایک بڑا سوال تھا! یہ گاؤں کی لڑکیاں اتنی ہوشیار کیسے ہو جاتی ہیں؟ گھر بیٹھے بیٹھے باتیں بنانی سیکھتی یا پیدائشی ہی رومانی ہوتی ہیں؟

زیبو نے گاؤں کے اسکول سے میٹرک کیا تھا۔ ہاں رسالے پڑھنے کا اسے بہت شوق تھا۔ مگر اب لڑکیاں ٹیلی ویژن سے سب کچھ سیکھ لیتی ہیں۔

اگر فون بند نہ ہوتا، تو وہ بھلا اس کی بات کا کیا جواب دیتا؟ وہ مستی میں مسکرایا۔ سامنے کھڑی ہوتی تو وہ اس یا کا مطلب اچھی طرح سمجھاتا۔

سوچتے سوچتے وہ اس زمانے میں پہنچ گیا جب وہ اس کے لمبے لمبے بال کھینچ کر بھاگ جاتا تھا اور وہ شور مچاتی رہ جاتی۔ دونوں کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ بیچ میں ایک دروازہ تھا۔ سارا دن ادھر ادھر آنا جانا لگا رہتا۔ اس کے ابا کی تو وہ لاڈلی تھی۔ ذرا سی دیر میں کچھ اٹھائے آ جاتی: ''ماموں دیکھیں، میں نے آپ کے لیے گاجر کا حلوہ بنایا ہے......''

''دیکھیں ماموں یہ آلو والا پراٹھا ہے۔''

''ماموں چائے کے ساتھ پکوڑے کھائیں گے......''

کیسی ہوشیاری سے سارے گھر کو مسخر کر لیا اس نے!

ماے دی گلی کھن آوے سدا جیوں ماے دی گلی کھن آ...... یہ گیت اس نے فون میں ریکارڈ کر لیا تھا۔ اس نے ٹیپ آن کر دی۔ عبدالرؤف کے کانوں میں گیت گھولنے لگا۔ گیت کیا تھا ایک مدھر مست لوری تھی...... دھیرے دھیرے وہ نیند کی وادیوں میں اتر گیا جہاں نیم کے گھنے پیڑ پر جھولا تھا۔ جھولے میں ہلکورے کھاتی زیبو کے لمبے لمبے بال فرش کو چھو لیتے۔ کبھی وہ اسے جھولا جھلاتا اور کبھی

لمبے بال کھینچ کر بھاگ جاتا۔

بس کئی جگہوں پر رکی، چھابڑی فروشوں کی تیکھی تیکھی آوازیں آئیں، کون کب اترا، کب چڑھا اسے کچھ معلوم نہیں! وہ تو ایسی نشہ آور میٹھی نیند سویا کہ آنکھ اس وقت کھلی جب بس شہر کے اڈے پر رکی اور کنڈکٹر زور زور سے آوازیں لگانے لگا۔ وہاں بس نے خالی ہوجانا تھا۔ وہ اپنا سامان اٹھا کر نیچے اتر آیا۔ گو اس کی منزل بہت آگے تھی ان پہاڑوں اور برف زاروں پر...... مگر وہاں اسے ایک رات رکنا تھا۔ اس جگہ زبیدہ کا بڑا بھائی غلام قادر اے ایس آئی لگا ہوا تھا۔ پھوپھی نے بڑے چاؤ سے نکاح کی مٹھائی اور گاجر کا حلوہ بنا کر اسے دیا تھا کہ جاتے جاتے بھائی کو دیتے جانا۔ ان دنوں شہر کے حالات ٹھیک نہیں تھے، اس لیے غلام قادر کو نکاح میں شریک ہونے کی چھٹی نہیں ملی۔

عبدالرؤف نے اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس اٹھایا اور ساتھ وہ گٹھڑی بھی جو پھوپھی نے بڑے سلیقے سے غلام قادر کے لیے بنا کر دی تھی۔ وہاں سے اس نے رکشا پکڑا اور غلام قادر کے دفتر آ گیا۔ پولیس اسٹیشن شہر کے ایک گنجان علاقے میں تھا۔ وہ رکشے سے اترا، تو عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ سامان اٹھا وہ دفتر کے اندر چلا گیا۔

وہاں ایک محرر اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے بتایا کہ غلام قادر سامنے والی مسجد میں نماز پڑھنے گیا ہے اور اسے پابند کر گیا کہ جب اس کا بھائی آئے، تو بٹھا لے۔

''مسجد کہاں ہے؟'' عبدالرؤف نے پوچھا۔

''سامنے گلی میں۔'' محرر بولا۔

عبدالرؤف نے سوچا ''وہ بھی مسجد میں جا کر نماز ادا کر لے۔ وہیں بھائی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' سامان محرر کے حوالے کر اس سے مسجد کا محل وقوع پوچھ وہ باہر نکل آیا۔ سامنے ایک بڑا ہی مصروف بازار تھا۔ بازار کیا تھا زندگی سے معمور ایک میلا تھا۔ دکانیں کھلی ہوئی...... حیات انسانی کا سارا سازوسامان، کپڑے، زیور، ملبوسات، پارچہ جات، اور اشیائے خوردنی وہاں دستیاب تھیں۔ لوگ آ جا رہے تھے مگن و مست، کسی کو کچھ خریدنا تھا، کسی کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

اس وقت تھانے کے آگے ایک بس آ کر رکی۔ بس سے پہلے بینڈ والوں کا گروپ اترا۔ نظم میں آتے ہی وہ اپنی دھن بجانے لگا...... ویر میرا گھوڑی چڑھیا۔

یہ گیت عبدالرؤف نے اپنے گھر میں بھی سنا تھا۔ مگر بینڈ کی دھن پر سنا تو اسے اپنے سر پہ پھولوں کا سہرا لگا محسوس ہوا...... کیا جذبہ ہے اس گیت میں! دولھا بس سے اتر آیا اور اس کے ساتھ باراتی بھی...... عورتیں، بچے، بوڑھے رنگ برنگے ملبوسات میں ملبوس تھے۔ ایک سیانا آدمی ساری بارات کو ترتیب دینے لگا۔ عورتیں بچوں پر چلانے لگیں...... بچے دوڑ دوڑ کر کھلونوں کی دکانوں کی طرف جا رہے تھے۔

بینڈ زور زور سے دھن بجانے لگا:

اودے وچ گھڑی تیری بابل دی جائی

دے جا وے ویرا وے واگ پھڑائی......

یہ سن کر عبدالرؤف مسکرانے لگا۔ اس کی اکلوتی بہن، کاکو نے نکاح کے بعد کہا تھا: لالہ، تیری واگ پھڑائی پر میں تو مٹھے کا نکالوں گی۔''

تب اس نے ہنس کر سوچا تھا ''کاکو! میں تجھے سر سے پاؤں تک زیور سے لا دوں گا۔''

اتنے میں بھاگتی ہوئی دو لڑکیاں آئیں۔ عبدالرؤف کے قریب کھڑی ہو وہ رکشا روکنے لگیں...... اس وقت کوئی رکشا خالی نہیں جا رہا تھا۔ وہ گھبرا گھبرا کر ہر رکشے کو ہاتھ

دے رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے چکن کاری کی چادر اوڑھی ہوئی تھی اور زرد رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ سبز سوٹ والی لڑکی سے کہہ رہی تھی: ''امی کو معلوم ہو گیا کہ میں تیرے ساتھ بازار آئی ہوں۔ فون پر انھوں نے مجھے بہت ڈانٹا ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں، مغرب کے مائیوں کی رسم ادا کرنے سسرال والے آ جائیں گے اور تم ابھی گھر نہیں پہنچی۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''یہی کہ راستے میں ہوں۔ تم رکشا روکو نا، ایک تو یہ بس آ کے کھڑی ہو گئی ہے۔''

''یہ بھی بڑا اچھا شگون ہے۔'' اس کی سہیلی ہنس کر بولی۔

''یہاں تو خالی رکشا نظر نہیں آ رہا۔ آخر تمھیں میرے گھر کا بہانہ بنا کر نکلنے کی کیا سوجھی......''

''اس کم بخت درزی نے میرے گھاگھرے پر گھونگھریا نہیں لگائی تھیں۔ اگر آج اس کی دکان پر بیٹھ کر نہ لگواتی، تو اس نے مانتا ہی نہیں تھا۔''

''وہ دیکھو دور ایک رکشا خالی ہوا۔'' سبز سوٹ والی بولی ''میں دوڑ کر جاتی ہوں۔ تم یہیں کھڑی رہنا۔''

عبدالرؤف کو لڑکیوں دیکھنے اور ان کی باتیں سننے میں بھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ مگر آج وہ بار بار پیلے سوٹ والی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سیندوری رنگ شدت جذبات سے لال ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے میں اسے زیبو کا چہرہ صاف نظر آتا تھا۔

''زیبو تو نے میری سوچ ہی بدل دی۔'' اس نے سوچا۔

بارات ترتیب پا کے گلی کی طرف مڑنے والی تھی۔ اس نے بھی سڑک پار کرنے کے لیے قدم بڑھائے۔ اسی وقت ایک وحشت ناک اور خوفناک دھماکا ہوا جس نے ساری زمین ہلا دی۔ زمین پر پڑی ہوئی ہر شے تہ و بالا ہو گئی۔ زمان اور مکان دھوئیں کے ایک بہت بڑے گرداب میں گھوم گئے۔ دھواں جو سیاہ رنگ میں اٹھ رہا تھا، سفید ہو کر پھیلتا چلا گیا۔ دھوئیں کے جلو میں شعلے تھے اور شعلوں سے زیادہ چیخیں، واویلا، کراہیں، کراہٹیں اور فریادیں بلند ہو رہی تھیں......

یہ قیامت تھی یا اس کا عکس!

تھوڑی دیر کے لیے بازار کا سارا منظر غائب ہو گیا۔ اس جگہ منہدم عمارتیں تھیں اور آسمان کی جانب تیزی سے بڑھتا ہوا دھواں جو بڑی تیزی سے انسانی شقاوت کا اشتہار بنتا جا رہا تھا۔

خاصی دیر بعد امدادی ٹیمیں آ گئیں۔ پولیس آئی۔ کیمرے اور فائر بریگیڈ والے آ گئے۔ دھوئیں پر پانی کے فوارے چھوڑے گئے......

بس کا نام و نشان نہیں تھا۔ دکان کے ایک چھجے پر دولہا کا سہرا اٹکا تھا......

دور ادھ جلا چکن کاری کا دوپٹہ کھمبے سے چمٹا ہوا تھا۔ انسانی اعضا ٹوٹے ہوئے کھلونوں کی طرح بکھرے تھے... جن ٹکڑوں میں تھوڑی جان تھی، وہ ابھی تھرک رہے تھے۔ جن آنکھوں میں کوئی انتظار تھا، وہ کھلی رہ گئی تھیں... پتھر سے بھی کبھی بولتے ہیں؟ بولیوں کی بھی کوئی شناخت ہوتی ہے۔ ٹوٹے ہوئے کھلونے بھلا شکوہ کرتے ہیں؟ البتہ مٹھائی والی دکان کے آگے ایک موبائل فون صحیح سلامت پڑا تھا۔ اس سے آواز آ رہی تھی:

ماہے دی گل سن آ......

اے مدا ہیوں ماہے دی گل سن آ......

میں تاں عطر میساں تیڈیاں تریاں......

وے چھل نہ پیندا...... آ......؟

کبھی ٹک ٹک کبھی چوکے چھکے

مصباح الحق خان سے ملیے

پاکستانی کرکٹ تاریخ کے کامیاب ترین کپتان اور تیز ترین سنچری بنانے والے کھلاڑی کا سفر زیست

ابو صارم

۱۳ار نومبر ۲۰۱۴ء کو جب دبئی میں پاکستانی کرکٹ ٹیم نے نیوزی لینڈ کو شکست دی، تو یہ خصوصاً کپتان مصباح الحق کے لیے یادگار لمحہ بن گیا۔ یہ فتح انھیں پاکستان کے کامیاب ترین کپتان ہونے کا اعزاز دے گئی۔ یوں مصباح جو خاصے عرصے شدید تنقید کی چھری تلے کلبلا رہے تھے، شہرت و عزت کی نئی بلندیوں پر جا

پہنچے اور یوں انھیں اپنے صبر کا میٹھا پھل مل گیا۔

☆☆☆

مصباح الحق خان ۲۸ مئی ۱۹۷۴ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق نیازی قبیلے سے ہے۔ یہ حقیقت انھیں پاکستان کے چیدہ کرکٹ کھلاڑی عمران خان کا خونی رشتے سے عزیز بنا دیتی ہے۔ بچپن سے کرکٹ کھیلنے کا شوق تھا، لیکن والدین چاہتے تھے کہ مصباح پہلے تعلیم مکمل کریں۔ اسی لیے وہ خاصی دیر سے دنیائے کرکٹ میں داخل ہوئے۔

جب مصباح ساڑھے چوبیس سال کے تھے، تو انھوں نے اپنا پہلا فرسٹ کلاس میچ کھیلا۔ حالانکہ ۲۴ سال کی عمر میں بیشتر کرکٹ کھلاڑی اچھے خاصے تجربے کار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مشہور پاکستانی بے باز، مشتاق احمد نے پہلا ٹیسٹ میچ ساڑھے پندرہ سال کی عمر میں کھیلا تھا۔

مصباح نے ۱۰ فروری ۱۹۹۹ء کو قائداعظم ٹرافی میں پہلا فرسٹ کلاس میچ کھیلا۔ تب وہ سرگودھا کی ٹیم کا حصہ تھے۔ انھوں نے اچھی کارکردگی دکھائی چناں چہ ۲۰۰۱ء میں نیوزی لینڈ کا دورہ کرنے والی پاکستانی کرکٹ ٹیم میں انھیں شامل کر لیا گیا۔

انھوں نے ۳ مارچ کو کیویز کے خلاف پہلا ٹیسٹ کھیلا۔ پہلی اننگ میں ۲۸ اور دوسری میں ۱۰ رنز بنائے۔ ۲۷ اپریل ۲۰۰۲ء کو نیوزی لینڈ کے خلاف ہی پہلا ایک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلا۔ انھوں نے دونوں اصناف کرکٹ میں ملی جلی کارکردگی دکھائی مگر پُراسرار وجوہ کی بنا پر وہ قومی کرکٹ ٹیم سے دور رکھے گئے۔

پاکستان کے ممتاز سفارت کار اور چیئرمین کرکٹ بورڈ، شہریار خان نے اپنی تازہ کتاب ''کرکٹ کاؤلڈرون: دی ٹربولنٹ پالیٹکس آف اسپورٹ ان پاکستان'' (Cricket Cauldron: The Turbulent Politics of Sport in Pakistan) میں لکھا ہے کہ انضمام الحق نے مصباح کو قومی ٹیم سے دور رکھا۔ انھیں خطرہ تھا کہ زیادہ تعلیم یافتہ اور ذہین مصباح ان سے کپتانی چھین لیں گے۔

تاہم منکسر المزاج اور امن پسند مصباح اس استدلال سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے ''اس زمانے میں محمد یوسف، انضمام الحق اور یونس خان بہترین مڈل آرڈر بلے باز تھے۔ اس لیے میری جگہ نہیں بن سکی ورنہ اور کوئی وجہ نہیں تھی۔''

بہرحال مصباح نے اگست ۲۰۰۳ء میں آخری ٹیسٹ اور اکتوبر ۲۰۰۴ء میں آخری ایک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلا۔ وہ پھر تین سال کے لیے عالمی کرکٹ سے دور ہو گئے۔ کوئی اور کھلاڑی ہوتا، تو گھر چلا جاتا۔ ویسے بھی مصباح نے ایم بی اے کر رکھا تھا۔ انھیں کہیں نہ کہیں اچھی ملازمت مل ہی جاتی۔ مگر کرکٹ سے دلی الفت نے انھیں اپنے پسندیدہ کھیل سے دور نہ جانے دیا۔

آخر انضمام الحق کی رخصتی کے بعد پاکستان کرکٹ بورڈ کو وہ دوبارہ یاد آئے۔ مدعا یہ تھا کہ مصباح کی شمولیت سے مڈل آرڈر بیٹنگ کو مستحکم کیا جائے۔ مصباح الحق کو آتے ہی کرکٹ کی نئی قسم، ٹی ٹوئنٹی سے واسطہ پڑ گیا جب پاکستانی ٹیم ستمبر ۲۰۰۷ء میں اس کا پہلا عالمی ٹورنامنٹ کھیلنے جنوبی افریقا پہنچی۔

اس ٹورنامنٹ میں مصباح الحق نے شاندار بلے بازی دکھائی اور پہلی بار قومی افق پر نمایاں ہوئے۔ اچھے کھیل کی بدولت پاکستانی ٹیم فائنل میں جا پہنچی جہاں اس کا مقابلہ روایتی حریف بھارت سے ہوا۔

جب مصباح میدان میں آئے، تو ۷۷ رنز پر چھے وکٹیں گر چکی تھیں اور منزل ابھی دور تھی۔ مصباح نے بالروں کے ساتھ مل کر زبردست جنگ لڑی اور پاکستان کو فتح کے قریب لے گئے۔ بدقسمتی سے آخری اوور میں چھکا مارنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ آؤٹ ہو گئے۔ بہرحال مصباح کی عمدہ کارکردگی نے قومی ٹیم میں ان کے لیے جگہ پکی کر دی۔

لیکن انضمام الحق کے بعد طویل عرصہ پاکستانی ٹیم کو موزوں کپتان نہ مل سکا۔ یکے بعد دیگرے شعیب ملک، یونس خان، شاہد آفریدی اور سلمان بٹ کپتان بنائے گئے لیکن کوئی بھی زیادہ عرصہ نہ چل پایا۔ آخر مصباح الحق کے کندھوں پر کپتانی کی ذمے داری ڈال دی گئی۔ یہ اواخر ۲۰۱۱ء کی بات ہے۔

جب مصباح کپتان بنے، تو ٹیم انتشار کا شکار تھی۔ ''اسپاٹ فکسنگ اسکینڈل'' کے اثرات اب تک موجود تھے۔ یہی نہیں، پاکستان بھی سیاسی لحاظ سے دہشت گردی کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ ایسے ناگفتہ حالات میں مصباح نے بڑے عزم و ہمت کا ثبوت دیا اور بکھری ٹیم کو متحد و یکجا کرنے لگے۔

مصباح نے کئی میچ ذہانت کی چالیں چل کر جیتے اور اپنے بہترین کھیل کا بھی تسلسل جاری رکھا۔ اگرچہ انھیں تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ کبھی کہا گیا کہ وہ دفاعی کھیل کھیلتے ہیں۔ حتیٰ کہ انھیں ''ٹک ٹک'' کا خطاب بھی ملا، مگر مصباح نے تنقید کی پروا نہ کی۔ ان کی سعی رہی کہ اپنی بہترین صلاحیتیں دکھا کر پاکستان کو فتح دلوائی جائے۔

مثبت سوچ رکھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی عالمی مقابلوں میں شکستیں ہونے کے باوجود جیت بھی پاکستانی ٹیم کا مقدر بنتی رہی۔ گویا مصباح الحق نے کسی بار پر حوصلہ نہیں کھویا۔ انھوں نے نہ صرف اپنی ہمت جوان رکھی بلکہ ساتھی کھلاڑیوں کا بھی جوش و جذبہ بڑھاتے رہے۔ ایک عمدہ لیڈر کی یہی بہت بڑی نشانی ہے۔

مصباح الحق کا عزم مصمم رنگ لایا جب پاکستانی ٹیم نے نیوزی لینڈ کو پہلے ٹیسٹ میں شکست دی، تو انھیں پاکستان کے کامیاب ترین کپتان بننے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ وہ یوں کہ ان کی قیادت میں پاکستانی ٹیم نے ''۱۵'' فتوحات حاصل کر لیں جو تمام کپتانوں سے زیادہ ہیں۔ پاکستانی کرکٹ کی کپتانی سے متعلق اعداد و شمار ایک دلچسپ تصویر سامنے لائے ہیں۔

مصباح الحق جوانی میں

اب تک ۳۰ کھلاڑی ٹیسٹ کرکٹ پاکستانی ٹیم کی قیادت کر چکے۔ بہ لحاظ میچوں کی تعداد سرفہرست عمران خان ہیں۔ ان کی کپتانی میں ۴۸ ٹیسٹ کھیلے گئے۔ ۱۴ پاکستان نے جیتے، ۸ ہارے اور ۲۸ برابر رہے۔

اس کے بعد جاوید میاں داد کا نمبر ہے جو وقتاً فوقتاً کپتان بنتے رہے۔ ان کی قیادت میں پاکستان نے ۳۴ ٹیسٹ کھیلے۔ ۱۴ جیتے، ۶ ہارے اور ۱۴ برابر رہے۔ پھر مصباح الحق آتے ہیں۔ ان کی قیادت میں پاکستانی ٹیم نے ۳۳ ٹیسٹ کھیلے۔ ۱۵ جیتے، ۹ ہارے اور ۹ برابر رہے۔

دیگر اہم پاکستانی کرکٹ کپتانوں میں انضمام الحق

(۳۱ کھیلے، ۱۱ جیتے، ۱۱ ہارے اور ۹ برابر) وسیم اکرم (۲۵ کھیلے، ۱۲ جیتے، ۸ ہارے اور ۵ برابر)، عبدالحفیظ کاردار (۲۳ کھیلے، ۶ جیتے، ۶ ہارے اور ۱۱ برابر) اور مشتاق محمد (۱۹ کھیلے، ۸ جیتے، ۴ ہارے اور ۷ برابر) شامل ہیں۔

درج بالا اعداد سے عیاں ہے کہ مصباح الحق نے صرف ۳۲ میچوں میں کپتانی کے بعد ۱۵ ٹیسٹ جیت لیے۔ گویا ان کی شرح کامیابی دیگر کپتانوں سے بہتر ہے۔ لیکن جاوید میاں داد نے اپنے دور کپتانی میں صرف ۶ میچ ہارے۔ یوں جیت اور ہار کے شعبے میں ان کی شرح کامیابی سب سے بہتر ہے۔

۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۳ء وقفے وقفے سے عمران خان اور میاں داد نے کپتانی سنبھالے رکھی۔ تب پاکستانی کھلاڑی ہر مضبوط ٹیم سے ٹکرائے۔ خوب تجربہ حاصل کیا اور فتح کے علاوہ ہار کا مزہ بھی چکھا۔ اس دوران ۹۶ ٹیسٹ کھیلے گئے۔ ۱۴ میچوں میں کپتانی کے فرائض ظہیر عباس نے انجام دیے۔

مصباح الحق کا دور یوں مختلف ہے کہ وہ پچھلے چار برس سے بحیثیت کپتان چلے آ رہے ہیں۔ اب تک وہ ۳۳ ٹیسٹ میں کپتانی کر چکے۔ جبکہ میاں داد کا دور کپتانی ۱۴ برس تک پھیلا ہوا ہے۔ عمران خان نے دس برس تک کپتانی کے فرائض انجام دیے۔ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ عمران اور میاں داد، دونوں کی ٹیم میں ممتاز کھلاڑی شامل تھے۔ یہ امر دیکھتے ہوئے مصباح الحق ٹیم کی کارکردگی عمدہ نظر آتی ہے۔

زبردست کھیل کا مظاہرہ

آسٹریلیا کے ساتھ تیسرا ٹیسٹ ۳۰ اکتوبر تا ۲ نومبر ابوظہبی میں کھیلا گیا۔ اس میں مصباح الحق نے محیر العقول تیز رفتار بلے بازی کے مظاہرے سے اپنے ناقدین کے منہ بند کر ڈالے۔ چوتھے دن کھیلتے ہوئے انھوں نے ٹیسٹ کرکٹ کی تیز ترین ففٹی (۵۰ رنز) بنا ڈالی۔

مصباح نے صرف ۲۱ گیندوں پر ففٹی کی۔ اس سے قبل یہ اعزاز جنوبی افریقن کھلاڑی، جیک کیلس کے پاس تھا۔ اس نے ۲۰۰۴ء میں زمبابوے کے خلاف ۲۴ گیندوں پر ففٹی بنائی تھی۔ پاکستان ہی کے شاہد آفریدی ۲۰۰۴ء میں بھارت کے خلاف ۲۶ گیندوں پر پچاس رنز بنا چکے۔ مصباح کی ففٹی نے وقت کے حساب سے بھی نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ یہ صرف ۲۴ منٹ میں انجام پائی۔ پہلے یہ ریکارڈ بنگلہ دیشی کھلاڑی، اشرف فل کے پاس تھا۔ انھوں نے ۲۰۰۷ء میں بھارت کے خلاف ۲۷ منٹ میں ففٹی بنائی تھی۔

مصباح نے پھر اسی اننگ میں تیز ترین سنچری کا

بیوی بچوں کے ساتھ خوشگوار لمحات

ریکارڈ بھی برابر کر دیا۔ انھوں نے صرف ۵۶ گیندوں پر سنچری بنائی۔ اس سے قبل ۱۹۸۵ء میں مشہور ویسٹ انڈین بلے باز، ویوین رچرڈز نے اتنی ہی گیندوں پر برطانوی ٹیم کے خلاف سنچری بنائی تھی۔

وقت کے لحاظ سے یہ سنچری بنانے میں مصباح کو ۷۲ منٹ لگے۔ تاہم آسٹریلوی کھلاڑی، جے ایم گریگوری نے ۱۹۲۱ء جوہانسبرگ میں جنوبی افریقا کے خلاف ۷۰ منٹ میں سنچری بنائی تھی۔ گویا یہ ریکارڈ پچھلے ترانوے سال سے برقرار ہے۔

مصباح نے اپنی اننگ میں ۵ چھکے اور ۱۱ چوکے مارے۔ دراصل ضرورت اس امر کی تھی کہ تیز کھیل دکھایا جائے تاکہ جیت کی راہ ہموار ہو سکے۔ یوں مصباح نے ثابت کر دیا کہ وہ موقع محل دیکھ کر بلے بازی کرتے ہیں...... کبھی ٹک ٹک کرتے، تو کبھی خوب چوکے چھکے لگاتے ہیں۔ یاد رہے، ٹیسٹ کرکٹ کا اپنا مزاج ہے اور جو کھلاڑی اسے سمجھ جائے، بہترین و تجربے کار گردانا جاتا ہے۔

ویسٹ انڈیز کا لیجنڈری بلے باز، ویوین رچرڈز

مصباح الحق تادم تحریر ۵۲ ٹیسٹ کھیل کر ۳۶۸۶ رنز بنا چکے۔ انھوں نے ۸ سنچریاں اور ۲۶ نصف سنچریاں بنائی ہیں۔ ۱۵۱ ایک روزہ عالمی مقابلوں میں حصہ لیا اور ۴۶۰۹ رنز بنائے۔ ۳۹ ٹی ٹوئنٹی میچ کھیل کر ۷۸۸ رنز بنا چکے۔

پاکستانی کپتان کے دیگر اہم ریکارڈ یہ ہیں:

☆ کپتان کی حیثیت سے سب سے زیادہ رنز بنانے والے پاکستانی کھلاڑی۔

☆ ایک سال (۲۰۱۳ء) میں ایک روزہ بین الاقوامی مقابلوں میں سب سے زیادہ نصف سنچریاں بنائیں۔

☆ برصغیر پاک و ہند کے پہلے کپتان جنھوں نے جنوبی افریقن ٹیم کو اسی کی سرزمین پہ شکست دی۔

☆ ٹیسٹ کی دونوں اننگوں میں سنچریاں بنانے والے آٹھویں پاکستانی کھلاڑی۔

مصباح الحق شادی شدہ ہیں۔ ایک پیارے سے بیٹے اور ایک بیٹی کے والد ہیں۔ ٹھنڈا مزاج رکھتے ہیں۔ فطری طور پر منکسر المزاج ہیں اور بعض کھلاڑیوں کی طرح ''پھوں پھاں'' سے لگاؤ نہیں رکھتے۔ غصے کو پچھاڑ دینے والے پہلوان ہیں جسے اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ نے پسند فرمایا ہے۔ انھی خوبیوں کے باعث خدائے برتر نے انھیں عزت و شہرت بھی بخشی۔

مصباح ایک منفرد اعزاز بھی رکھتے ہیں...... وہ ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے والے سب سے بوڑھے کرکٹر ہیں۔ یہ سطور قلم بند ہونے تک ان کی عمر ۴۰ سال ۶ ماہ ہو چکی۔ مصباح کے بعد ویسٹ انڈین کھلاڑی، شیونارائن چندرپال کا نمبر ہے جو ۴۰ سال ۳ ماہ ۱۸ دن عمر رکھتا ہے۔

مصباح الحق نے مناسب غذا اور ورزش کے ذریعے خود کو چاق چوبند رکھا ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ابھی مزید چند سال کرکٹ کھیل سکتے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق برطانوی کھلاڑی، ولفریڈ روڈس ۵۲ سال ۱۶۵ دن کی عمر تک ٹیسٹ میچ کھیلا رہا تھا۔ گویا اس کے سامنے تو مصباح ابھی دورِ جوانی میں ہیں۔

سنہرا سبق

ایک ناخواندہ دادا نے اپنے تجربے کی روشنی سے دو بھٹکے ہوئے بچوں کو سیدھا راستہ دکھلا دیا

صالحہ محبوب

''ابا! میں نے اسکول نہیں جانا۔ مجھے سونے دو، سویرے سویرے اٹھا کر بھیج دیتے ہو۔ ماسٹر روز مارتا ہے کہ دیر سے آئے ہو، مار بھی کھاؤ اور بے عزتی الگ! پانچ جماعتیں پڑھ لیں، بس اب دماغ نہیں چلتا اس پڑھائی میں۔''

نیند میں ڈوبا کاکا اٹھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا، اسی لیے ابا کو بتا کروٹ بدل دوبارہ کھیس تان لیا۔ اچانک چارپائی ہلنے لگی اور کاکا اپنے کھیس اور تکیے سمیت زمین پر آن پڑا۔

''ابا! زلزلہ......'' وہ زور سے چیخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھیس ہنوز اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ مگر سامنے ابا کے بجائے دادا کو دیکھ کر ساری چیخیں دب گئیں۔ وہ غصے میں بھرا کھڑا تھا۔

''اوئے! اب تو بڑا ہو گیا ہے۔ اپنے باپ کو جواب دیتا ہے۔ اسکول نہیں جائے گا...... کیوں؟ مار پڑتی ہے، لے یہ گھر میں بھی تجھے مار ہی پڑے گی۔ بتا میری مار کھائے گا یا ماسٹر کی؟'' دادا نے اپنی جوتی اتار کر ہاتھ میں پکڑی تو کاکے کی جان ہی نکل گئی۔ پھر بھی ہمت کر کے بولا:

''دادا! تو بھی مار لے۔ صرف مار ہی کا درد ہو گا نا۔ اسکول میں ماسٹر مارے گا، تو درد ہو گا اور بے عزتی بھی! سارا دن لڑکے میرا مذاق اڑائیں گے۔'' وہ پھر زور سے رونے لگا۔

''تو سویرے اٹھتے تجھے موت آتی ہے۔ سویرے وقت پہ اسکول جا، تو جوتے نہ پڑیں۔'' دادا جوتا لہرا کر بولا۔

"دادا! دیر سے جانے پہ مار نہ پڑی، تو سبق یاد نہیں ہونے پر پڑ جائے گی..... اگر سبق یاد کر لیا، تو یونیفارم میلا ہونے پر پڑے گی۔ وہاں سے بھی بچ گیا، تو کوئی چپل اسکول پہن کر جانے پر پڑ جائے گی۔ دادا! یہ اسکول بنا ہی اس لیے ہے کہ وہاں بچوں کو ماریں اور بے عزتی کریں۔" کاکا اب مکمل جاگ چکا تھا۔

"بیرو صاحب! تو سبق یاد کیا کرتا کہ ماسٹر سے مار نہ پڑے۔ سبق تجھ سے یاد نہیں ہوتا اور گانے اور ناچ ایسے آتے ہیں جیسے ماں کی گود ہی سے تربیت لے کر آیا ہے۔ اتنا بڑا ہو کر ابھی تک پانچویں جماعت میں بیٹھا ہے۔ تیری دیکھا دیکھی یہ چھوٹا بھی اسکول نہیں جاتا۔ کچھ عقل کر، پڑھ لے۔ کیا کرے گا ساری عمر؟" دادا مار پیٹ کا ارادہ چھوڑ کاکے کو سمجھانے لگا۔

"دادا! ہماری تو نسلوں میں کوئی نہیں پڑھا، تو میں کیوں پڑھ جاؤں؟ ابا نہیں پڑھا، یقیناً تیرے ابا اور دادا بھی نہیں پڑھے ہوں گے۔ بھلا ہم جمعداروں کے گھروں میں کتابوں کا کیا کام؟ میں نے اسکول نہیں جانا، ہر سال فیل ہونے پر مجھے بڑا برا لگتا ہے۔" کاکے نے فیصلہ سنا دیا۔

دادے نے کاکے کو دیکھا۔ سیاہ کالی رنگت پر لمبے لمبے بال کچھ اس انداز سے بنائے گئے تھے کہ سر پر سیدھے نوکیلے کھڑے تھے۔ ایک کان میں سوراخ کر کے بالی پہنی ہوئی تھی۔ سرخ ٹی شرٹ جی بھر کر میلی تھی اور نیچے پہنا نیکر شاید کبھی پتلون رہا ہوگا۔ اب وہ گھٹنوں سے نیچے تھا اور خاصا بدوضع بھی..... نیکر کمر سے اس قدر نیچے تھی کہ دادا کو شدید کوفت ہونے لگی۔

"اچھا! تو تیری بے عزتی ہوتی ہے؟ کاکے یہ تیری عزت کب ہوتی تھی جو بے عزتی بھی ہونے گی؟" دادا غرایا۔ غصہ تو اسے ان کانٹے دار بالوں اور ٹنگی ہوئی بالی پہ تھا۔

"دادا! میری عقل موٹی ہے۔ استاد کچھ بتاتا ہے، مجھے کچھ اور سمجھ آتا ہے۔ کیا فائدہ وقت ضائع کرنے کا؟" کاکا اپنی چارپائی سیدھی کر کے اس پر دوبارہ سے بیٹھ چکا تھا اور ساتھ ہی دادا بھی!

"ہاں ہاں دماغ میں گانے بھرے ہوں۔ سارا دن مٹک مٹک کر ڈانس کرتے پاؤں ہوں، تو عقل تو موٹی ہو ہی جاتی ہے۔ او بے ہدایتا! دو لفظ پڑھ لے تو حساب کتاب آ جائے۔ بجلی کا بل بھی آ جائے تو ہم جا بل نکڑ والی دکان پہ جا کر پڑھواتے ہیں۔ اچھے سے اچھا موبائل رکھا ہے پر پتا ہی نہیں چلتا کہ فون کس کا آ رہا ہے۔ اور فون میں چھٹی کس کی آئی ہے۔ کاروبار کے لیے بھی تعلیم ضروری ہے۔" دادا اب کچھ نرم پڑ گیا تھا۔

"دادا! موبائل والی چھٹی کو مسیج کہتے ہیں۔" کاکے نے دادے کی غلطی پکڑی۔

"تعلیم ہی نے تجھے یہ بات بتائی ہے نا۔" دادا پھر بولا۔

"ارے دادا! پانچویں تک کی پڑھائی سے مجھے گنتی آ گئی ہے، سو سے بھی زیادہ ہزار تک...... جمع تفریق بھی کر لیتا ہوں۔ اب اس سے زیادہ کیا پڑھوں؟ میں نے کوئی مل کھولنی ہے! تیرے ساتھ چائے کے ہوٹل پہ بیٹھوں گا یا اماں اور تیرے ساتھ جھاڑو لگاؤں گا۔ ان دونوں کاموں میں کون سی سائنس لگتی ہے۔ بس جتنا علم چاہیے اتنا حاصل کر لیا۔ مجھے اسکول نہیں جانا۔" کاکا تن کر بولا۔

"اچھا پتر! یوں کر گرمیوں کی چھٹیوں تک تو اسکول جا، پھر میں تجھے کام پر لگاؤں گا۔ تین ماہ کی چھٹیوں میں تو دیکھ لینا کہ کون سا کام آسان ہے۔ جھاڑو، ہوٹل یا اسکول

اور اسکول کا کام۔'' دادا افہام و تفہیم سے بولا جس کی جہاں دیدہ نگاہیں کاکے کے چہرے پر بغاوت کے آثار دیکھ چکی تھیں۔

''اس معاہدے میں میرے ساتھ منا بھی شامل ہو گا۔ چوتھی تک تو یہ بھی پڑھ چکا...... یہ بھی اب کام کرنا چاہتا ہے، پڑھائی نہیں۔'' کاکے نے ایک سال چھوٹے بھائی کا مقدمہ بھی دادا کی عدالت میں پیش کر دیا۔

''اچھا منظور ہے...... اب دونوں بھائی اٹھو، تیار ہو کر اسکول جاؤ۔ اور ہاں یہ اپنے کرنٹ لگے بال سیدھے کرو۔ دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے بھوت کہیں جا رہے ہیں۔''

یوں دادا نے گرمیوں کی چھٹیوں تک دونوں بھائیوں کو اسکول جانے پر تیار کر لیا۔ صحن کے کونے میں بنے چولھے پر بیٹھی کاکے اور منے کی ماں دونوں کے لیے گرما گرم پراٹھے بنا رہی تھی۔ ساتھ میں چائے کی خوشبو بھی صحن میں پھیلی تھی۔ دونوں بچوں کو اسکول بھیجنا دادا اور ماں کی شدید ترین خواہش تھی۔

☆☆☆

یوسف مسیح کا غریب خاندان نسلوں سے شہر کی میونسپل کمیٹی میں ملازم تھا۔ خاندان کے مرد عورتیں سبھی سرکاری ملازم تھے۔ ان کی معاشی حالات بہتر ہو گئے تھے۔ مگر بچوں کا پڑھائی کی طرف بالکل رجحان نہ تھا۔ بھارتی فلموں اور گانوں کا شوقین تو پورا ہی محلہ تھا۔ تمام عورتیں کاموں سے فارغ ہو کر فلمیں دیکھتیں اور بچے گانوں پر ناچ کی مشق کرتے۔ سالانہ نتیجے والے دن محلے بھر کے بچے فیل ہو کر آتے اور ہر جماعت میں تین سال لگاتے۔

یوسف مسیح کے دونوں بیٹے بھی کمیٹی میں ملازم تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یوسف نے محلے میں چائے کا کھوکھا کھول لیا۔ سارا دن وہاں چائے بنتی اور ٹی وی چلتا۔ کاکا اور منا دونوں پوتے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتے اور اسکول سے بھاگنے کے نت نئے طریقے ڈھونڈتے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں دو ہفتے باقی تھے کہ دادا نے انھیں عملی میدان میں قدم رکھنے کی اجازت دے دی۔ یوسف کا تجربہ تھا کہ عملی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی کوئی واپس اسکول نہیں گیا۔ ہاں زندگی کے ہر موڑ پر تعلیم کی کمی پر افسوس ضرور کیا جاتا۔ کاکے نے رو دھو کر دو ہفتے گزارے اور آخر گرمیوں کی چھٹیاں بھی آن پہنچیں۔

''او کاکا......! او منا اٹھو سویر ہو گئی ہے۔'' منہ اندھیرے دادا نے آواز دی اور ذرا سی دیر ہونے پر پانی کا بھرا ہوا جگ ان دونوں کے منہ پر انڈیل دیا۔ دونوں گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''دادا! یہ اتنی سویرے کیا ہو گیا؟'' دونوں حیران تھے۔

''چل! سڑکوں پر جھاڑو کیا بارہ بجے لگاؤ گے؟ آج اپنی ماں کی جگہ تم دونوں جاؤ گے۔ چلو سائیکل نکالو۔ کاکا سائیکل چلائے گا۔ منا جھاڑو پکڑ کر آگے بیٹھے گا اور میں پیچھے۔''

یوں دادا دونوں کو ساتھ لیے کام پر روانہ ہوا۔ اس لمبی سی سڑک پر ساری دکانیں بند تھیں۔ سڑک کی صفائی کر کے مخصوص مقامات پر کوڑا اکٹھا کرنا تھا۔ کاکے کا باپ ٹرالی ڈرائیور تھا۔ چاچا ٹرالی میں کوڑا ڈالتا تھا۔ دادا دونوں کے سروں پر کھڑا ہو کر کام کرانے لگا۔ کسی غلطی یا سستی کی صورت میں انھیں جھڑکیاں بھی دیتا۔

''ہمارا دادا پچھلے جنم میں یقیناً کوا یا گدھ تھا۔'' کاکے نے منے کے کان میں کہا۔ بھارتی فلمیں دیکھ دیکھ کر کئی جنموں کا تصور بچوں کے ذہن میں خاصا پختہ ہو

دادا نے بیٹے کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر بیٹے کے دماغ پر دبئی جانے کا بھوت سوار تھا۔ ایک دن ہوٹل کے گلے سے پیسے اور اماں کا زیور چرا کر ابا غائب ہو گیا۔ دو دن تک گھر میں موت کا سا سناٹا چھایا رہا۔ ہوٹل بھی بند تھا اور کاکا اور منا کام بھی کام پہ نہ گئے۔ اماں کو جانے اپنے زیور کا زیادہ افسوس تھا یا ابا کے جانے کا! وہ کھانا پکانا بھی بھول گئی۔ تیسرے روز سے پھر وہی کام شروع ہو گیا۔ معلوم نہیں دادا پتھر دل تھا یا اماں سنگدل تھی۔ کاکا اور منا بھی دادا کے ساتھ تھے۔

دو ہفتوں بعد ابا واپس آن موجود ہوا۔ پھٹے پرانے کپڑے، ٹوٹی ہوئی چپل، بکھرے بال اور خالی جیب۔ آتے ہی دادا سے معافیاں مانگنے لگا۔ جذباتی فلمی سین کے بعد دادا کو کچھ یاد آیا۔ ''اوئے پتر تو کس کے ساتھ دبئی گیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ابا سب فراڈ تھا۔ ایجنٹ ہمیں کراچی لے گیا..... وہاں سمندر دکھا کر کہا کہ دوسری طرف دبئی ہے۔ ہمیں ایک لانچ میں بٹھا دیا اور کہا کہ یہ دبئی میں اتارے گی۔ ہم پڑھے لکھے تو تھے نہیں کہ کوئی پاسپورٹ، ویزا، ٹکٹ مانگتے۔ دو دن وہ لانچ ہمیں وہیں جزیروں میں گھماتی رہی اور پھر کراچی ہی کے کسی ویران ساحل پہ اتار دیا۔ ہم دبئی سمجھ کر چل پڑے۔ سامنے اپنے پاکستانی ہی ملے۔ تب سمجھ آیا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر ابا زور زور سے رونے لگا جس کا اماں نے بھی خوب ساتھ دیا۔ اس کی داستان بے حد دردناک تھی۔

''پتر! یاد نہیں میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' اب دادا آنسو پونچھتا ہوا بولا ''مجھے تو وہ دبئی کے چکر میں لاہور لے گئے تھے۔ وہاں چوبرجی کے پاس وہ نمائش والا جہاز کھڑا ہے جو اُڑتا نہیں، اس میں بٹھا گئے۔ میں اور میرا دوست سارا دن سامان لیے جہاز میں بیٹھے رہے کہ ابھی اُڑے گا، اُڑے گا۔

''اور پھر پولیس والوں نے ہمیں بتایا کہ تمھارے ساتھ تو دھوکا ہوا ہے۔ پتر! ہمارے نصیبوں میں جھاڑو ہے جھاڑو، یہ دبئی ہماری قسمت میں نہیں۔'' دادا اور ابا پھر ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئے اور کاکا اور منا بھی۔

آج انھیں نئی باتوں کا پتا چلا..... علم کے بغیر تو دنیا میں دھوکا، بے عزتی اور مار ہی مار ہے۔

☆☆

''اوئے اٹھو..... دونوں نکمے ابھی تک سو رہے ہیں۔'' حسب معمول دادا پانی کا جگ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

''دادا! ہم نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔'' کاکا آنکھیں ملتا اٹھا..... منا بھی کسمساتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا مطلب؟'' اوئے کھوتے دے پترو! کون سا فیصلہ.....؟'' دادا نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہم اسکول جائیں گے۔ پہلے پڑھیں گے پھر کام شروع کریں گے۔'' کاکا بولا۔

''کون سی فلم دیکھ لی ہے کل جو ایسی سیانوں والی بات کر رہے ہو؟'' دادا حیرت سے بولا۔

''وہی جو کل ہمارے اپنے گھر میں چل رہی تھی۔'' کاکا بولا۔

''دادا اور ابا والی!'' منا بھی مسکرایا اور بولا۔

دادا زور سے ہنس پڑا' ساتھ میں بہو اور بیٹا بھی! پانی کا جگ رکھ کر اس نے دونوں کو گلے سے لگا لیا اور کہنے لگا ''شاباش میرے پترو، شاباش! یہ ہوئی نا بات!'' دادا دل سے خوش تھا۔

تعلیم عزت اور اچھی زندگی کا شارٹ کٹ ہے، اس کے دونوں پوتوں نے ان چھٹیوں میں زندگی کا سب سے اہم سبق سیکھ لیا تھا۔

◆◆◆

انسانوں کے کام آسان بنانے والی

۲۰۱۴ء کی بہترین ایجادات

سستی بجلی سے لے کر ایبولا وائرس جیسے موذی سے نجات دلانے والے حیرت انگیز آلے تک

سید عاصم محمود

ہزاروں سال قبل یونانی فلسفی، افلاطون نے کہا تھا: ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔'' چناں چہ ضرورت کے باعث پچھلے ایک سو برس میں حضرت انسان ہزارہا ایجادات سامنے لا چکا اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے۔ ۲۰۱۴ء میں بھی نت نئی ایجادات سامنے آئیں جن کا تذکرہ پیش ہے۔

ٹرک میں رکھا ایٹمی ری ایکٹر

ماہرین کا کہنا ہے، اسی صدی میں رکازی ایندھن (تیل، گیس اور کوئلے) کے ذخائر ختم ہو جائیں گے۔

بنانے کی تجربہ گاہ چلا رہے ہیں جس میں درجہ حرارت ۱۰ کروڑ سینٹی گریڈ تک پہنچایا جا سکے۔ ایسا ری ایکٹر بنانے کی دوڑ میں مشہور امریکی اسلحہ ساز کمپنی، لاک ہیڈ مارٹن بھی شریک ہے۔

اس امریکی کمپنی میں ماہرین کی ایک ٹیم ایٹمی فیوژن والے چھوٹے ایٹمی ری ایکٹر تیار کر رہی ہے۔ اکتوبر ۲۰۱۴ء میں ماہرین نے اعلان کیا،انھوں نے ایسے تجرباتی ری ایکٹر کا ڈیزائن تیار کر لیا ہے جسے ٹرک کے پیچھے رکھا جا سکے گا۔ ماہرین نے اس کا نام ''ہائی بیٹا فیوژن ری ایکٹر'' رکھا ہے۔

یہ چھوٹا ہائی بیٹا فیوژن ری ایکٹر تکمیل کے بعد ''۱۰۰ میگاواٹ'' بجلی پیدا کرے گا۔ یہ بجلی ۸۰ ہزار افراد پر مشتمل قصبے کی ضرورت بخوبی پوری ہو سکے گی۔ لاک ہیڈ کے ماہرین کا دعویٰ ہے،اگلے پانچ برس میں تجرباتی ری ایکٹر تیار ہو جائے گا۔گویا ایٹمی فیوژن والے ری ایکٹر بننے سے تو بجلی بنانے کی خاطر وسیع و عریض بجلی گھر بنانے اور ہوائی چلیاں لگانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ نیز لوڈشیڈنگ کا توڑ نکل آئے گا۔

تار کے بغیر بجلی

بجلی کیا ہے؟ الیکٹرونوں (Electrons) کا بہاؤ جسے تار میں ڈال کر قابو کیا جاتا ہے۔لیکن آسمانی بجلی کی صورت وہ فضا میں پھیل جاتے ہیں۔لیکن اس بہاؤ کو کسی جگہ پہنچانے کا کیا دوسرا طریقہ بھی ہے؟ امریکی کمپنی، وائی ٹریسٹی (Witricity) اسی طریقے کی تحقیق میں ہے تاکہ روزمرہ کام کاج میں انسانوں کے لیے آسانی جنم لے سکے۔

ظاہر ہے،بجلی اگر تاروں کے بغیر گھریلو برقی اشیا تک پہنچنے لگے،تو پھر وہ بآسانی ایک سے دوسری جگہ پہنچ سکے گی۔ تاریں لگاتے اور بچھاتے ہوئے جن تکالیف سے گزرنا پڑتا ہے،ان سے چھٹکارا ملے گا۔

وائی ٹریسٹی کے سائنس داں بے تار بجلی حاصل کرنے کی خاطر مقناطیسی قوت (Magnetic Power) سے مدد لے رہے ہیں۔ مقناطیسی قوت بھی ایک قدرتی طاقت ہے جو مخصوص عناصر کو اپنی طرف کھینچتی یا پرے دھکیلتی ہے۔ یہ قوت ایک مخصوص علاقے میں مقناطیسی میدان یا دائرہ پیدا کر دیتی ہے۔ اسی دائرے میں الیکٹرون بھی سفر کر سکتے ہیں۔

درج بالا امریکی کمپنی کے ماہرین نے ایسا آلہ ایجاد کر لیا ہے جو ایک کمرے میں مقناطیسی میدان پیدا کر دے۔ اس میدان کی حدود میں جتنی بھی برقی اشیا ہوں گی، ان تک الیکٹرون مقناطیسی قوت کے سہارے پہنچ

جائیں گے…… یوں وہ تار کے بغیر چل پڑیں گی۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ برقی اشیا میں بھی ایسے آلے (Resonant Magnetic Coil) نصب ہوں جو مقناطیسی راہ سے آنے والی بجلی (الیکٹرون) پکڑ سکیں۔ اس ضمن میں برقی اشیا (الیکٹرونکس) تیار کرنے والی امریکی کمپنیاں اپنی مصنوعات میں یہ آلے نصب کرنے لگی ہیں۔

وائی ٹرائسٹی کا ایجاد کردہ آلہ فی الحال ۱۰ فٹ کے قطر میں مقناطیسی میدان پیدا کرتا ہے۔ حال ہی میں اس نے انٹل کمپنی سے معاہدہ کیا ہے۔ دونوں ۲۰۱۶ء تک مکمل طور پر بے تار لیپ ٹاپ تیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لیپ ٹاپ چارج بھی تار کے بغیر ہوگا۔ وائی ٹرائسٹی کے سربراہ، ایلکس گروزن کا دعویٰ ہے:

''اگلے دس برس میں ایسی برقی اشیا…… ٹی وی، ریفریجریٹر، بلب وغیرہ وجود میں آ جائیں گی جو مقناطیسی میدان کے ذریعے تار کے بغیر کام کریں گی۔''

سپر کیلا

یہ ۲۰۰۱ء کی بات ہے، آسٹریلوی حیاتی جینیات داں (Biogeneticist) جیمز ڈیل ایک تحقیقی
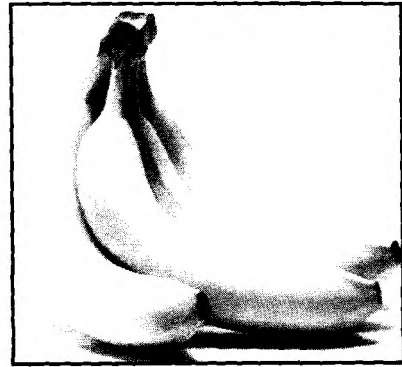
دورے پہ افریقہ پہنچا۔ وہ اس براعظم میں تین ماہ مقیم رہا۔ اسی دوران اسے معلوم ہوا کہ براعظم میں ہر سال چھے تا سات لاکھ بچے اندھے ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ انھیں غذا کے ذریعے مطلوبہ وٹامن اے نہیں مل پاتا جو آنکھوں کو صحت مند رکھتا ہے۔

جیمز ڈیل ایک ہمدرد اور رحم دل انسان ہیں۔ وہ سوچنے لگے کہ لاکھوں افریقی بچوں کو بینائی جیسی عظیم نعمت کھونے کے شدید نقصان سے کیونکر بچایا جائے؟ غوروفکر کے بعد ان کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔

آسٹریلوی محقق نے افریقہ میں دوران قیام دیکھا تھا کہ اکثر افریقی ممالک میں کیلا بہت کھایا جاتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں روٹی، امریکا میں آلو اور جنوب مشرقی ایشیائی ممالک میں چاول ذوق و شوق سے کھائے جاتے ہیں، اسی طرح کئی افریقی ملکوں میں کیلا من بھاتا کھاجا ہے۔

جیمز ڈیل کے ذہن میں یہ خیال آیا، کیوں نہ ایسا کیلا اگایا جائے جس میں قدرتی طور پر وٹامن اے موجود ہو۔ کیلے کے پودے میں جینیاتی تبدیلیاں لا کر ایسا ''سپر کیلا'' تخلیق کرنا ممکن تھا۔ لیکن تحقیق کی خاطر درکار لاکھوں ڈالر کہاں سے آتے؟

آخر جیمز ڈیل نے مشہور فلاحی تنظیم، بل اینڈ ملینڈا گیٹس فاؤنڈیشن سے رابطہ کیا اور متعلقہ افسروں کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا۔ وہ انھیں پسند آیا۔ چناں چہ جیمز کو مطلوبہ رقم مل گئی۔ وہ پھر اپنی تحقیق پہ جت گیا۔

اس کی شبانہ روز محنت رنگ لائی اور وہ پچھلے سال کے اواخر میں وٹامن اے سے بھرپور کیلا تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کوئی فرد روزانہ ایسے صرف دو تین کیلے کھا لے، تو اسے مطلوبہ وٹامن اے مل جاتا ہے۔ یوں جیمز ڈیل کی انسان دوستی اور رحم دلی کے

باعث اب لاکھوں معصوم افریقی بچے اندھے ہونے سے بچ سکیں گے۔

افریقا میں یہ پودے امداد باہمی کے نقطۂ نظر سے تقسیم ہوں گے۔ یعنی ہر گاؤں کے معززین اس شرط پر ۱۰ تا ۲۰ کیلے کی اس نئی قسم کے پودے پائیں گے کہ وہ بیس نئی کونپلیں دیگر دیہاتیوں میں تقسیم کریں گے۔

غربت سے بے پروا بھارتی حکمران طبقہ

۵ نومبر ۲۰۱۳ء کو بھارت نے سیارہ مریخ کے گرد گھومنے والا مصنوعی سیارہ، منگلائن بھجوایا تو بھارتیوں نے خوشی کے شادیانے بجائے اور اسے بہت بڑی کامیابی قرار دیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ مصنوعی سیارہ مریخ کے گرد چکر لگاتے ہوئے کیا کام انجام دے گا؟...... اس نے محض مریخ کی آب و ہوا کا مطالعہ کرنا ہے۔

امریکی اور روسی مصنوعی سیارے برسوں قبل مریخ کی آب و ہوا سے متعلق سارا ڈیٹا حاصل کر چکے جو عام دستیاب ہے۔ لہٰذا چالیس کروڑ غریبوں والے ملک نے ساڑھے سات کروڑ ڈالر (ساڑھے سات ارب روپے) کا سیارہ بنا کر کون سا تیر مارا؟ اس سے تو بہتر تھا کہ یہ بھاری بھرکم رقم نئے اسکول اور اسپتال بنانے پر خرچ کی جاتی۔

حقائق سے عیاں ہے کہ بھارتی حکمران طبقہ اپنے دیس میں آباد کروڑوں غریبوں کی حالت زار سدھارنا ہی نہیں چاہتا...... اسے بس یہ فکر دامن گیر ہے کہ اقوام عالم میں اس کا بول بالا ہو جائے اور بھارت کو ابھرتی سپر پاور کے طور پر دیکھا جائے۔ اسی لیے اربوں روپے خرچ کر بیکار مصنوعی سیارہ خلا میں بھجوایا گیا تاکہ بھارت مریخ پر سیٹلائٹ بھجوانے والا پہلا ملک بن سکے۔

یہ ممکن ہے کہ مصنوعی سیارے بھجوا کر بھارتی سائنس دانوں کو اتنا تجربہ ہو جائے کہ وہ مستقبل میں لیزر چھوڑنے والے سیٹلائٹ ایجاد کر سکیں۔ تب یہ پاکستان کے لیے تشویش ناک بات ہو گی۔ کیونکہ اس وقت ہمارے ایٹمی ہتھیار بے اثر ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے ہمارا طاقتور پڑوسی کھلے عام ہم سے جنگ کرتے ہوئے کتراتا ہے۔ بھارتی حکمران طبقے کو علم ہے کہ ایٹمی جنگ کی صورت میں کم از کم آدھا بھارت بھی تباہ ہو جائے گا۔

جو مرضی چھاپ لو

۲۰۱۴ء میں بھی تھری ڈی پرنٹنگ کی سائنس تیز رفتاری سے ترقی کرتی رہی۔ بتدریج تھری ڈی پرنٹر ایسی جادوئی مشین میں ڈھل رہا ہے جس سے ہر مردہ...... یا زندہ شے بنائی جا سکے۔ جی ہاں، پچھلے سال ڈاکٹر تھری ڈی پرنٹنگ کی مدد سے انسانی اعضا تیار کرنے میں کامیاب ہو چکے۔

تھری ڈی پرنٹر دیکھنے بھالنے میں عام پرنٹر جیسا ہے، لیکن اس سے پلاسٹک یا دیگر مادوں کی مدد سے ہزارہا اشیا تخلیق کرنا ممکن ہے۔ مثال کے طور پر امریکا میں اب بچے سائنسی تجربات میں استعمال ہونے والی اشیا پرنٹر سے بناتے ہیں۔ حتیٰ کہ کاریں، ہوائی جہاز اور ٹینک بنانے والی کمپنیاں بہتر سے بہتر پرزہ جات بنانے کی خاطر تھری ڈی پرنٹنگ سے مدد لے رہی ہیں۔ اب تو ایسے پرنٹر بھی تیاری کے مراحل میں ہیں جن میں مطلوبہ سامان ڈالو اور گرما گرم کھانا تیار!

سائنسی ترقی کی محیرالعقول رفتار جاری رہی تو وہ وقت آ سکتا ہے جب انسان اپنی جیسی دماغی و جسمانی صلاحیتیں رکھنے والی مشین تیار کر لے۔

گونگوں کو زبان مل گئی

ہر کوئی اشاروں کی زبان نہیں سمجھتا۔ اس لیے دنیا بھر میں ہزارہا گونگے بولنے والوں کو بڑی مشکل سے اپنی بات سمجھا پاتے ہیں۔ وہ بھی لکھ کر اور کبھی اشاروں میں اپنی بات کرتے ہیں۔ اب ایک امریکی کمپنی، موشن سیوی (Motionsavvy) ان کی مشکل آسان کرنا چاہتی ہے۔
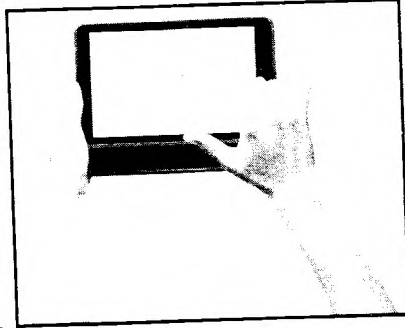
اکتوبر ۲۰۱۴ء میں کمپنی کے سائنس دانوں نے "موشن سیوی یونی" نامی ایک آلہ ایجاد کر لیا۔ یہ آلہ ایک ٹیبلٹ، حرکت نوٹ کرنے والے حساس (موشن سینسنگ) کیمروں اور صوتی آلات پر مشتمل ہے۔

جب کوئی گونگا اس آلے کے سامنے اشاروں میں گفتگو کرے، تو کیمرے اسے ٹیبلٹ تک پہنچاتے ہیں تو اس کا پروگرام بات سمجھ کر اسپیکر کے ذریعے انھیں بول دیتا ہے۔ ضرورت پڑے، تو اشاروں کی زبان تحریر بھی کرتا ہے۔ یہ آلہ قدرتاً گونگوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ اب وہ اس کی مدد سے مادری زبان یا انگریزی بولنے والے کو باآسانی اپنی بات سمجھا سکیں گے۔ اس آلے کی قیمت بھی مناسب یعنی صرف ۱۹۸ ڈالر ہے۔

ایبولا سے محفوظ رکھنے والا فلٹر

نئی نوع انسان پر ماضی و حال میں کئی خطرناک بیماریاں حملہ آور ہو چکیں۔ ان میں ایبولا وائرس کا مرض اپنی تیزی کے باعث خوفناک ومنفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ایبولا وائرس چند دن میں اپنے اتنے زیادہ بچے بالے پیدا کرتا ہے کہ وہ انسانی جسم میں تباہی مچا دیتے ہیں۔ انسان پھر دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔

ایبولا کا مؤثر مقابلہ کرنے کے لیے امریکی کمپنی، ایتھلون میڈیکل نے "ہیموپیوری فائر" (Hemopurifier) نامی آلہ ایجاد کر لیا۔ نلکی نما یہ آلہ ڈیلاسیز مشین سے جوڑا جاتا ہے۔ اس آلے میں لیکٹن (پروٹین) سے بنا فلٹر نصب ہے۔ وہ انسانی جسم میں گھومتے پھرتے ایبولا وائرس وہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یوں وائرسوں کی تعداد کم ہونے پر انسانی جسم تندرست ہونے لگتا ہے۔
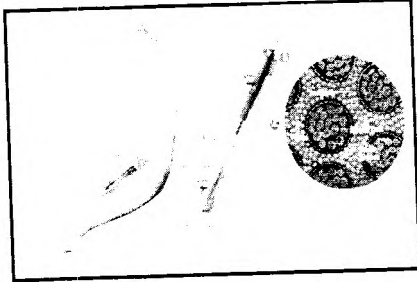
ہیموپیوری فائر اب امریکا میں ایبولا مرض کے خلاف کامیابی سے استعمال ہو رہا ہے۔ اس کی مدد سے دیگر امراض مثلاً ایڈز یا سرطان کے وائرس بھی انسانی جسم سے نکالے جا سکتے ہیں۔ گویا ایتھلون میڈیکل نے خطرناک بیماریوں سے مقابلے کی خاطر ایک مؤثر ہتھیار ایجاد کر لیا۔

باتونی دوستوں سے عاجز آئے کی دہائی

مجھے باتونیوں سے بچاؤ

سنانے کے مرض میں مبتلا مریضوں کی قہقہہ بار داستان جو دوسروں کا دماغ چاٹنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے

ابراہیم جلیس

میرے ملاقاتیوں کی تعداد معین نہیں، مگر ان میں سے چند ملاقاتی ایسے ہیں، جن کے بارے میں رہ رہ کر مجھے خیال آتا ہے کہ کاش ان سے میری ملاقات نہ ہوتی۔ یا کاش اب ان سے میری راہ و رسم منقطع ہو جائے۔ یہ ضرور ہے، پہلی بار جب میں کسی ملاقاتی سے ملوں، تو عادتاً کہہ دیتا ہوں "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

لیکن یہ جملہ بالکل رسمی ہے۔ معنی و مفہوم اور اہمیت پر غور کیے بغیر یہ خودبخود زبان سے نکل جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ مجھ سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بار بار ملاقات کی جائے کہ پہلی بار مجھے ان سے مل کر بڑی

خوشی ہوئی تھی۔ ویسے اب میں سچ سچ بتا دوں، اب تو ان ملاقاتوں سے مل کر مجھے بے حد کوفت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے، ذرا ڈھیٹ بن کر، ذرا بے مروت ہو کر صاف صاف کہہ دوں ''صاحبان! میں آپ سے ہرگز نہیں ملنا چاہتا۔ مجھے آپ سے مل کر نہ پہلی بار کوئی خوشی ہوئی تھی اور نہ اب ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتی ہے۔ میں بڑی عاجزی سے درخواست گزار ہوں کہ مجھے معاف کیجیے اور خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیجیے۔''

لیکن کیا اب میں ایسا کہہ سکتا ہوں؟ نہیں، شاید میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ میں لاکھ کوشش کروں تب بھی ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھ میں وہ اخلاقی جرأت نہیں جس کی ہر بڑے آدمی نے تلقین کی ہے اور جو ابتدائے آفرینش سے آج تک (پیغمبروں اور غیر معمولی آدمیوں کو چھوڑ کر) کسی انسان میں پیدا نہ ہو سکی۔ اس دنیائے آب و گل میں اخلاقی جرأت کو اتنی اہمیت حاصل نہیں جتنی اخلاقی بزدلی کو حاصل ہے۔ اخلاقی بزدلی کے لیے دل گردے کی ضرورت نہیں، البتہ اخلاقی جرأت رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ چونکہ میرے دل گردے بہت کمزور ہیں اور فطرتاً تن آسان بھی ہوں، اس لیے مجھ میں اخلاقی جرأت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ چناں چہ ہر زید، بکر، عمر سے پہلی ملاقات پر میں بے کھٹکے یعنی بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتا ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔

مگر از راہِ انصاف آپ فرمائیے، سید شاہ ضیاء الحسن سے مل کر کسی صحیح عقل و دماغ رکھنے والے انسان کو خوشی ہو سکتی ہے؟ مجھے اپنے دوست محمد ریاض پر بے حد غصہ آتا ہے جس نے سید شاہ ضیاء الحسن سے ایک مبارک یا منحوس دن میرا تعارف کرایا۔ یہ کوئی سخن سازی نہیں، بلکہ کھلی حقیقت ہے کہ جس دن بھی سید شاہ ضیاء الحسن سے کسی شخص کا تعارف ہو، وہ اس شخص کے لیے یقیناً ایک منحوس دن ہو گا۔ چناں چہ میری زندگی میں اب اس دن کے علاوہ روز منحوس گھڑیوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے کیونکہ سید ضیاء الحسن روز بروز مجھ سے ملتا ہے۔ میں جتنا اس سے دور بھاگوں، وہ اتنی ہی تیزی سے میری طرف دوڑتا ہے۔ مجھے پکڑ لیتا ہے اور مجھے شکست مان کر مجبوراً منہ کھول مسکرانا پڑتا ہے، اور پھر میں پوچھتا ہوں:

''اوہ! سید شاہ ضیاء الحسن صاحب۔ کہیے مزاج تو اچھے ہیں؟'' اب پھر کچھ نہ پوچھیے، سید شاہ ضیاء الحسن کی زبان چلنے لگتی ہے، تو گھنٹوں چلتی ہے۔ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ آپ بیٹھیے اور اپنے صبر و ضبط کا امتحان دیتے رہیے۔ نتیجتاً ناکامی آپ کو یا مجھے ہی ہو گی، سید شاہ ضیاء الحسن کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔

وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ چونکہ دو تین گھنٹوں تک بے تکان گفتگو کر سکتا ہے اور سننے والے چپ چاپ اس کی باتیں سنتے رہتے ہیں، تو یقیناً اس کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ جبھی تو لوگ اپنے زخم دیکھنے کے بجائے ہمہ تن گوش ہو کر بڑے انہماک سے اس کی باتیں سنتے ہیں۔ وہ کبھی یہ جاننے یا محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرے گا کہ آپ کس موڈ میں ہیں۔ وہ اس کی کبھی پروا نہیں کرے گا کہ آپ کو بخار اور دردِ سر ہے، یا آپ اپنی محبوبہ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ اسے تو بس یہ خوش فہمی ہے کہ وہ بڑا دلچسپ، باتونی یا مجلسی آدمی ہے۔ اس لیے باتیں شروع کر دیتا ہے، ہر قسم اور ہر موضوع کی سہل باتیں...... بغور دیکھنے پر بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ باتیں نہیں کر رہا بلکہ اپنے مخاطب کا دماغ چاٹ رہا ہے۔

میں مانتا ہوں انسان کے حلق میں زبان اسی لیے جڑی گئی ہے کہ وہ باتیں کرے۔ باتیں کرنا ہرگز کوئی غیر انسانی حرکت نہیں مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا برابر بھی باک نہیں کہ دماغ چاٹنا یقیناً غیر انسانی حرکت ہے۔

ضیاء الحسن جب بھی ملے، تو پہلے یہ ضرور کہہ دیتے ہیں، ”نہیں نہیں کوئی خاص بات نہیں، بس ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا تم سے دو ایک منٹ کے لیے باتیں کرتا چلوں۔“

اب سنیے موصوف کی دو ایک منٹ کی باتیں:

”ارے بھئی! کچھ سنا تم نے۔ ابھی ابھی ایک بڑا افسوس ناک واقعہ ہوا۔ وہ موہن لال ہے نا، چلتی موٹر سے گر پڑا۔ بچارے کو بڑی سخت چوٹ آئی۔“

میں پوچھتا ہوں ”کون موہن لال؟“

وہ حیرت سے کہتا ہے ”ارے موہن لال کو نہیں جانتے۔ ہاں ہاں موہن لال کو تم نہیں جانتے، تم اس سے کبھی ملے ہی نہیں۔ موہن لال بے چارا ایک بڑا پیارا دوست ہے۔ ڈپٹی دیانرائن کا بھانجا۔ بڑا دلچسپ ہنس مکھ...... بالکل ڈپٹی دیانرائن کی طرح خوش مذاق اور زندہ دل ہے۔ ڈپٹی دیا نرائن کی کیا تعریف کی جائے۔ ابھی ابھی پچھلی جولائی میں وہ سورگ باش ہوئے ہیں۔ بڑی حسرت ناک موت تھی۔ ہاں اس حسرت ناک موت پر خوب یاد آیا۔ وہ بے چارا قمرالدین بھی تو مر گیا۔ اس کی موت بھی بڑی دردناک تھی۔ قمرالدین کو بھی شاید تم نہیں جانتے۔ بے چارے کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ارے ہاں بھئی! تمھارے چھوٹے بچے کا مزاج اب کیسا ہے؟ کون سے ڈاکٹر کا علاج کرا رہے ہو۔ آج کل تو یہاں کوئی اچھا ڈاکٹر ہے ہی نہیں، سب نیم حکیم خطرہ جان ہیں۔ اب تو یار میرے علاج کرنے والے بھی ڈاکٹر ہیں اور کالج پڑھانے والے بھی ڈاکٹر۔

اس پر ایک بات یاد آ گئی۔ ڈاکٹر فاروق حسین جو معاشیات کے پروفیسر تھے، انھوں نے استعفا دے دیا ہے۔ بڑا خودار آدمی تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں دو ہی خوددار آدمی دیکھے ہیں: ایک ڈاکٹر فاروق حسین، دوسرا اپنا محمد قاسم طبلہ مرچنٹ۔ تم نے محمد قاسم طبلہ مرچنٹ کا وہ واقعہ تو ضرور سنا ہو گا۔ ایک بار انھوں نے ایک بڑے رئیس کا طبلہ درست کرنے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ رئیس نے دکان کے باہر ہی سے موٹر میں بیٹھے بیٹھے بڑی رعونت سے کہا ”اے میاں طبلے والے، ادھر آؤ۔ اسے درست کرنا ہے۔“

باتیں کرنا ہرگز کوئی غیر انسانی حرکت نہیں مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا برابر بھی باک نہیں کہ دماغ چاٹنا یقیناً غیر انسانی حرکت ہے۔

”محمد قاسم خودار آدمی تھا، اس نے ویسے ہی دکان میں بیٹھے بیٹھے کہا ”غرض پڑی ہے تو موٹر سے اتر کر یہاں آؤ۔ ورنہ اپنا راستہ ناپو۔“ یہ ہے خودداری! تجارت کرتا ہے، آزاد پیشہ آدمی ہے۔ وہ بھلا کسی رئیس کا ذلیل کیوں ہو۔ وہ تو اس وقت...... ارے بھائی جلیس اٹھ کھڑے ہو گئے۔ اماں یار بیٹھو...... کہاں جا رہے ہو۔ بیٹھو بھئی بیٹھو۔“

مگر میں نے کہا ”مجھے ساڑھے گیارہ بجے ایک صاحب سے ملنا ہے۔ معاف کرنا ضیاء الحسن میں محمد قاسم طبلچی کی داستان خودداری پوری طرح نہ سن سکا۔ مگر کیا کروں، مجبور ہوں، ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ان صاحب سے ملنا ضروری ہے۔ اب گیارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ اچھا پھر ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ۔“

اس کے بعد میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہوں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ ساڑھے گیارہ بجے مجھے کسی صاحب

سے ملتے ہے۔ مگر یہ بالکل سچ ہے کہ مجھے ذہنی موہن لال یا
ان کے خوش مذاق، زندہ دل ماموں، ڈپٹی دیوان
آنجہانی یا چھوٹے چھوٹے بچوں والے مرحوم قمرالدین یا
ڈاکٹر فاروق حسین سابق پروفیسر معاشیات اور خوددار
طبلہ مرچنٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔

موہن لال کو میں جانتا تک نہیں۔ کبھی اگر موٹر
سے گر پڑا تو میں کیا کروں؟ ڈپٹی دیوان بڑے خوش
مذاق اور زندہ دل آدمی تھے، تو وہ ہوں گے۔ قمرالدین کی
موت بڑی حسرت ناک تھی، تو کبھی اس کی موت میں
میرا کیا دخل؟ ... ڈاکٹر فاروق حسین نے استعفیٰ دے دیا،
تو میرا کیا بگڑا۔ محمد قاسم طبلے والے اگر خوددار ہیں تو ہوا
کریں، مجھے تو ان سے طبلہ درست نہیں کرانا۔

مجھے صرف ضیاء الحسن ہی سے شکایت نہیں بلکہ اس
کے سارے بھائیوں سے شکوہ ہے۔ میرا روئے سخن سگے یا
رشتے کے بھائیوں نہیں دماغ چاٹ لوگوں کی طرف
ہے۔ دماغ چاٹنا نہ صرف ایک پیشہ ہے بلکہ اس کا شمار
فنونِ لطیفہ میں بھی ہوتا ہے۔

سید شاہ ضیاء الحسن کے ایک ہم پیشہ بھائی ابوالفضل
کسی تحصیل کے پیش کار ہیں۔ اپنی کسی نہ کسی کارروائی
کے سلسلے میں ہر اٹھوارے پندرھوارے شہر آتے ہیں۔
جب بھی مجھ سے ملیں، تو پہلا سوال یہ کرتے ہیں: "میاں
تم کب آئے؟"

میں جواب دیتا ہوں۔ "جی میں تو یہیں ہوں۔
عرصے سے یہیں رہتا ہوں۔ پانچ سال سے تو چھوٹے
سے سفر پر بھی نہیں گیا۔"

وہ فرماتے ہیں "اوہ! وہ شاید آپ کے بھائی ہیں جو
بمبئی میں ہیں۔"

میں کہتا ہوں "جی میرے تو کوئی بھائی بمبئی میں
نہیں۔"

وہ مصر ہو جاتے ہیں: "ارے کوئی تھے نا میاں
تمہارے بمبئی میں؟"

اب میں ان سے کس طرح بحث کروں، اس لیے
جھوٹ موٹ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ "اچھا آپ عابد
حسین کا پوچھ رہے ہیں۔ جی، وہ تو بمبئی میں فلم ایکٹر
بن گئے۔" (حالانکہ عابد حسین تو یہیں ہیں اور ایک
دفتر میں ملازم)

وہ خوش ہو کر فرماتے ہیں "ہاں، میں نے کہا تھا نا۔
اچھا اب کیا کر رہے ہیں؟"

جی تو چاہتا ہے کہہ دوں، جھک مار رہا ہوں، مگر وہ
میرے بزرگوں کے ملنے والوں میں سے ہیں۔ اس لیے
جواب دیتا ہوں ... "جی ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔"

فرماتے ہیں: "اخبار کے ایڈیٹر ہو! خوب اچھا، آج
کل اخباروں میں کیا چھپ رہا ہے؟"

ایسے سوال کے بعد اپنا اور ان کا جی ایک کر دینے
کو جی چاہتا ہے۔ مگر انسان بندۂ مجبور ہے اور وہ نہ صرف
تحصیل کے پیش کار بلکہ میرے بزرگوں کے ملنے جلنے
والے ہیں۔

وہ جب بھی اپنی تحصیل سے شہر آتے ہیں، تو یہی
سوالات ہر مرتبہ دہراتے اور دو تین گھنٹے تک برابر دماغ
چاٹتے رہتے۔ مگر پرسوں میں نے انھیں چکمہ دیا۔ وہ شہر
آئے تھے۔ اتفاق سے عابد روڈ پر نظر آ گئے۔ میں سائیکل
پر جا رہا تھا، مجھے دیکھ کر پکارا:

"میاں! ارے ٹھہرو، ٹھہرو، بات تو سنو۔"

مگر میں نے بالکل انجان ہو کر پیڈل تیز کیے اور
نامپلی مارکٹ پر مڑ گیا۔ حالانکہ مجھے معظم جاہی مارکیٹ
جانا تھا۔

تصویر ہے۔ یہ ایک لڑکی ہے جس کا چہرہ عشق کی ناکامی کے تاثرات ظاہر کرنے کی میں نے انتہائی کوشش کی ہے۔ میری یہ تینوں کی تصویر دیکھو۔ اب کے سال بمبئی کی آرٹ ایگزیبیشن میں بھیجی جانے والی ہے۔"

خدا خدا کر کے رات کے دو بج گئے۔ اب موسیقی کا پروگرام شروع ہوگیا۔ پھر صبح کے پانچ بج گئے۔ اب بلبل ترنگ میں بھیرویں گانے لگے۔ یہ مجلس راگ و رنگ ابھی جاری تھی کہ قریب کسی ناپے سے مرغ بول پڑا۔ پھر ایک مسجد سے مؤذن کی اذان گونجی۔

فرمایا: "دیکھا تم نے، آرٹسٹ کو گردش شام وسحر کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ ارے تمھاری آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔ اب تم سو جاؤ۔ میں ذرا شفق کا نظارہ کروں۔"

میں سوچتا ہوں کہ کیا میں سو جاؤں؟ مگر شاید میں سو سکتا ہوں اور نہ سوچ سکتا ہوں، میرے سر میں جتنا کچھ مغز تھا، آرٹسٹ نے سارے کا سارا چاٹ لیا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اب مجھے یہ کرنا چاہیے کہ جب بھی دوبارہ آرٹسٹ صاحب سے ملنا پڑے، تو پہلے ہی اپنے بیوی بچوں کو نصیحت کر آؤں کہ شاید اب ملاقات نہ ہو سکے۔ یا پھر میں بھی آرٹسٹ بن جاؤں اور مجھے گردش شام وسحر کی خبر ہی نہ ہو۔ ظاہر بات ہے، جب سارا دماغ چاٹ لیا جائے تو گردش شام وسحر کی خبر ہی نہ ہوگی۔

ضیاء الحسن کے پانچویں بھائی چودھری رام کشن جی ہیں۔ بچپن میں میرے ساتھ پرائمری جماعت میں پڑھتے تھے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد اپنے بابا کی کپڑے کی دکان پر بیٹھ گئے۔ پھر زمانہ گزر گیا۔ میں نے بی اے پاس کرلیا۔ اس کا رام کشن جی کو بھی پتا چل گیا۔ وہ مجھے بڑا لائق آدمی سمجھنے لگے۔ اپنے کاروباری خطوط پڑھانے اور لکھانے کے علاوہ اپنے راج پھوڑے کے علاج سے لے کر لڑکی کی شادی تک ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو کا بار بار دہرایا جانے والا جملہ یہ ہے:

"بھئی تم علم و ادب کے خوب چرچے کرتے ہو۔ کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیا دیسی کپڑوں کے ساتھ ولائتی کپڑوں کی بھی تجارت کروں؟"

"کیا چھوٹے لڑکے کو گھر جا کے اسکول بھیج دوں؟ یا اپنے سرکاری مدرسہ ہی میں شریک کراؤں؟"

"کیا راج پھوڑے کا آپریشن کراؤں یا دوائیاں ہی کھاتا رہوں؟"

"کیا دیوان خانے کی دیوار اینٹوں سے چنواؤں یا لکڑی کی جالی ٹھکوا دوں؟"

"کیا حقہ چھوڑ کر سگریٹ شروع کر دوں یا صرف پان کھاؤں؟"

غرض رام کشن جی ہر روز مجھ سے میری قابلیت کا امتحان لینے اور کوئی نہ کوئی صلاح مشورے کرنے ضرور آتے ہیں۔ محض اس لیے کہ میں بقول ان کے علم و ادب کے خوب چرچے کر رہا ہوں اور میری کھوپڑی میں بہت بڑا دماغ ہے۔ اب میں رام کشن جی کو کس طرح سمجھاؤں کہ میری کھوپڑی میں جتنا کچھ مغز تھا وہ ضیاء الحسن، پیش کار تحصیل، پڑوسی بزرگ، آرٹسٹ اور...... خود آپ نے چاٹ ڈالا ہے۔ اب میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں کہ اپنے راج پھوڑے کا آپریشن کرانا چاہیے یا نہیں۔ اس لیے اب مجھے معاف کیجیے اور اجازت دیجیے۔ خدا حافظ!

تاریخِ پاکستان کا ایک سنسنی خیز باب

سوئس سپریم کورٹ نے بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کو مجرم ٹھہرا دیا

اس سلسلۂ کرپشن کی حیران کن روداد جو سابقہ حکمران جوڑے نے اپنے دورِ حکمرانی میں طمطراق سے اپنایا اور قومی خزانے کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اپنی تجوریاں ڈالروں سے بھرتا رہا

سوئس عدالتوں میں چلتے مقدمات کی حیرت افزا کہانی

رخسانہ افضل

کارل کراؤس (Karl Kraus) آسٹریا کے ممتاز ادیب و شاعر گزرے ہیں۔ ان کا چشم کشا قول ہے: ''پراسٹیٹیوشن (عصمت فروشی) سے بھی زیادہ خطرناک کرپشن ہے۔ کیونکہ پراسٹیٹیوشن چند افراد کا اخلاق خطرے میں ڈالتی ہے جبکہ کرپشن پوری قوم کا اخلاق تباہ کر دیتی ہے۔'' یہ بات سولہ آنے سچ ہے۔

اب پاکستانی قوم ہی کو دیکھیے۔ ۱۹۴۷ء میں زمینوں اور مکانوں کی الاٹمنٹ کے دوران رشوت دینے کے بطن سے جس کرپشن نے جنم لیا، وہ پاکستان میں چھوٹی چھوٹی چلی گئی حتیٰ کہ سرکاری دفاتر میں عام ہوئی۔

تاہم ایک بات قابل ذکر ہے۔ ہمارے اولین حکمران اور سرکاری افسر ممکن ہے، نااہل ہوں، مگر وہ روپے پیسے کے زیادہ رسیا نہیں تھے۔ زری کرپشن ۱۹۸۸ء سے شروع ہوئی جب وطن عزیز میں بے نظیر بھٹو کی پہلی ''عوامی'' اور ''جمہوری'' حکومت نے جنم لیا۔ اس سیاسی حکومت نے حکومتی نظام میں کرپشن کو بڑے منظم انداز میں رائج کر دیا۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں، اس کا ثبوت پچھلے دنوں سامنے آ چکا۔

اکتوبر ۲۰۱۴ء میں سوئٹزرلینڈ کے سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ ۱۹۹۷ء میں مقامی پولیس نے ایک سوئس بینک اکاؤنٹ سے زیورات کا جو سیٹ قبضے میں لیا تھا، وہ بے نظیر بھٹو، آصف علی زرداری اور ان کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ زیورات دراصل حکومت پاکستان کے ایک مقدمے سے منسلک ہیں جو اس نے ۱۹۹۷ء میں نصرت بھٹو، بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کے خلاف دائر کیا تھا۔ اس مقدمے کی عبرت انگیز داستان عیاں کرتی ہے کہ جب انسان کو اقتدار مل جائے، تو وہ اس سے کیونکر ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

☆☆☆

یہ ۱۹۹۰ء کے اوائل کی بات ہے۔ بے نظیر بھٹو حکومت نے کسٹم کی جگہوں پر درآمدی اشیا کی جانچ پڑتال اور نگرانی کے لیے ایک سوئس کمپنی، کوٹیکنا (Coteena) کی خدمات حاصل کیں۔ بعد ازاں انکشاف ہوا کہ سوئس کمپنی نے برسر اقتدار حکومت کو رشوت دے کر جانچ پڑتال کا معاہدہ منظور کرایا تھا۔

بھٹو حکومت نے اسے رشوت نہیں کمیشن کا نام دیا اور اسے وصول کرنے کی خاطر ''جدید'' طریقہ اپنایا گیا۔ یہ کہ اپنے وکیل، جینز شلیگلملک (Jens Schlegelmich) کی وساطت سے برٹش ورجن آئی لینڈ میں ایک جعلی کمپنی، بنام ماریسٹن سیکورٹیز (Mariston Securities Inc) کھولی گئی۔

قانون کے مطابق اس کمپنی کی مالک بیگم نصرت بھٹو تھیں۔ کمپنی کے نام سے ایک سوئس بینک (برکلے سوئس) میں اکاؤنٹ کھولا گیا۔ اس اکاؤنٹ کی رقم کو بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری بھی استعمال کر سکتے تھے۔

سوئٹزرلینڈ سے تعلق رکھنے والا وکیل جینز شلیگملک بھٹو خاندان کا پرانا واقف کار تھا۔ ۱۹۷۹ء میں مقتول ذوالفقار علی بھٹو کے بیٹوں نے پہلی بار اس سے رابطہ کیا۔ تب وہ اپنی ماں (بیگم نصرت بھٹو) کے لیے سوئٹزرلینڈ میں اقامتی اجازت نامہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بعد ازاں دسمبر ۱۹۸۷ء میں سوئس وکیل کی ملاقات آصف علی زرداری سے ہوئی جو بے نظیر بھٹو کے دولھا بن چکے تھے۔

کوٹیکنا نے ''معاہدے'' کے مطابق بارہ لاکھ ڈالر

پر مشتمل کمیشن بھٹو خاندان کی جعلی کمپنی کے سوئس اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا۔ جب صدر غلام اسحاق خان نے کرپشن کے الزامات پہ بےنظیر بھٹو حکومت برطرف کی، تو جلد ہی کوٹکینا سے معاہدہ بھی ختم کر دیا گیا۔ مرحومہ کے اسی پہلے دورِ حکومت میں آصف علی زرداری ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' کے عرف سے عوام و خواص میں مشہور ہوئے۔

لوٹ مار کا نیا معاہدہ

حکومت پاکستان پھر درآمدی اشیا کی جانچ پڑتال کے لیے کسی معیاری عالمی کمپنی کو تلاش کرنے لگی۔ اس سلسلے میں ٹینڈر بھی جاری کیے گئے۔ اس میں سوئٹزر لینڈ ہی کی ایک کمپنی، ایس جی ایس (Societe Generale de Surveillance) نے بھی بولی دی۔ یہ کمپنی بھی انسپکشن، ویری فیکیشن، ٹیسٹنگ اور سرٹی فیکیشن کی خدمات انجام دیتی ہے۔

ایس جی ایس سے گفت و شنید چل رہی تھی کہ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں بےنظیر بھٹو دوسری بار وزیراعظم بن گئیں۔ اب ایس جی ایس نے کنٹریکٹ لینے کی خاطر زرداری بھٹو خاندان کو ''کمیشن'' دینے کی ہامی بھر لی۔

اس زمانے میں بجورن ایکسل (Bjorn Axel) خطہ ایشیا میں ایس جی ایس کا منیجر تھا۔ اس نے افسران بالا کو یہ رپورٹ بھجوائی: ''اس وقت پاکستانی حکومت میں وزیراعظم کے شوہر جو غیر سرکاری طور پر نائب وزیراعظم ہیں، بہت اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں بےنظیر بھٹو کی ماں (بیگم نصرت بھٹو) کو پی پی پی کی چیئرمین شپ سے نکلوایا ہے۔ یہ امر ان کی طاقت عیاں کرتا ہے۔

پی پی پی حکومت میں آصف زرداری کا بہت اثر و رسوخ ہے۔ وہ ماضی میں ہمیشہ اپنے دوستوں اور کارندوں کی مدد کرتے رہے جن میں سے ایک کوٹکینا کا ایجنٹ تھا۔''

درآمدی اشیا کی جانچ پڑتال کا کنٹریکٹ حاصل کرنے کی دوڑ میں دونوں سوئس کمپنیاں شریک تھیں۔ جنوری ۱۹۹۴ء میں جنیوا میں صدرالدین آغا خان نے

کوٹکینا کمپنی کا ایک ملازم

آصف زرداری کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا۔ اس میں جینز سلیگ ملک بھی شریک تھا۔ اسی ملاقات میں یہ گفت و شنید ہوئی کہ درآمدی اشیا کی جانچ پڑتال کا معاہدہ کس سوئس کمپنی کو دیا جائے۔

نائب وزیراعظم پاکستان کی ہدایت پر ان کا دست راست، جینز کوٹکینا کے مالکوں سے ملا۔ انھوں نے اسے بتایا کہ پاکستان ایک بڑا ملک ہے، لہٰذا وہ تنہا

وہاں سارے کام کونہیں سنبھال سکتے۔ شاید تب تک بھٹو کا داغ دار ماضی مدنظر رکھ کر کوٹکینا اس سے نیا معاہدہ کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

اسی دوران ایس جی ایس کا ڈائریکٹر آپریشنز، ہانز فشر، زرداری۔بھٹو خاندان کے فرنٹ مین، جینز سلیگملک سے ملا۔ مارچ ۱۹۹۴ء میں دونوں کے مابین بہ سلسلہ ''کمیشن'' معاملات طے پا گئے

جون ۱۹۹۴ء میں یہ نئی پیش رفت ہوئی کہ ایس جی ایس نے کوٹکینا کمپنی کے بیشتر حصص خرید لیے۔ یوں وہ

جینوا میں ایس جی ایس کا صدر دفتر

اس کی نئی مالک بن گئی۔ اس کے بعد پاکستان میں درآمدی اشیا کی جانچ پڑتال ونگرانی کا کام دونوں کے مابین ففٹی ففٹی تقسیم کر دیا گیا۔

''نذرانوں'' کی رقم

بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت ختم ہونے تک دونوں سوئس کمپنیاں زرداری، بھٹو خاندان کو وقتاً فوقتاً لاکھوں ڈالر بطور ''کمیشن'' ادا کرتی رہیں۔ یہ گویا کنٹریکٹ فراہم کرنے کا نذرانہ تھا۔

سوئس کمپنیوں سے نذرانہ وصول کرنے کی خاطر پاکستان کی ملکہ عالیہ اور بادشاہ سلامت نے وہی پرانا حربہ استعمال کیا۔ یعنی اپنے سوئس وکیل، جینز صاحب کے توسط سے برٹش ورجن آئی لینڈ میں دو جعلی کمپنیاں کھول لیں۔

بومر فنانس کمپنی (Bomer Finance Inc) کے سربراہ آصف زرداری اور ان کی بیگم تھیں۔ جبکہ دوسری کمپنی، ناسام اوور سیز کمپنی (Nassam Overseas Inc) کا سربراہ صنم بھٹو کے خاوند، ناصر حسین کو بنایا گیا۔ ان دونوں کمپنیوں کے اکاؤنٹ مختلف سوئس بینکوں میں کھولے گئے۔ ایس جی ایس اور کوٹکینا انہی اکاؤنٹس میں کمیشن کی رقم جمع کراتی رہیں۔

حاصل کیے گئے ''نذرانے'' کی مجموعی رقم ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر بتائی جاتی ہے۔ حالیہ پاکستانی کرنسی کے مطابق یہ رقم سوا ارب روپے سے زیادہ بنتی ہے۔ معاصرین کا دعویٰ ہے، بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری نے دونوں ادوار حکومت میں کئی سرکاری منصوبے ''نذرانے'' لے کر پاکستانی اور غیر ملکی کمپنیوں کو دیے اور یوں خوب کمائی کی۔ اس ناجائز آمدن سے پاکستان و بیرون ممالک میں زرعی زمینیں، عالیشان فلیٹ وگھر، زیورات اور فارم وغیرہ خریدے گئے۔

نومبر ۱۹۹۶ء میں پی پی پی سے تعلق رکھنے والے صدر فاروق لغاری نے کرپشن کے الزامات پر بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت بھی ختم کر ڈالی۔ نئے عام انتخابات میں نواز شریف برسراقتدار آئے۔ اب پاکستانی حکومت نے ''احتساب بیورو'' تشکیل دیا، جو

ایسے کرپشن کیسوں کی کھوج لگانے لگا جو بے نظیر بھٹو حکومت کے دونوں ادوار میں سامنے آئے تھے۔

۸ر ستمبر ۱۹۹۷ء کو حکومت پاکستان کی درخواست پر سوئٹزرلینڈ نے تمام سوئس بینکوں میں بے نظیر بھٹو، آصف علی زرداری اور بیگم نصرت بھٹو کے اکاؤنٹس منجمد کر دیے۔ خیال ہے کہ ان میں چھے کروڑ ڈالر تک رقم موجود تھی۔ موجودہ حساب سے یہ رقم ''چھے ارب روپے'' بنتی ہے۔

سوئس مقدمے کا آغاز

بعدازاں احتساب بیورو نے اپنی تفتیش کی دستاویز ایک سوئس عدالت میں پیش کیں جسے ہمارے ہاں کی ہائی کورٹ سمجھیے۔ ان کی بنیاد پر جون ۱۹۹۸ء میں جینز سلیگیملک، ایس جی ایس کے سینئر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ اور کوٹکینا کے مینیجنگ ڈائریکٹر پر فرد جرم عائد کر دی گئی۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے حکومت پاکستان سے کنٹریکٹ حاصل کرنے کی خاطر حکمران ٹولے کو رشوت دی اور پھر اسے ادا کرنے کے لیے منی لانڈرنگ میں ملوث رہے۔ اگلے ہی مہینے اس کیس کے سلسلے میں آصف زرداری اور بے نظیر بھٹو پر بھی فرد جرم عائد کر دی گئی۔

اکتوبر ۱۹۹۸ء میں کوٹکینا اور ایس جی ایس کیس کے ضمن میں لاہور ہائی کورٹ میں مقدمہ چلنے لگا۔ اپریل ۱۹۹۹ء میں بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کمیشن لینے کے جرم میں مجرم قرار پائے۔ لاہور ہائی کورٹ نے انھیں پانچ سال قید کی سزا سنائی اور ۸۶لاکھ ڈالر جرمانہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ بے نظیر بھٹو لندن جا چکی تھیں، آصف زرداری قید کر لیے گئے۔

اکتوبر ۱۹۹۹ء میں جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اگلے ہی ماہ نئے پاکستانی حکمران نے ''قومی دفتر احتساب'' کی بنیاد رکھی جو ''نیب'' کے نام سے معروف ہوا۔ اب اس نئے ادارے سے منسلک وکلا اندرون و بیرون ممالک کی عدالتوں میں بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے خلاف دائر مقدمے لڑنے لگے۔ ایک سوئس عدالت میں کوٹکینا اور ایس جی ایس سے متعلق کیس چلنے لگا۔

سزا ملتی ہے

اگست ۲۰۰۳ء میں سوئس عدالت کے جج، ڈینئل ڈیوڈ (Daniel Devaud) نے دونوں مرکزی

پاکستانی جوڑے کو سزا سنانے والا سوئس جج، ڈینئل ڈیوڈ

ملزمان کو مجرم قرار دے ڈالا۔ اس نے بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کو چھے ماہ کی معلق سزا (Suspended Sentence) سنائی۔ نیز سابق حکمران جوڑے کو حکم دیا کہ انھوں نے سوئس کمپنیوں سے جو کمیشن لیا، وہ پاکستان کے خزانے یعنی جائز و قانونی مقام پر جمع کرایا جائے۔

بے نظیر بھٹو نے یہ فیصلہ تسلیم نہیں کیا اور اس کے خلاف سوئس سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ ۲۰۰۵ء میں سوئس سپریم کورٹ نے ماتحت عدالت کا فیصلہ کالعدم قرار دے دیا۔ تاہم ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ معاملے کی تفتیش ازسرنو کی جائے۔ چناں چہ

مشرف حکومت نے دوبارہ ماتحت سوئس عدالت سے رجوع کر لیا۔

سوئس تفتیش کار مقدمے کی چھان بین کر رہے تھے کہ پاکستان میں عدلیہ متحرک ہوگئی۔ چیف جسٹس افتخار حسین چودھری کی قیادت میں سپریم کورٹ نے بعض مقدمات میں حکومت کے خلاف فیصلے دیے۔ چناں چہ مارچ ۲۰۰۷ء میں جنرل مشرف نے زبردستی چیف جسٹس سے استعفیٰ لے لیا۔

جب جنرل مشرف برسراقتدار آئے، تو انھوں نے بے نظیر بھٹو، آصف زرداری اور نواز شریف کو کرپٹ لیڈر قرار دیا تھا۔ لیکن جب دوران حکومت ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں اور عدلیہ نے جنرل صاحب پہ گرفت کی، تو وہ حزب اختلاف کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرنے لگے۔ مدعا یہی تھا کہ اپنا اقتدار قائم رکھا جائے۔

این آر او کا پھڈا

چناں چہ اکتوبر ۲۰۰۷ء میں مشرف حکومت نے ''این آر او'' جاری کیا۔ اس صدارتی حکم نامے کے ذریعے ان تمام سیاست دانوں، سرکاری افسروں اور سیاسی کارکنوں کو معافی مل گئی جن پر کرپشن، ہیرا پھیری، فراڈ، قتل اور دہشت گردی وغیرہ کے سلسلے میں مقدمے چل رہے تھے۔ این آر او کے باعث بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے خلاف چلتے سبھی مقدمات میں حکومت نے پیروی کرنا چھوڑ دی۔

کوٹیکنا اور ایس جی ایس کیس کی تفتیش سوئس جج ونسنٹ فورنیر (Vincent Fournier) کر رہا تھا۔ اس نے اکتوبر ۲۰۰۷ء ہی میں چھان بین مکمل کر کے کیس پراسیکوٹر، ڈینئل زیپلی (Daniel Zappelli) کے حوالے کر دیا۔ اب ڈینئل زیپلی ہی نے مقدمہ متعلقہ عدالت کو بھجوانا تھا۔

عجیب بات یہ ہے، ڈینئل زیپلی یہ راگ الاپنے لگا کہ این آر او کے بعد بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے خلاف مقدمہ نہیں چل سکتا...... کیونکہ پاکستانی حکومت سے انھیں معافی مل چکی۔ حیرت انگیز بات یہ کہ جب سپریم کورٹ پاکستان نے دسمبر ۲۰۰۹ء میں این آر او کالعدم کر ڈالا، تو ڈینئل زیپلی نے پھر مقدمہ چلانے سے انکار کر دیا۔ اب اس کا استدلال تھا کہ صدر آصف زرداری کو بطور صدر استثنیٰ حاصل ہے۔

اندرونی ذرائع کا کہنا ہے کہ سابق حکمران پاکستانی جوڑے نے ڈینئل زیپلی کو بھاری رقم بطور رشوت دے کر اپنا طرف دار بنا لیا۔ چناں چہ وہ ان پر مقدمہ چلانے سے گریز کرتا رہا۔ مزید برآں سوئٹزرلینڈ قومی خزانے کی لوٹ مار کرنے والے حکمرانوں اور آمروں کی جنت ہے۔ انہی کے دم قدم سے سوئس بینکاری کا کاروبار پھلتا پھولتا ہے۔ لہٰذا منافع بخش کاروبار کو مندے سے بچانے کے لیے سوئس حکومت نے بھی زیپلی پر دباؤ نہیں ڈالا۔

پی پی پی حکومت کا دباؤ

تاہم این آر او کے خاتمے سے نیب کی پاکستانی عدالتوں میں جاری کوٹیکنا اور ایس جی ایس کے مقدمے دوبارہ چلنے لگے۔ لیکن اب پی پی پی حکومت میں تھی لہٰذا نیب عدالتوں کے ججوں پر ہر ممکن طریقے سے اثر انداز ہونے کی سعی ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۳۰ / جولائی ۲۰۱۱ء کو راولپنڈی نیب عدالت نمبر ۲ نے کوٹیکنا کیس میں مرحومہ بے نظیر بھٹو، آصف زرداری اور دیگر ملزمان کو بری کر دیا۔ اسی طرح ۱۶ / ستمبر ۲۰۱۱ء کو

راولپنڈی ہی کی احتساب عدالت نمبر۳ کے فیصلے کی روشنی میں ایس جی ایس کیس میں بھی درج بالا ملزمان بےقصور قرار پائے۔

بعدازاں نامور صحافیوں نے دونوں فیصلوں میں زبردست مشابہت ہونے کا اشارہ کیا۔ لگتا تھا کہ فیصلے ''اوپر'' سے موصول ہوئے، بس متعلقہ ججوں نے ان پر دستخط کر دیے۔ چونکہ دال میں کچھ کالا تھا، لہٰذا جون ۲۰۱۳ء میں لاہور ہائی کورٹ نے فیصلوں کی چھان بین کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی ٹیم تشکیل دی۔ یہ ٹیم فیصلے سنانے والے نیب کے دونوں ججوں، میاں الطاف حسین مہر اور جہاندار خان سے پوچھ گچھ کرنے لگی۔ اس تحقیقاتی ٹیم کی رپورٹ ابھی صیغہ راز میں ہے۔

یاد رہے، این آر او کالعدم کرنے کے بعد سپریم کورٹ نے حکومت پاکستان کو حکم دیا کہ سوئس مقدمات دوبارہ کھلوانے کی خاطر سوئٹزرلینڈ خط لکھا جائے۔ مگر زرداری حکومت خط لکھنے میں لیت ولعل سے کام لیتی رہی۔ حتیٰ کہ صدر آصف زرداری نے اس معاملے میں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو قربانی کا بکرا بنا دیا۔

اربوں روپے ہرجانے کا دعویٰ

سوئس کیسوں نے نومبر ۲۰۱۳ء میں نئی اور انوکھی کروٹ لی۔ کوٹکلینا اور ایس جی ایس کمپنیوں نے نواز شریف حکومت کو یہ درخواست دی: نیب عدالتوں کے فیصلوں سے ثابت ہو گیا کہ کوٹکلینا اور ایس جی ایس پہ کرپشن کے لگائے گئے الزامات غلط تھے۔ چونکہ ان مقدمات سے دونوں کمپنیوں کی شہرت متاثر ہوئی، لہٰذا اب حکومت پاکستان انھیں ۳۲ملین (تین کروڑ بیس لاکھ) ڈالر بطور ہرجانہ ادا کرے۔ نیز ۱۹۹۹ء سے اس رقم کا سود بھی دیا جائے (کہ اسی سال نیب نے مقدموں کا باقاعدہ آغاز کیا تھا)۔

گویا یہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والی بات ہو گئی۔

معلوم نہیں، نواز شریف حکومت نے سوئس کمپنیوں کو کیا جواب دیا، تاہم پچھلے دنوں سوئٹزرلینڈ سے ایک فیصلہ تازہ ہوا کا جھونکا بن کر پاکستان آ پہنچا۔

ڈینئل زیپلی... مشکوک کردار کا مالک سوئس جج

۱۰/اکتوبر ۲۰۱۴ء کو سوئٹزرلینڈ کی سپریم کورٹ (فیڈرل ٹریبونل) نے ایس جی ایس مقدمے کی سماعت کرتے ہوئے یہ فیصلہ سنایا کہ بومر فنانس کمپنی کے ایک سوئس اکاؤنٹ سے برآمد شدہ زیورات بےنظیر بھٹو ہی کے ہیں۔ چونکہ وہ متوفی ہو چکیں، لہٰذا اب ان زیورات کے مالک آصف زرداری اور ان کی اولاد ہے۔

بےنظیر بھٹو نے ۱۹۹۵ء میں یہ زیورات لندن کے پوش علاقے، نائٹس برج میں واقع جوہری کی دکان سے بہ عوض ایک لاکھ سترہ ہزار پونڈ خریدے تھے۔ اس کا بل بومر فنانس کمپنی کے سوئس اکاؤنٹ سے ادا کیا گیا۔ یہ زیورات ہیروں سے بنے ایک ہار، ایک بریسلٹ

(چوڑی)، بندوں اور انگوٹھی پر مشتمل ہیں۔ ان زیورات کی موجودہ مالیت تقریباً دو کروڑ روپے ہے۔

سوئس سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ بھی کہا کہ ان زیورات کی اصل مالک حکومت پاکستان ہے۔ لہٰذا ایسے اقدامات کیے جا سکتے ہیں کہ انھیں پاکستان کے حوالے کیا جا سکے۔

ایمان دار اور دلیر قیادت

یہ فیصلہ بڑا چشم کشا اور یادگار ہے کیونکہ اس نے ثابت کر دیا، سابق حکمران پاکستانی جوڑے نے برٹش ورجن آئی لینڈ میں ایک جعلی کمپنی کھولی تا کہ سوئس بینک میں اس کے اکاؤنٹ کھل سکیں۔ بعدازاں سوئس کمپنی، ایس جی ایس کمیشن (رشوت) کی رقم اس اکاؤنٹ میں جمع کراتی رہی۔

مزید برآں کوٹکینا اور ایس جی ایس کمپنیوں کا یہ دعویٰ بھی غلط ثابت ہو گیا کہ وہ بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے ساتھ کرپشن میں ملوث نہیں تھیں۔ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ سرگرمی سے سوئس عدالت میں مقدمے لڑے تا کہ نہ صرف زیورات واپس آئیں بلکہ منجمد سوئس اکاؤنٹس میں موجود اربوں روپے بھی واپس آ کر پاکستانی قوم کے کام آسکیں۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ شاید نواز شریف حکومت کی ایما پر پاکستانی میڈیا میں سوئس سپریم کورٹ کے فیصلے کو زیادہ نمایاں نہیں کیا گیا۔ دراصل ماہ نومبر میں جب فیصلے کا متن حکومت پاکستان کو ملا، تو تحریک انصاف نے اس پر دھاوا بول رکھا تھا۔ اس سے مقابلہ کرنے کی خاطر نواز شریف حکومت کو پی پی پی کی مدد درکار تھی۔ اسی لیے مقدمے کو نمایاں نہیں کیا گیا...... کہ کہیں قائدین پی پی پی ناراض ہو جائیں۔ مگر کیا یہ روش ملک وقوم کے حق میں جاتی ہے؟

چند ماہ قبل وزیرخزانہ، اسحاق ڈار نے انکشاف کیا تھا کہ پاکستانیوں نے "۲۰۰ ارب ڈالر" سوئٹزرلینڈ اور دیگر بیرونی ممالک کے بینکوں میں جمع کرا رکھے ہیں۔ بالفرض ان میں سے ۶۰ ارب ڈالر بھی قومی خزانے سے لوٹی گئی رقم پر مشتمل ہیں، تو ان کی واپسی سے ہمارا سارا بیرونی قرضہ اتر سکتا ہے۔ لیکن یہ اربوں ڈالر واپس لانے کے لیے ایسی ایمان دار اور دلیر قیادت درکار ہے جو اپنی کرسی بچانے کی خاطر کوئی جوا نہ کھیلے، حتی کہ اقتدار ختم ہوتا دیکھ کر بھی سچائی و حق کا پرچم بلند کیے رکھے۔

◆◆◆

پُرلطف زندگی گزارنے کے سنہرے اصول

- زندگی "کچھ لو اور کچھ دو" کا نام ہے۔
- آپ کا "دینا"، "لینے" سے زیادہ ہونا چاہیے۔ زندگی بہت مختصر ہے، اسے عداوتوں کے پیچھے ضائع نہ کریں۔
- تعریف کریں تو کھل کر کریں۔
- تنقید کرتے وقت میانہ روی اختیار کریں۔
- جیسے آپ میٹھا پھل خریدتے ہیں۔ اسی طرح میٹھے بول اپنائیں۔
- ہمیشہ اچھا شگون لیں اور لوگوں سے حسنِ ظن رکھیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کریں تا کہ وہ کامیابی کے راستے پر مزید آگے بڑھتے رہیں۔
- لوگوں کی باتوں کو توجہ اور خاموشی سے سننا سیکھیں۔ لوگ آپ کے قریب آجائیں گے۔
- یہ ذہانت نہیں کہ آپ بحث و مباحثے میں مدمقابل کو چت کر دیں۔ قابلیت یہ ہے کہ آپ سرے سے بحث ہی میں نہ پڑیں۔

(امیر حمزہ بن مشتاق احمد، وار برٹن)

عمدہ کہانی، دلکش اداکاری اور بہترین عکاسی والے

پاکستانی ڈراموں کی بھارت میں دھوم

ہمارے نجی ٹی وی چینل معیاری ڈرامے بنا کر نہ صرف مالی فائدہ پائیں گے بلکہ بھارت میں پاکستانی تہذیب و معاشرت کو بھی عام کر سکتے ہیں

عاصم محمود

میں نے ۱۹۷۵ء میں شعور سنبھالا، تو ٹی وی ڈرامے پاکستانیوں کے لیے ایک بڑی تفریح بن چکے تھے۔ اس زمانے میں پاکستان ٹیلی ویژن کا طوطی بولتا تھا۔ چونکہ ٹیلی ویژن کم تھے، لہٰذا محلے میں جس گھر میں ٹی وی ہوتا، وہاں سرِشام خصوصاً بچوں کا میلا لگ جاتا۔ تب دوسروں کا لحاظ اور بھائی چارہ موجود تھا، اس لیے عموماً گھر میں محلے والوں کو خوش آمدید کہا جاتا۔

اس وقت پاکستانی ڈرامے سرحد پار بھی مقبول تھے۔ امرتسر میں ہندو اور سکھ اپنے انٹینوں کا رخ پاکستان کی طرف کیے رکھتے تاکہ پاکستانی ڈرامے دیکھ سکیں۔ دلچسپ بات یہ کہ اس دور میں پاکستانی فلمیں زوال پذیر ہو چکی تھیں۔ اس لیے لاہور اور دیگر سرحدی شہروں کے پاکستانی مخصوص دنوں میں ٹی وی انٹینوں کا رخ بھارت کی طرف کرتے پائے جاتے۔ ان مخصوص دنوں میں بھارتی فلمیں لگتی تھیں۔

پاکستان ٹیلی ویژن اور بھارتی ٹی وی، دور درشن کی بنیاد ۱۹۶۰ء کے عشرے میں رکھی گئی۔ تاہم چند ہی برس میں پاکستان ٹی وی اپنے معاصر سے بہت آگے نکل گیا۔ اس کامیابی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستان ٹی وی کے کرتا

دھرتا نامور ادیب، شاعر اور دانش ور تھے۔ چناں چہ انھوں نے ہر پروگرام اور ہر صوتی تخلیق کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔

دوسری طرف دوردرشن کا انتظام بھارتی سرکاری افسروں کے ہاتھوں میں تھا۔ چناں چہ بھارتی قومی ٹی وی حکومت کا بھونپو بن گیا۔ اس کے پروگرام حتیٰ کہ ڈرامے بھی پھسپھسے ہوتے کہ ان کی وساطت سے سرکاری پالیسی کا پروپیگنڈا کیا جاتا۔

چناں چہ جب پاکستان ٹیلی ویژن سے انکل عرفی، شہزوری، الف نون، مسٹر جیدی، تعلیم بالغاں وغیرہ یادگار ڈرامے نشر ہو رہے تھے، تو دوردرشن کی وجہ شہرت صرف ''چترہار'' (بھارتی فلموں کے گیتوں کا پروگرام) تھا یا پھر فلمیں جو گاہے گاہے دکھائی جاتیں۔

پاکستانی ڈراموں اور دیگر پروگراموں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں اسلامی و مشرقی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا۔ وہ اخلاق سے گری اور ناشائستہ حرکات سے مبرا ہوتے۔ ان میں مقامی تہذیب و ثقافت کو بھرپور طریقے سے اجاگر کیا جاتا۔ یوں پاکستان ٹی وی کے پروگرام تفریح بہم پہنچانے کے علاوہ ناظرین کو باشعور بھی بناتے۔ یہی دنیا بھر میں ٹی وی کا بامقصد اور مثبت روپ بھی ہے۔

تبدیلی کا جنم

۱۹۹۰ء کے بعد پاکستانی ڈرامے یکسانیت اور گرتے معیار کی وجہ سے بور ہونے لگے۔ دلچسپ بات یہ کہ اسی زمانے میں بھارت میں ایک نئے انقلاب نے جنم لیا۔ ہوا یہ کہ نجی شعبے نے ٹی وی چینل کھول لیے جن میں اسٹار پلس، زی ٹی وی اور سونی سرفہرست تھے۔

یہ نئے بھارتی ٹی وی چینل ایسے ڈرامے (سوپ سیریل) پیش کرنے لگے جن کی اقساط روزانہ پیش ہوتیں۔ یہ ڈرامے ڈش کی وساطت سے پاکستانی طبقہ بالا میں خاصے مقبول ہوئے۔ حتیٰ کہ اسٹار پلس کے ڈراموں کا چرچا متوسط پاکستانی گھرانوں میں بھی ہونے لگا۔ تاہم پاکستان میں بھارتی ڈراموں کی مشہوری مختصر عرصے ہی رہی۔

۲۰۰۲ء میں جنرل پرویز مشرف نے نجی شعبے کو ٹی وی چینل کھولنے کی اجازت دے دی۔ چناں چہ اسی سال پہلا پرائیویٹ چینل، جیو انٹرٹینمنٹ کام کرنے لگا۔ بعدازاں ڈرامے اور تفریحی پروگرام پیش کرنے والے دیگر ٹی وی چینل بھی سامنے آئے جن میں اے آر وائی، ہم، اے پلس اور ایکسپریس شامل ہیں۔

ان پرائیویٹ ٹی وی چینلوں نے بہترین لکھاریوں، ڈائریکٹروں، سیٹ ڈیزائنروں وغیرہ کی خدمات حاصل کیں اور انھیں عمدہ مشاہرہ دیا۔ غور و فکر اور دل لگا کر کام کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ نجی ٹی وی چینل نت نئے موضوعات پر اچھے ڈرامے تخلیق کرنے لگے۔ یوں جو شائقین ڈرامے سے روٹھ گئے تھے، وہ پھر اس صنف کی طرف آنے لگے۔

اُدھر بھارت میں ڈراما اسی زوال سے گزرا جس سے پاکستانی ڈراموں کو سابقہ پڑ چکا تھا۔ اداکاری اور موضوعات میں یکسانیت آ گئی۔ سیٹوں میں بھی جدت نہیں رہی۔ نتیجتاً شائقین معلوماتی و سائنسی پروگرام شوق سے دیکھنے لگے۔

بھارت میں مختلف طریقوں سے باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے کہ کس ٹی وی چینل کو کتنے ناظرین دیکھ رہے ہیں۔ دراصل تحقیقی جائزے کو دیکھ کر ہی کاروباری ادارے فیصلہ کرتے ہیں، کس چینل کو اشتہار دیا جائے۔ چناں چہ ہر ملک میں ٹی وی چینلوں کے مابین ہر دم یہ مقابلہ جاری رہتا ہے کہ بہترین پروگرام بنا کر زیادہ سے زیادہ ناظرین اپنی طرف متوجہ کیے جائیں۔

زی انٹرٹینمنٹ انٹرپرائز لمیٹڈ ٹی وی چینلوں کی تعداد کے لحاظ سے بھارت کا دوسرا بڑا گروپ ہے۔ یہ

"۳۴" ٹی وی چینلوں کا مالک ہے۔ ان میں زی ٹی وی، زی سینما، زی سلام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پاکستانی ڈراموں پر نظر

دو سال قبل کی بات ہے، زی انٹرٹینمنٹ گروپ کے چند ڈائریکٹروں نے اتفاق سے پرائیویٹ پاکستانی ٹی وی چینلوں کے تیار کردہ ڈرامے دیکھ لیے۔ وہ انھیں اچھوتے پن اور تروتازگی کے باعث بہت پسند آئے۔ ان بھارتی ڈائریکٹروں نے پھر بورڈ میٹنگ میں یہ تجویز پیش کی کہ جدید دور کے پاکستانی ڈرامے بھارت میں دکھائے جانے چاہییں۔ اس تجویز کو سراہا گیا۔

چناں چہ گروپ کے بورڈ نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں ادبا، اداکار اور ڈائریکٹر شامل تھے۔ انھوں نے سیکڑوں پاکستانی ڈرامے دیکھے اور ان کا معیار جانچتے رہے۔ آخر انھوں نے فیصلہ کیا کہ پاکستانی ڈرامے اتنے زبردست اور عمدہ ہیں کہ انھیں بھارت میں دکھایا جا سکتا ہے۔

زی گروپ کے ڈائریکٹروں کو بھی یقین تھا کہ منفرد پاکستانی ڈرامے لاکھوں ناظرین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہیں گے۔ چناں چہ انھیں دکھانے کے لیے ایک نیا ٹی وی چینل کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۲۳ر جون ۲۰۱۴ء کو "زی زندگی" کے نام سے ایک نیا بھارتی چینل کام کرنے لگا۔ اس کا نعرہ یا موٹو ہے: "جوڑے دلوں کو"۔ گو اس چینل پر دیگر ممالک کے ڈرامے بھی ترجمہ کر کے دکھائے جائیں گے، مگر یہ بنیادی طور پر پاکستانی ڈرامے دکھانے کے لیے ہی شروع ہوا۔ لہٰذا اس کا نعرہ مثبت رخ رکھتا ہے۔ یقیناً بھارتی حکمران طبقہ مسئلہ کشمیر حل کر دے اور پاکستان کے خلاف سازشیں نہ کرے، تو دونوں ملک مل کر معاشی طور پر بہت ترقی کر سکتے ہیں۔

"عون زارا" پہلا ڈراما ہے جو زی زندگی سے پیش ہوا۔ توقع کے مطابق اسے بھارتی ناظرین نے پسند کیا۔ بعدازاں معروف پاکستانی ڈرامے مثلاً ہمسفر، زندگی گلزار ہے، میرے قاتل میرے دلدار، میرے نصیب وغیرہ نشر ہوئے، تو انھوں نے بھارت میں ہلچل مچا دی۔

جمشید انصاری... چقو ہے میرے پاس!

زی زندگی سے ہر ڈرامے کی ایک قسط روزانہ دکھائی جاتی ہے۔ جیسے بعض پاکستانی چینل بھی ایسا کرتے ہیں۔

چناں چہ "زندگی گلزار ہے" چار بار اور "ہمسفر" تین بار زی زندگی سے دکھایا جا چکا۔ حتیٰ کہ بھارتی ناظرین نے ہمسفر ڈرامے کی ہیروئن، خرد (ماہرہ خان) کو بھارت آنے کی دعوت دے ڈالی۔ ماہرہ خان پڑوس میں گئیں، تو انھیں بہت پذیرائی ملی۔

ایک ہندو صحافی کا تبصرہ

بھارت کے مشہور انگریزی اخبار، "دی ہندو" کی نمائندہ، نروپما سبرامنیم نے چار برس پاکستان میں گزارے...... انھوں نے بھارت میں پاکستانی ڈراموں کی بے انتہا مقبولیت کے بعد "دی ہندو" میں ایک انگریزی مضمون "Humsafar in the

Gulzar that South Asia might have been'' تحریر کیا۔ اس مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

پچھلے دن میں دفتر کی کینٹین میں چائے پی رہی تھی کہ ایک ساتھی آ پہنچی۔ وہ بڑی جوشیلی لگ رہی تھی۔ کہنے لگی: ''یار مجھے تم پر رشک آ رہا ہے۔ تم چار سال پاکستان میں رہی ہونا؟''

میں نے منہ بنا کر کہا ''ہاں، لوگ کہتے ہیں، وہ دنیا کا سب سے خطرناک دیس بن چکا......''

مگر میری دوست کو سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بات کاٹ کر بولی ''ارے تم نے ''زندگی گلزار ہے'' دیکھا ہے؟''

میں جانتی تھی کہ بھارت میں پاکستانی ڈرامے دکھائے جا رہے ہیں۔ مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ میری پڑھی لکھی سہیلی ان کی اتنی دیوانی نکلے گی۔ وہ تو بلا رکے ڈرامے کی تعریفیں کرنے لگی:

''موضوع...... شاندار! کہانی...... بہت خوب! اختصار...... لاجواب! یہ بہترین خوبی ہے کیونکہ یہاں تو ڈرامے سالہا سال چلتے ہیں۔ جبکہ پاکستانی ڈراما چند اقساط میں ختم! ملبوسات...... یار پاکستانی لڑکیاں شلوار قمیص میں کیا جدت لائی ہیں۔ اداکاری...... اُف اتنی فطری! اداکار...... خوبصورت اور دلکش۔'' سہیلی نے پھر مجھے یوٹیوب پر ایک قسط کا لنک بھجوایا۔ یقین مانیے، مجھے بھی ڈراما اتنا پسند آیا کہ میں نے اگلے دو ہفتوں میں ساری اقساط دیکھ ڈالیں۔ اب ''ہمسفر'' بصد شوق دیکھ رہی ہوں۔

یہ درست ہے کہ مسئلہ کشمیر، دہشت گردی اور دیگر مسائل کی وجہ سے بھارت اور پاکستان کے عوام آزادی سے گھل مل نہیں سکتے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام کے کئی دکھ سکھ سانجھے ہیں۔ مثال کے طور پر لوڈشیڈنگ، نہانے کے عین درمیان پانی چلا جانا، بیٹے بیٹیوں کی شادی کے لیے والدین کا پریشان ہونا، ملازمت تلاش کرنا وغیرہ۔ بھارتی اور پاکستانی ڈرامے دیکھ کر بھی ایک دوسرے کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔''

ڈراموں کی اہمیت

دور جدید میں ٹی وی کی عام دستیابی کے باعث ڈراما خیالات و نظریات، تہذیب و ثقافت اور اقدار و روایات کی ترویج کا مؤثر ذریعہ بن چکا۔ مثال کے طور پر ترک ڈراموں ہی کو لیجیے۔ یہ دنیا بھر خصوصاً اسلامی ممالک میں ذوق و شوق سے دیکھے جاتے ہیں۔ انھی کے ذریعے پاکستان، ایران، دنیائے عرب میں کروڑوں نوجوان ترک تاریخ، تہذیب و معاشرت اور اقدار سے آگاہ ہوئے۔

اتاترک کے مذہب دشمن اقدامات کی وجہ سے ترک معاشرہ سیکولر ہو چکا۔ اس معاشرے کے غیر اسلامی خدوخال اسی لیے ترک ڈراموں سے بھی جھلکتے ہیں۔ اس خامی کے باوجود ترک ڈرامے اسلامی ممالک میں ترکوں کی عظمت رفتہ کی دھاک بیٹھانے میں کامیاب رہے اور ترکی کو بہ حیثیت ابھرتی طاقت بھی نمایاں کر دیا۔

اب حال یہ ہے کہ ترک ڈرامے ترکی کی منافع بخش ایکسپورٹ بن چکے۔ ۲۰۱۳ء میں ترکوں نے تیرہ کروڑ ڈالر (تیرہ ارب روپے) کے ڈرامے درآمد کیے۔ ان میں سب سے مشہور ''محتشم صدی'' ہے جو ۴۳ ممالک میں دیکھا گیا۔ پاکستان میں یہ ڈراما ''میرا سلطان'' کے نام سے نشر ہوا۔

قیام پاکستان کے زمانے سے بھارتی فلمیں بصد شوق ہمارے ہاں دیکھی جا رہی ہیں۔ ہر شے کی طرح یہ بھی منفی و مثبت پہلو رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ ان فلموں کی وجہ سے بھارت میں نہ صرف اُردو زندہ رہی بلکہ اس نے ''عوامی بولی'' کی خصوصی حیثیت حاصل کر لی۔ آج بھارتی فلموں کی وجہ سے تامل ناڈو، آسام اور کیرالہ جیسی دور دراز ریاستوں میں بھی اردو بولی و سمجھی جاتی ہے۔

ہمارے لیے بھارتی فلموں کا منفی پہلو یہ ہے کہ ان

کی وجہ سے کئی ہندوانہ نام پاکستانی نئی نسل کی زبانوں پر چڑھ چکے مثلاً بھگوان کرپا کرے گا، رام جی، ہنومان کی جے وغیرہ۔ خوش قسمتی سے یہ رجحان کچھ کم ہو چکا، مگر پاکستان میں ہندوانہ تہذیب وثقافت کا پھیلاؤ دیکھ کر ہی سونیا گاندھی خوشی سے کہہ اٹھی تھیں: ''ہم نے اسلحے کے بغیر پاکستان فتح کر لیا۔'' اب ہمارے پاس پاکستانی تہذیب وثقافت اور اقدار بھارت میں متعارف کرانے اور پھیلانے کا سنہرا موقع ہے اور یہ کارنمایاں پاکستانی ڈراما انجام دینے کی بخوبی صلاحیت رکھتا ہے۔ وجہ یہ کہ بھارت میں اردو کے اچھے ڈراما نگار موجود نہیں۔

چناں چہ بھارتی ڈراموں کی کہانی بہت کمزور ہوتی ہے۔ کمزور مکالموں کے باعث اداکاری بھی بے جان اور بور رہتی ہے۔

دوسری سمت پاکستان میں اب بھی کئی اچھے ڈراما نگار موجود ہیں۔ وہ پرکشش مکالموں اور متنوع نظریات سے مزین ڈرامائی کہانی تخلیق کرتے ہیں۔ بعدازاں باصلاحیت ڈائریکٹر بہترین مکالموں کی بنیاد پر اداکاروں سے عمدہ اداکاری کراتے ہیں۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ ڈراما پیش کرنے والے پاکستانی ٹی وی چینلوں میں مقابلہ جنم لے چکا۔ مقابلے کی فضا کا مثبت روپ یہ ہے کہ یوں ہر چینل خوب سے خوب تر کی جستجو کرتا اور بہترین ڈراما ناظرین کو دکھاتا ہے۔

عمدہ کہانی، بہترین اداکاری اور لاجواب ہدایت کاری کے باعث ہی پاکستانی ڈرامے بھارت میں پسند کیے گئے۔ یوں بھارتی عوام کے سامنے پاکستان کا مثبت تاثر ابھرا اور انھیں معلوم ہوا کہ اس ملک میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

اب پاکستانی ٹی وی چینلوں کو چاہیے کہ وہ زیادہ معیاری ڈرامے تخلیق کریں۔ نیز ان میں پاکستانی تہذیب، ثقافت اور روایات کو بھی اجاگر کیا جائے۔ یوں وہ خصوصاً پڑوسی ممالک میں دوستی ومحبت کے موثر سفیر بن سکتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ان کی فروخت سے پاکستان ٹی وی چینلوں کو آمدن بھی ہوگی۔

ترکی میں ٹی وی چینلوں کے مابین اتنا سخت مقابلہ ہے کہ وہاں بیشتر سلسلے وار ڈرامے چھے سات اقساط تک ہی چل پاتے ہیں۔ صرف وہی ڈرامے آگے چلتے ہیں جنھیں لاکھوں ناظرین پسند کریں۔ مقابلے کی اسی فضا نے ''میرا سلطان'' جیسے مسحورکن ڈرامے کو جنم دیا۔

گاؤزنگجین چین کے نوبل انعام یافتہ ڈراما نگار ہیں۔ ان کا قول ہے: ''حقیقی زندگی ڈرامے ہی میں ملتی ہے۔ کہانی کا نقاب اوڑھ کر آپ سچ بول سکتے ہیں۔'' چناں چہ پاکستان ڈراما تیار کرنے والے اداروں کے لیے یہ نادر موقع ہے کہ وہ عمدہ ڈرامے تخلیق کر کے بھارتی عوام کو سچائی سے آگاہ کریں...... یہ سچائی کہ پاکستانی محبت کرنے والی، صابر اور مہمان نواز قوم ہے۔

تابندہ روایات رکھنے والی ایک

اس بیتے دور کی دل خوش کن کتھا
جب خلوص و پیار ہی معیار زندگی تھا
پھر پیسے کا ہوکا ساری عظیم اقدار تباہ کر گیا

سراج دین

ہمارے محلے دار معمر بزرگ شیخ عبدالغفار نے اپنے گھر کے آگے کھڑے چند منچلے نوجوانوں سے جو اپنی خوش گپیوں کے دوران بلند قہقہوں کے ساتھ مغلظات بھی بک رہے تھے، قدرے شستہ لہجے میں کہا ''بیٹا یہاں سے چلے جاؤ اور اپنے گھر کے سامنے ایسی محفل جماؤ......''

ایک نوجوان نے برجستہ کہا ''بزرگو! ہم اپنے محلے میں کھڑے ہیں اور یہ گلی کسی کے باپ کی نہیں جو ہمیں یہاں سے جانے کا حکم دے۔ تمہیں تکلیف ہے، تو اپنا دروازہ اور کھڑکیاں بند کرلو، ہم کہیں نہیں جائیں گے۔''

شیخ صاحب پرانی قدروں کے امین اور دبنگ شخصیت کے مالک تھے۔ پورا محلّہ ان کی عزت کرتا۔ لیکن آج خلاف توقع یہ جواب سن کر وہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گئے۔ کل کے چھوکرے اُن کا یوں تمسخر اُڑائیں

گے؟ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ بچارے چپ چاپ بالکونی سے سرک گئے۔

ایک دور تھا جب بزرگوں کا کہا ہی سب کچھ ہوتا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اُن کے سامنے گردن اُٹھا یا آنکھیں ملا کر بات کر سکے۔ ''مار نہیں پیار'' والی کوئی ترغیب ہی نہیں تھی۔

☆☆

ہماری گلی تو وہی ہے لیکن مکین ہی نہیں مکانات بھی بدل گئے۔ کشادہ صحنوں اور کھلی آب و ہوا والے گھروندوں کی جگہ تین تین چار چار منزلہ ''اٹیچ باتھوں'' والے شاندار مکانوں نے لے لی جن کی پیشانیوں پر ہذا من فضل ربی، ماشاء اللہ اور الحمدللہ کی تختیاں آویزاں ہیں۔ اکا دُکا پرانے مکان اور شناسا بھی نظر آتے ہیں۔ چھوٹے بڑے نئے چہروں کی بہتات ہے جو پرانی قدروں سے قطعی ناآشنا اور بے راہروی کے غماز ہیں۔

ایک دور تھا جب بزرگوں کا کہا ہی سب کچھ ہوتا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اُن کے سامنے گردن اُٹھا یا آنکھیں ملا کر بات کر سکے۔

اکثر لوگوں کو لکشمی کی فراوانی نے اوقات ہی بھلا دی جو اپنا محلّہ اور پڑوسی چھوڑ گئے۔ بعضوں نے تو اپنی ذات بھی بدل لی۔ کوئی جوہر ٹاؤن چلا گیا' کوئی واپڈا ٹاؤن۔ کوئی ڈیفنس جا بسا اور کوئی ماڈل ٹاؤن' جسے چھپر پھاڑ کر ملا وہ بحریہ ٹاؤن سدھار گیا اور کوئی پورے خاندان سمیت ملک ہی چھوڑ گیا۔ کسی نے اپنا مکان اونے پونے بیچ ڈالا اور کوئی اپنے مکان میں ایسا کرائے دار گھس گیا جو اس محاورے ''ایک مچھلی پورے تالاب کو گندا کر دیتی ہے'' کے مصداق ہے۔

مثال کے طور پر ایک نئے محلے دار رکشا چلاتے ہیں جس کی آواز کانوں کے پردے ہلا دیتی ہے۔ یوں کہہ لیں کہ پورے محلے کا سکون برباد ہے' مگر کوئی اُسے منع کرنے کی جرأت نہیں کرتا' کہ مفت کی لڑائی ہے۔ شکل ایسی ڈراؤنی کہ بچے دیکھتے ہی سہم جائیں۔ آئے دن اس کے گھر ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ وہ بیوی بچوں کو چنگھاڑتے ہوئے بے نقط سناتا ہے جس کے باعث پڑوسی کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں۔ اُدھر مالک مکان ان تمام باتوں سے بے نیاز ہر ماہ کرایہ وصول کرنے آ جاتے ہیں۔ پھر گلی کا ماحول اور پھیلی انارکی دیکھ کر اپنے تئیں دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں کہ انھوں نے بروقت صحیح فیصلہ کیا جو اس ''جنجال پورہ'' کو چھوڑ ''گڈ لوکیشن'' اور ''ہائی اسٹینڈرڈ'' والوں میں جا بسے۔

انھیں پرانا محلّہ اور پڑوسی تبھی یاد آتے ہیں جب ان میں سے کوئی ملک عدم سدھارے' تو جنازہ اُٹھانے اور افسوس کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔ ''گڈ لوکیشن'' اور ''اسٹینڈرڈ والوں'' کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ پڑوسی کی والدہ انتقال کر گئی ہے اور انھیں تعزیت کے لیے جانا چاہیے۔ تب وہ پرانے محلے بذریعہ فون یا کسی کو بھیج کر مسجد میں اعلان کرواتے ہیں کہ چودھری قدوس کی والدہ انتقال فرما گئی ہیں۔ نماز جنازہ بعد نماز عشا مسجد کے احاطے میں ادا کی جائے گی۔ جنازے میں شریک ہو کر ثواب دارین حاصل کریں۔ پھر میت سمیت وہ اپنے آبائی محلے آتے اور پڑوسیوں اور محلے داروں کا تعاون اور ہمدردی کے بول سن کر زار و قطار روتے ہیں...... دل کے کسی کونے میں یہ خیال انھیں کچوکے ضرور لگاتا ہوگا کہ محلّہ چھوڑ کر اچھا نہیں کیا......

بہت سے ایسے بھی ہیں جو محلّہ چھوڑ نا نہیں چاہتے تھے۔ اُن کی کئی نسلیں یہاں پروان چڑھیں' مگر ذاتی مکان نہ ہونے کے باعث اُنھیں جانا پڑا۔ نئے مالکان اُن کی مجبوریوں' ضرورتوں اور شرافت کو خاطر ہی میں نہ لائے کیونکہ دھن دولت ہی اُن کا ہدف تھا۔

آج پرانے دن یاد آئیں' تو میں حیرت میں کھو جاتا ہوں۔ جب نفسانفسی ہم سے کوسوں دور اور سادہ زندگی ہر کسی کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ چھوٹے بڑے کا ادب و احترام تھا۔ عماراتیں کھڑی کرنے کی دوڑ تھی نہ بینک بیلنس بڑھانے کا لپکا۔ خلوص' پیار' محبت' ہمدردی اور دکھ درد میں کسی کے کام آنا' یہی معیارِ زندگی تھا۔

ہماری گلی میں کم و بیش سو سوا سو گھر آباد تھے۔ نکڑ پر ڈاک خانہ بھی تھا جس کے باعث یہ ڈاک خانے والی گلی کے نام سے مشہور تھی۔ گلی میں دائیں بائیں تین چار کٹڑیاں دس دس بیس بیس گھروں پر مشتمل تھیں۔ مختصراً یوں کہہ لیں کہ خوب رونق والی گلی تھی۔ دو پرچون کی دکانیں' ایک منیاری کی اور ایک دال سیویاں (سوئیاں) والے کی دکان تھی۔ بعض لوگ ہماری گلی کو دال سیویاں والی گلی بھی کہتے۔

پوری گلی میں صرف دو گھروں میں ویسپا اسکوٹر تھے۔ ایک میرے والد کا اور دوسرا حکیم جی کے ہاں۔ باقی مکینوں میں سے کسی کسی کے پاس ہرکولیس یا ریلے نامی سائیکل ہوا کرتی تھی۔ چھوٹے بڑے کا ادب و احترام تھا۔ نمود و نمائش کا فقدان اور محدود آمدن میں اچھی بھلی گزراوقات ہو جاتی تھی۔

ہمارے محلے کے اردگرد کھیت کھلیان اور ہرے بھرے باغات واقع تھے جن کے باعث ہر وقت فضا صاف شفاف اور مہکی رہتی۔ اُن دنوں سیوریج کے بجائے کھلی نالیوں سے نکاسیِ آب کا کام لیا جاتا۔ اسی طرح گھروں میں فلش یا کموڈ بھی نہیں تھے۔ ہر گھر میں جمعدارنی لگی ہوئی تھی جو روزانہ کوڑا اور فضلہ اُٹھا لے جاتی اور محلے سے دور ایک مخصوص جگہ ڈال آتی۔ وہاں سے میونسپل کمیٹی کا ٹرک اُٹھا لے جاتا۔ ہیپاٹائٹس اور سرطان جیسی موذی بیماریاں بھی ناپید تھیں۔

دال سوئیوں والی دکان درحقیقت ایک چھوٹا سا کباڑخانہ تھا جسے دو بھائی' ماکھا اور عاشق چلاتے تھے۔ انھوں نے دو چار ریڑھیاں بھی رکھی ہوئی تھیں جن پر خوانچہ فروش ان کی تیار کردہ مصنوعات مثلاً ساکھاں' میٹھا پوڑا' نمکین دال سوئیاں' گڑ اور چنے کی دال سے بنی گچک' گڑ کا پتیسہ' نمکین پاپڑ اور گڑ والے مرمرے جنھیں ہم ''کھیلیں'' کہتے تھے' دن بھر پھیری لگا کر بیچتے۔ وہ یہ چیزیں چھان بورے' اخبار' کتابوں' کاپیوں کی ردی' لوہا' پیتل' سلور' تانبا اور نائیلون کے بدلے بھی دیتے اور شام ڈھلے دکان پر لوٹ آتے۔ ریڑھی کا کرایہ ادا کرتے اور دن بھر کی اکٹھی کی ہوئی اشیا اونے پونے ان کے پاس فروخت کرتے۔ وہ یہ اشیا انہی کے پاس بیچنے کے پابند تھے۔

آج پرانے دن یاد آئیں' تو میں حیرت میں کھو جاتا ہوں۔ جب نفسانفسی ہم سے کوسوں دور اور سادہ زندگی ہر کسی کا اوڑھنا بچھونا تھی۔

صبح آتے ہی دونوں بھائی اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ ایک چنے کی دال بھگوتا' دوسرا بیسن گوندھتا۔ ایک بھٹی پر بیٹھ جاتا' دوسرا کسی اور کام میں جت جاتا۔ غرض وہ صبح سے شام تک مصروف رہتے۔ عاشق چنے کی دال صاف کیے بنا بھگوتا۔ اُس میں پڑے

تنکے اور چھلکے پانی کی سطح پر آ جاتے مگر کنکر اُسی میں رہتے جو چٹ پٹی کراری دال کھانے والوں کا مزہ کرکرا کرنے یا اُن کے دانتوں کا امتحان لینے کے کام آتے۔

بے اختیار مجھے اپنی والدہ یاد آ جاتی ہیں۔ جب گھر کا راشن آتا، تو والدہ گرم مسالے کے تمام اجزا مثلاً کالا و سفید زیرہ، کالی مرچیں، دار چینی، لونگ، بڑی الائچی، سونف اور اجوائن تک خاص اہتمام سے دھوتیں۔ پھر انھیں سُکھانے کے لیے طشتریوں میں ڈال، ململ کے کپڑے سے ڈھانپ کر دھوپ میں رکھ دیتیں، تو میں حیرت اور ناراضی کا اظہار کرتا کہ بھلا ان چیزوں کو بھی کوئی دھوتا ہے؟ ''بس اب پسی سرخ مرچیں اور نمک رہ گیا ہے، انھیں بھی کھنگال لیں۔'' میں چڑ کر کہتا۔

مگر جب والدہ یہ اشیا دھونے کے دوران اُن میں سے نکلی ریت اور مٹی دکھاتیں، تو میں کھسیانی ہنسی کے ساتھ شرمندہ ہو جاتا اور سوچتا کہ بے شمار گھر ایسے ہیں جہاں خواتین مسالہ جات کی صفائی ستھرائی کو خاطر میں نہیں لاتیں اور یونہی استعمال کر لیتی ہیں۔ میرا معمول ہے کہ جب بھی راشن لاؤں، تو بیگم سے یہ اشیا دھلوانا نہیں بھولتا۔ انھیں دھوتے ہوئے بیگم کی بھی وہی کیفیت ہوتی ہے جو مجھ پر طاری ہوتی تھی۔

عاشق اور ماکھے نے دکان سے باہر ایک بھٹی بنا رکھی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے لکڑی کے ٹکڑے جنھیں ہم ''ڈک'' کہتے تھے، ڈال کر آگ جلائی جاتی۔ سردیوں میں اکثر لڑکے اس کے گرد ہالہ بنا کر بیٹھ جاتے اور اس کی گرمائش سے لطف اندوز ہوتے۔

آگ دہک جاتی، تو ماکھا بھٹی پر کڑاہی رکھ اُس میں بنولا تیل اُنڈیلتا جو کڑاہی کے کناروں سے صرف دو تین انچ نیچے رہتا۔ تیل گرم ہوتے ہی سوئیاں بنانے کا عمل شروع ہو جاتا جو کہ عاشق انجام دیتا جبکہ ماکھا ایک کڑاہی میں میدہ اور گڑ کا شیرہ ڈال کر پیلے رنگ کی لئی سی بنانے لگتا۔ اس عمل میں اُس کے بازو کہنیوں تک لتھڑ جاتے جنھیں دیکھ کر کراہت ہوتی، مگر ہم بچے اُسے جلد ہی بھلا دیتے۔ ماکھا ہاتھ سے اُس ملغوبے میں اس قدر گھوٹا لگاتا کہ جب لتھڑا ہوا ہاتھ اوپر اُٹھاتا، تو لئی کا ریشہ ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنا لتھڑا ہوا ہاتھ ڈیڑھ دو فٹ بلند کرتا پھر زور سے ملغوبے پر پٹختا، تو تھپڑ کی سی آواز آتی جیسے کسی بھینس کی پیٹھ پر مارا ہو۔ اس ملغوبے سے میٹھا پوڑا بنتا۔ سوئیاں اور میٹھا پوڑا بنانے کا منظر بھی دیدنی ہوتا۔

عاشق گوندھے ہوئے بیسن سے قریباً ڈیڑھ کلو کا پیڑا بناتا اور مخصوص چھیدوں والے ڈول نما فولادی سانچے میں ڈال کر گیلے ہاتھ سے پیڑے کو ہلکا ہلکا دباتا جو سانچے کے کنارے سے ایک انچ نیچے ہو جاتا، تاکہ اُس میں ڈھکن سما سکے۔ کڑاہی کے پیندے پر مخصوص فاصلے پر دو لکڑیاں رکھتا اور سانچا اس پر ٹکا کر ایک لمبی اور موٹی سی لکڑی جس کا سرا بھٹی سے دو فٹ پرے فولادی میخ کے ساتھ مضبوط رسی سے بندھا ہوتا، عین وسط میں ڈھکن پر رکھ اپنی دونوں ٹانگوں میں اُس کا دوسرا سرا لے آہستہ آہستہ اُسے دباتا۔

جیسے جیسے ڈھکن نیچے جاتا، باریک باریک سوئیاں نکل کر تیل میں جاتیں، تو شوں شوں کی آواز، تیل سے اٹھنے والی بھاپ اور بیسن کی مہک ہم بچوں کی رالیں ٹپکا دیتی۔ اس دوران عاشق قدرے سنبھل کر آہستہ آہستہ زور لگاتا رہتا۔ دیکھتے دیکھتے پھول نما سوئیوں سے کڑاہی بھر جاتی۔ چند لمحوں بعد وہ اس پھول کو بڑی سی کفگیر سے پلٹ دیتا۔ خدانخواستہ اس زور آزمائی کے دوران اگر لکڑی ٹوٹ جائے، تو عاشق کا جھلسنا یقینی ہوتا۔ مگر وہ اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہتا۔ سوئیاں

پک جاتیں، تو اُنھیں نکال کر چھیدوں والی پرات میں رکھتا جس کے نیچے ایک پتیلا پڑا ہوتا تھا۔ اس میں سوئیوں سے نچڑنے والا تیل گرتا رہتا۔

جب تک بیسن ختم نہ ہوتا وہ بار بار یہ عمل دہراتا۔ آخر پاؤ ڈیڑھ پاؤ بیسن بچ جاتا، تو اُس میں آلو یا لک، سوکھا دھنیا، پیاز اور اس طرح کے دیگر لوازمات ڈال کر پکوڑے بنا لیتا جو دونوں بھائی دوپہر کھانے میں مزے مزے سے کھاتے۔

اب گڑ کا پتیسہ بنانے کی تیاری ہوتی۔ چھے سات گڑ کی بوریاں ہر وقت اُن کی دکان میں موجود ہوتیں، جن سے شیرہ ٹپکتا اور مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ اُن دنوں شاید حفظانِ صحت کے اصولوں سے کوئی واقف ہی نہیں تھا۔ عاشق گندی سی تکڑی (ترازو) میں گڑ تول کر کڑاہی میں ڈالتا اور تھوڑا پانی ملا اسے بھٹی پر چڑھا دیتا۔ پھر فولادی کفگیر سے مسلسل گڑ ہلاتا رہتا تاکہ کڑاہی کے تلوے سے نہ چپکے۔ آنچ کا خاص خیال رکھتا اور گاہے گاہے ڈک بھٹی میں جھونکتا جاتا۔ آخر جب وہ پک پک کر گاڑھا ہو جاتا، تو اُس میں ایک خاص قسم کا کیمیائی سفید پتھر کا ٹکڑا ڈالتا جس سے میلا کچیلا سیاہ گڑ نکھر جاتا اور رتی بھر احساس نہ ہوتا کہ یہ وہی گندا گڑ تھا۔ جب وہ شیرہ تار چھوڑنے لگتا، تو کڑاہی بھٹی سے اُتار ایک تیل لگی پرات میں انڈیل دی جاتی۔

اس دوران ماکھا ''پاپڑ'' بنانے کے لیے میدہ گوندھنے میں مصروف ہوتا، سفید زیرہ، نمک اور تھوڑا سا بنولا تیل یہ ملغوبہ تیار کرنے کے اجزا ہوتے۔ اسے گوندھنے کا طریقہ آٹے سے قدرے مختلف ہوتا، تھوڑا سا تیل اور پانی کا چھینٹا لگا کر اسے ہتھیلی سے رگڑ رگڑ کر تیار کیا جاتا۔ پھر پاؤ پاؤ کے پیڑے بنا کر تھال میں سجا مخصوص وقت تک ڈھانک کر رکھ دیے جاتے۔

اُدھر پرات میں گرما گرم گاڑھے شیرے کی حدت قدرے کم ہو چکی، عاشق اُسے ہاتھ سے ٹٹول کر پرکھتا۔ پھر ایک طرف سے پکڑ کر کھینچتا اور کبھی دوسری طرف سے۔ یہی عمل وہ بار بار دہراتا۔ اس طرح شیرہ گندھے ہوئے آٹے کی شکل دھار لیتا۔ جب اُس کی حدت قابل برداشت ہو جاتی، تو عاشق اُس کا پیڑا بنا دیوار میں نصب ایک لمبی اور موٹی سے فولادی کیل پر رکھتا، تو ''میٹھا نرم گرم آٹا'' نیچے لپکتا۔ جیسے ہی وہ بالشت بھر نیچے آتا، عاشق اُسے سمیٹ کر دوبارہ کیل پر ٹانک دیتا۔ اب وہ اُسے دو بالشت نیچے آنے دیتا۔ پھر ٹانکتا۔ یہ کھینچا تانی قریباً ڈھائی تین فٹ تک چلی جاتی اور آخر وہ اسے دھوبی کے مانند کیل پر پٹختا اور زور لگا کر چار پانچ فٹ تک کھینچتا۔ پھر وسط میں سے تہ کر کے دہری تہ کیل تک لے جاتا۔ یوں چار تہوں کو ملا کر گول گول گھما کر یک جان کرتا اور پھر کھینچ کر وہی عمل دہراتا۔ درجنوں بار یہ عمل دہرانے کے بعد کیل سے پتیسہ اُتار لیا جاتا۔

ہم بچے دل جمی سے یہ منظر ندیدوں کی طرح دیکھتے کیونکہ جیسے ہی وہ کھینچ تان کر پتیسہ کیل سے اتارتا، تھوڑا بہت اس سے چپکا رہ جاتا۔ ہم بھاگم بھاگ گرما گرم پتیسہ اتارنے کی کوشش کرتے۔ کبھی کامیاب ہو جاتے اور کبھی ماکھا ہمیں جھڑک کر بھگا دیتا۔

اتنے میں ماکھا آدھا کلو کے قریب بیسن بھون چکا ہوتا۔ عاشق پتیسہ ایک تھال میں رکھ روئی کے مانند پھیلاتا اور بھونا ہوا بیسن اس پر چھڑک کر پھر پیڑا بنا دیتا بالکل اُسی طرح جیسے قیمے یا آلو والے نان بناتے ہیں۔ جب بیسن اور پتیسہ یک جان ہو جاتے، تو بیلن کی مدد سے روئی کے مانند اُسے پھیلا دیتا۔ جب پتیسہ ڈھائی

تین فٹ قطر کی روٹی کی شکل ڈھال لیتا' تو بھٹی میں رکھی چھری جو کہ گرم ہو چکی ہوتی ' اُس کی مدد سے اس کے تکونی ٹکڑے کاٹ کر محفوظ کر لیتا۔

عاشق بائیں آنکھ سے محروم تھا جس کا ہم بچے خوب فائدہ اٹھاتے اور چپکے سے بائیں جانب آ کر تھال میں ہاتھ مار گرم گرم سوئیاں اُٹھا بھاگ جاتے۔ جب کبھی ماکھا یہ فریضہ انجام دیتا' تو کوئی بچہ اُس کے قریب نہ پھٹکتا۔ یوں عاشق ہم بچوں کا منظور نظر تھا جبکہ دو نینوں والے ماکھے کو سب بچے خوامخواہ بُرا بھلا کہتے......

ماکھا میدے کے پیڑوں کی قریباً چار درجن ایک فٹ قطر کے پاپڑ بیل کے رکھ دیتا۔ پھر بھٹی پر تیل کی کڑاہی چڑھائی جاتی اور عاشق ان پاپڑوں کے وسط میں چھری سے لمبے لمبے کٹ لگا کر تلنے لگتا۔ وہ ایک باری میں چھے چھے پاپڑ تلتا۔ یہ کراکرے پاپڑ بھی بڑے مزیدار ہوتے۔

اب مرمرے اور گڑ کے شیرے کی ''کھیلیں'' بنانے کا مرحلہ آتا۔ گڑ پک کر تار چھوڑ چکا۔ گرم گرم شیرے میں کلو ڈیڑھ کلو کے قریب مرمرے ڈال کا عجلت میں اسے ملایا جاتا۔ پھر تخت پوش نما چکور بینچ پر جو ڈیڑھ بالشت زمین سے اونچا ہوتا' سفید سفوف چھڑک کر گرم گرم ملغوبہ اُس پر انڈیل دیا جاتا۔ عاشق اپنے دونوں ہاتھ پانی میں ڈبو کر وہ ملغوبہ پورے تخت پر پھیلاتا۔ پھر بیلن کی مدد سے پورے تخت پر روٹی کے مانند بیلتا۔ اس دوران وہ تھوڑے تھوڑے خشک مرمرے بھی ڈالتا جاتا مبادا وہ ملغوبہ بیلن سے نہ چپک جائے۔

لیجیے جناب بھٹی میں چھری گرم ہو چکی' اب ایک لمبی چپٹی سے جس طرح بچے کاپیوں پر لکیریں لگانے کے لیے فٹ استعمال کرتے ہیں' ویسے ہی عاشق وہ چپٹی تخت پر مخصوص نشان کی جگہ رکھ اپنا میلا کچیلا مٹی سے لتھڑا پاؤں چپٹی کے وسط میں جماتا' ہاتھ میں تھامی گرم چھری چلاتا اور پل بھر میں وہ ''کھیلیں'' چھوٹی چھوٹی چکور ٹکڑیوں میں تقسیم کر ڈالتا۔ اس عمل کے دوران بار ہا اُس کا گندا پاؤں اُن میٹھی ''کھیلوں'' کو چھوتا جس کی اُسے پروا تھی نہ ہم بچوں کو......

لیجیے اب میٹھا پوڑا بنانے کا طریقہ بھی جان لیجیے۔ تیل گرم ہو چکا اور کڑاہی کے وسط میں ایک گول سا بغیر پیندے کے فولادی سانچا پڑا ہے۔ عاشق میدے اور شیرے کی لئی سے ایک چھوٹا سا ڈونگا بھر کر دوسرے ڈنڈی والے ڈونگے میں ڈالتا جس کے پیندے میں چھوٹے چھوٹے بے شمار سوراخ ہیں۔ جیسے ہی وہ ملغوبہ اُس میں پڑتا پیندے سے باریک باریک تاریں نکلنا شروع ہو جاتیں۔ عاشق بڑی سرعت سے ڈونگے کے نیچے ڈونگا رکھ اُسے کڑاہی میں پڑے گول سانچے کے اوپر لے جا نچلا ڈونگا کھسکا لیتا۔ باریک باریک تاریں سانچے میں گرنے لگتیں اور عاشق ڈونگے کو گول گول گھمانا شروع کر دیتا۔ جیسے ہی پوڑے کا مواد پورا ہوتا' ڈونگے کے نیچے ڈونگا رکھ دونوں ڈونگے لئی والی کڑاہی پر اوندھے رکھ دیتا۔ پھر کڑاہی سے سانچا نکالتا' تو گول پوڑا تیل میں تیر رہا ہوتا جو چند لمحوں بعد نکال لیا جاتا۔

> **جدت نے ظاہری حسن میں تو اضافہ کر دیا' مگر حقیقی خوبصورتی ''سیرت'' کا کوئی پُرسان حال نہیں۔**

سب سے آخر میں دال تلنے کی باری آتی' کیونکہ دال کو دو چار گھنٹے پانی میں بھگونا ضروری ہوتا ہے۔ عاشق

دال کا دانہ اُٹھا کر شہادت کی انگلی پر رکھ اُسے انگوٹھے سے دباتا، اگر وہ پچک جاتا، تو سمجھیں دال بھیگ چکی اور اگر ثابت رہتا، تو اُسے تھوڑی دیر اور بھیگی رہنے دیتا۔

لیجیے جناب دال پھول کر نرم ہو چکی۔ ایک بڑا سا پتیلا جس کے پیندے میں بے شمار سوراخ ہوتے، عاشق دال اُس میں انڈیل دیتا تاکہ بچا کھچا پانی نچڑ جائے۔ اُدھر تیل گرم ہوا کہ نہیں یہ پرکھنے کے لیے عاشق ہاتھ گیلا کر کے کڑاہی پر جھٹکتا، تو پانی کے چھینٹے پڑتے ہی چڑ چڑ کی آواز آتی جو اس بات کی غماز تھی کہ تیل گرم ہو چکا۔ عاشق نے ضروری اشیا قریب رکھ کر نشست سنبھال لی اور چھوٹی سی تھالی میں دال بھر کر تھوڑی تھوڑی کڑاہی میں ڈالنے لگا۔ تین چار تھالیاں ڈال لیتا، تو ایسی بھنی بھنی مہک بھاپ کی صورت اُٹھتی کہ دل چاہتا ساری دال ہڑپ کر جاؤں...... عاشق دو تین بار چھلنی نما بڑی سی کفگیر کڑاہی میں پھیرتا اور چند منٹوں بعد تلی ہوئی دال نکال لیتا۔ ٹھنڈی ہونے پر اُس میں چٹ پٹے مسالہ جات ملا کر دال کراری بنا دی جاتی۔

لطف کی بات یہ ہے کہ پکوڑوں سمیت میں عاشق اور ماکھے کی بنائی ہوئی مصنوعات بخوبی بنا لیتا ہوں۔ بچے اور بیگم حیرت سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا؟

☆☆

ملا پرچون والا مخصوص اوقات میں دکان کھولتا۔ موصوف ریلوے میں ملازم تھا جبکہ حافظ جی کی ہٹی بلاناغہ وقت پر کھلتی۔ پورا محلّہ انہی کی دکانوں سے سودا سلف خریدتا۔ بجلی ہونے کے باوجود ملا نے دکان پر لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ شام ہوتے ہی اُسے روشن کر دیتے اور گرمیوں میں ہاتھ والا پنکھا استعمال کرتے۔ ہمارے پڑوسی حکیم صاحب تھے۔ انھوں نے گھر میں بھینس پالی ہوئی تھی۔ گرمیوں میں روزانہ ہم اُن کے گھر سے چاٹی کی لسی لیا کرتے جو اُن کی بیگم خوشی خوشی ڈول بھر کے دیتی۔

یہ ستر کی دہائی کی بات ہے۔ ابا جان کے اثر ورسوخ کی وجہ سے محلے میں سب سے پہلے سوئی گیس کا کنکشن ہمارے گھر لگا۔ اکثر محلے دار اتنی استطاعت بھی نہیں رکھتے تھے کہ چند سو روپے جمع کرا کے گیس لگوا سکیں۔ عاشق اور ماکھے کا خیال تھا کہ سوئی گیس چند برسوں بعد ختم ہو جائے گی اور جن لوگوں نے سرکار کے خزانے میں سیکیورٹی جمع کروائی ہے جو اُن دنوں چند سو روپے تھی، وہ ضائع جائے گی۔ پائپ فٹنگ اور چولھے بھی بیکار جائیں گے۔ لہٰذا وہ سوئی گیس لگوانے کے بجائے لکڑیاں جلانے ہی پر اکتفا کرتے رہے۔ لیکن جب گھر گھر اور تندوروں، ہوٹلوں پر بھی سوئی گیس جلنے لگی، تب انھوں نے گیس لگوانے کی درخواست دی۔ جب تک سیکیورٹی فیس کئی گنا بڑھ چکی تھی۔

پھر گردشِ ایام نے انگڑائی لی اور لوگوں نے پوش علاقوں میں جانے کے لیے اپنے آبا و اجداد کی جائداد بیچنا شروع کر دی۔ یوں عاشق اور ماکھے کو بھی اپنا کباڑ خانہ چھوڑنا پڑا۔ نئے مالکان نے جائداد خریدتے ہی مکینوں سے خالی کرا لی۔ اس طرح پرانے چہرے عنقا ہوئے اور نئے لوگ آ گئے۔

والد صاحب نے گلی کی بائیں جانب آغاز اور درمیان میں چار پانچ فٹ اونچا فولادی کھمبا بالکل وسط میں نصب کروا رکھا تھا، مبادا کوئی تانگہ ریڑھا یا رکشا اور ٹیکسی گلی میں گھس آئے اور کھیلتے کودتے بچوں کو کوئی

حادثہ پیش آ جائے۔ وہ صبح سویرے دھوتی باندھے، منہ میں مسواک لیے پوری گلی میں پانی سے چھڑکاؤ کرتے۔ خاکروب سے اپنی نگرانی میں صفائی کرواتے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ گلی میں کوڑا کرکٹ پھینک سکے۔ خاکروب کی کارکردگی سے خوش ہوتے' تو اُسے سبز چائے اور دیسی گھی کے پراٹھے سے ناشتا کرواتے اور جب کبھی ناراں ہوتے' تو بچارے کو خوب کھری کھری سناتے۔

محلے میں کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا' تو وہ میرے والد ہی سے رجوع کرتا۔ حتیٰ کہ لوگ شادی بیاہ کے معاملات میں بھی اُن سے صلاح لیتے۔ ہمارے گھر کی بیٹھک اکثر اوقات شادی ہال کے طور پر استعمال ہوتی۔ ایک دفعہ رشتے کے معاملے میں کچھ لوگ ابا جان کے پاس آئے اور لڑکی والوں کی بابت دریافت کیا' والد صاحب نے اُنھیں وہاں شادی کرنے سے منع کر دیا۔ لیکن وہ لڑکی بیاہ کر لے گئے۔ پھر کچھ ہی عرصے بعد وہ لڑکی کو اُس کے گھر چھوڑنے آئے۔ اب لڑکی والے میرے والد کے پاس آئے اور لڑکے والوں کی شکایت کی کہ انھوں نے خوامخواہ ہماری بچی کو گھر بھیج دیا ہے۔

والد صاحب نے لڑکے والوں کو بلوایا اور لڑکی ساتھ لے جانے کی تلقین کی۔ تب لڑکے کا باپ بولا ''باؤ جی آپ ہی نے تو ہمیں منع کیا تھا کہ یہاں رشتہ نہ کرنا' اب آپ ہی اُن کی طرف داری کر رہے ہیں۔''

یہ سن کر ابا جان طیش میں آ گئے اور کہا ''جب میں نے منع کیا تھا' تو پھر آپ نے رشتہ کیوں کیا؟ اب یہ جیسی بھی ہے تمہاری عزت ہے۔ اگر اسے کوئی گزند پہنچی' تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' اتنا سننے کی دیر تھی کہ وہ چپ چاپ لڑکی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ آج وہ بچی دادی بن چکی۔

چار چیزیں
جنھیں کھانے کے بعد استعمال نہ کیجیے

۱۔ کھانے کے بعد پھل مت کھائیے! کیونکہ پھل آپ کے کھانے کو معدے سے آنتوں میں مقررہ وقت پر پہنچنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ دن میں کسی بھی وقت پھل کھا سکتے ہیں اور خوب کھائیے! موسم کے پھلوں کا استعمال بہرصورت مفید اور نفع بخش ہے۔

۲۔ کھانے کے بعد چائے مت پیجیے! وجہ یہ کہ چائے میں موجود پولی فنالز (PolyPhenols) کا جزو آپ کی غذا میں موجود فولاد کو جزوِ بدن بننے سے روکتا ہے۔ علاوہ ازیں چائے میں موجود تیزابیت کا عنصر غذا کے پروٹین کو ضرر پہنچاتا ہے۔

۳۔ کھانے کے فوراً بعد چہل قدمی مت کیجیے! اس میں کوئی شک نہیں کہ چہل قدمی نظامِ ہضم کے لیے فائدہ مند ہے لیکن اسے کھانے کے فوری بعد شروع نہ کیجیے۔ ایسا کرنے سے ہضم کے قدرتی رس (Juices)، جو معدے کے غدود سے نکلتے ہیں، اپنا کام صحیح طور پر انجام نہیں دے پاتے۔ لہٰذا غذا ہضم ہو کر جزوِ بدن نہیں بن پاتی۔

۴۔ کھانے کے فوراً بعد ہرگز نہ سوئیے۔ کھانے کے فوری بعد سونے سے ہاضمے کے رس معدے سے نکل جاتے ہیں۔ نتیجتاً آپ سینے اور معدے میں جلن محسوس کریں گے۔ منہ کا خشک ہونا بھی اسی بات کی علامت ہے۔ (مرسلہ: ڈاکٹر محمد افضل، اوکاڑہ)

جدت نے ظاہری حسن میں تو اضافہ کر دیا' مگر حقیقی خوبصورتی ''سیرت'' کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ اب پرانی قدروں کا فقدان اور بڑوں کی عزت کا تمسخر اُڑایا جانے لگا اور ہر کسی کا ہدف دولت کا حصول ہی ٹھہرا کہ اسی کو ہر تمنا کا مداوا سمجھا جاتا ہے۔

رزق زمین پہ چھوڑا جائے تو وہ بنا

شیطان کا لقمہ

ایک ناسمجھ عورت کی عبرت آموز کہانی، وہ کفرانِ نعمت کرنے سے بال بال بچ گئی

نا ہید جعفر

گزشتہ رات گھر میں دعوت تھی۔ اب صبح کے وقت پورا گھر میدانِ کارزار کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ خالی پلیٹیں، گلاس، ٹشو پیپر اور مونگ پھلی کے چھلکے پھیلے ہوئے تھے۔ سارہ اپنی ماسی سکینہ کے ساتھ مل کر برتنوں سے نبردآزمائی میں مصروف تھی۔ سکینہ نے میز پر سے پھلوں کے چھلکے اٹھا کر پھینکے، تو کیلے کا ایک چھلکا سارہ کے پاؤں پہ آ گرا۔ اس نے اٹھا کر دیکھا، تو صحیح سالم کیلا تھا۔ سارہ نے حیران ہو کر پوچھا ''تو نے ثابت کیلا کیوں پھینک دیا؟''

''باجی گلا ہوا تھا.....'' اُس نے بے پروائی سے جواب دیا گیا۔

سارہ نے دیکھا، کیلا ایک طرف سے ذرا سا نرم ہو رہا تھا۔ اس نے اُسی وقت چھیل کر کھا لیا اور آہستہ سے بڑبڑائی ''۸۰ روپے درجن کیلوں کے ساتھ یہ سلوک۔ اُف توبہ.....''

آدھے برتن دھونے کے بعد سکینہ نے بریانی کے دیگچے کو للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے ''بھوک'' کا نعرہ لگا دیا۔ سارہ نے اسے بریانی، مرغ کڑاہی، روغنی نان اور پھل ٹرے میں سجا کر دیے۔ سب چیزوں سے اچھی طرح انصاف کرنے کے بعد جب وہ ٹرے سنک میں رکھنے آئی، تو یہ دیکھ کر سارہ کا دماغ بری طرح گھوم گیا کہ بریانی کی آدھی پلیٹ سوندھ کر چھوڑ دی گئی تھی۔ سالن بھی کافی مقدار میں بچا ہوا تھا اور اس میں نان کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ پلیٹ میں لتھڑی سویٹ ڈش بھی بے قدری کی داستان سنا رہی تھی۔ سارہ بے اختیار چیخ پڑی! ''اتنا کھانا پلیٹوں میں کیوں بچایا؟ تجھے ہزار مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ جتنا کھانا چاہیے، الگ برتن میں

نکال لیا کر۔ میرے گھر کا رزق کوڑے میں نہیں جائے گا۔ میرے میاں کی حق حلال کی کمائی اتنی فالتو نہیں کہ اٹھا کر کوڑے میں ڈال دوں۔''

اس مرتبہ بھی ماسی شان بے نیازی سے گویا ہوئی ''باجی! لوگ تو شاپر بھر بھر کر سالن اور گوندھا ہوا آٹا کوڑے کے ڈھیر پر پھینکتے ہیں۔ اگر میں نے تھوڑا سا کھانا پھینک دیا' تو کون سی قیامت آ گئی۔''

ماسی کے خیالات سن کر سارہ نے اپنا سر پکڑ لیا اور دکھ سے سوچا، ہمارے آقائے دو جہاں ﷺ نے تمام عمر رزق کی کیسی مثالی قدر کی کہ دستر خوان پر گرے ٹکڑے تک چن چن کر کھائے اور انگلیوں پر لگے ہوئے ذرات تک کو چاٹ لیا۔ آج آپ ﷺ کی امت کے خوشحال لوگوں کا تو کہنا ہی کیا، مفلس اور بدحال لوگ بھی رزق کو پیروں تلے روند رہے ہیں۔

''کیسے بدتمیز اور نافرمان ہیں یہ...... ''مگر میری بیٹی بھی تو کبھی کبھی کھانا بچا دیتی ہے۔'' اگلے ہی لمحے اس کے ضمیر نے سوال کیا۔ یہ تو چٹی ان پڑھ اور جاہل ہے۔ اس نے کون سا حدیث کی کتابیں پڑھی ہیں جو اسے اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کے بارے میں معلومات ہوں؟ قیامت کے روز ماتحتوں کے بارے میں مالکوں سے پرسش ہوگی' تو میں نے کب اسے تعلیم دی یا کوئی اچھی بات مدلل طریقے سے بتائی ہے جو اس کی کم علمی پر سیخ پا ہو رہی ہوں...... یہ سوچ کر اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے پھر آج اپنا فرض ادا کرنے کا فیصلہ کیا جیسا کہ پیارے نبی ﷺ کا فرمان ہے:

''بلغو عنی ولو آیة.''

''پہنچاتے رہو میری طرف سے خواہ تھوڑی سی بات۔''

''چل اندر آ کر بیٹھ، میں تجھے کھانے کے آداب کے بارے میں بتاؤں۔'' ماسی سکینہ بھی خوشی خوشی ٹھنڈے کمرے میں سکون کا سانس لینے آ گئی۔

سارہ نرمی سے گویا ہوئی ''قرآن مجید کی سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:'' وکلوا واشربوا ولا تسرفوا'' (کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔) اس آیت میں کھانے پینے کی اجازت کے بعد 'لاتسرفوا' یعنی حد سے تجاوز نہ کرنے کی قید اور شرط میں غذا کے استعمال کا ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔

> ہمارے آقائے دو جہاں ﷺ نے تمام عمر رزق کی کیسی مثالی قدر کی کہ دستر خوان پر گرے ٹکڑے تک چن چن کر کھائے اور انگلیوں پر لگے ہوئے ذرات تک کو چاٹ لیا۔

''برتن میں کھانے کا کوئی حصہ رہ جائے، تو اس کو انگلی سے چاٹ کر صاف کر دینا چاہیے۔ اس کی بڑی فضیلت ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایسے شخص کے لیے برتن استغفار کرتا اور کہتا ہے کہ تجھے اللہ تعالیٰ اسی طرح محفوظ رکھے جس طرح تو نے مجھے شیطان سے محفوظ رکھا۔'' (احمد و ترمذی)

سکینہ دلچسپی سے ہمہ تن گوش تھی۔ سارہ نے مزید بات آگے بڑھائی: ''مشہور محدث، ہدیہ بن خالدؒ کو خلیفہ مامون الرشید نے کھانے کی دعوت دی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ ٹکڑے جو دسترخوان پر پڑے ہوئے تھے، محدث اٹھا اٹھا کر کھانے لگے۔ مامون نے حیران ہو کر کہا ''اے شیخ! کیا آپ ابھی سیر نہیں

ہوئے؟"

"انھوں نے فرمایا' میں سیر ہو چکا۔لیکن مجھ سے حماذؓ نے ایک حدیث بیان فرمائی ہے کہ جو شخص دسترخوان پر گرے ہوئے ٹکڑے چن کر کھائے' وہ مفلسی اور فاقہ سے بے خوف ہوجائے گا۔ میں اسی حدیث پر عمل کر رہا ہوں۔"

"یہ سن کر مامون بے حد متاثر ہوا۔اس نے خادم کو اشارہ کیا کہ وہ ایک ہزار دینار رومال میں باندھ کر لائے۔ مامون نے یہ ہدیہ بن خالدؓ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ہدیہ نے فرمایا" یہ اس حدیث پر عمل کی برکت ہے۔"

"اسی طرح حضرت جابرؓ سے روایت ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا "تمھارے ہر کام یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی شیطان تم میں سے ہر ایک کے ساتھ رہتا ہے۔لہٰذا جب (کھانا کھاتے وقت) کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے، تو اسے چاہیے کہ اس کو صاف کر کے کھا لے اور شیطان کے لیے نہ چھوڑے۔ پھر جب کھانے سے فارغ ہو، تو اپنی انگلیوں کو بھی چاٹ لے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ کھانے کے کس حصے میں خاص برکت ہے۔

(صحیح مسلم)

"بعض روایتوں میں آیا ہے کہ کھاتے ہوئے کوئی چیز گر جائے، تو اس کو اٹھا کر کھا لینے سے محتاجی، برص اور کوڑھ کی بیماری سے حفاظت رہتی ہے۔ اولاد حماقت سے محفوظ رہتی ہے اور عافیت عطا کی جاتی ہے۔

(مدارج النبوۃ)

"لہٰذا اگر کھاتے وقت کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے، تو اسے متکبر لوگوں کی طرح نہ چھوڑو بلکہ ضرورت مند اور قدر دان بندے کی طرح اٹھالو۔ اگر نیچے گرنے کی وجہ سے اس پر مٹی لگ جائے' تو صاف کر کے لقمہ کھالو۔ کھانے کے وقت بھی شیطان ساتھ ہوتا ہے۔ اگر گرا ہوا لقمہ چھوڑ دیا جائے، تو وہ شیطان کے حصے میں آئے گا۔"

سکینہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ کہنے لگی "باجی! یہ باتیں تو مجھے معلوم نہیں تھیں۔"

"برتن میں کھانے کا کوئی حصہ رہ جائے، تو اس کو انگلی سے چاٹ کر صاف کر دینا چاہیے۔ اس کی بڑی فضیلت ہے۔

سارہ نے لوہا گرم دیکھ کر مزید چوٹ لگائی "ایک اور نصیحت آموز اور حیرت انگیز قصہ سناؤں جس نے میرے دل پر بھی بڑا اثر کیا۔

"بہت پرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک زمیندار کی فصل ہر سال بہت اچھی ہوتی۔ وہ بڑا خدا ترس تھا۔ اس فصل میں سے غریبوں اور محتاجوں کا برابر حصہ نکالتا۔ مگر پھر بھی دل میں ڈر رہتا کہ نجانے میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو اس بے حساب رزق میں سے پوری طرح فائدہ پہنچاتا بھی ہوں یا نہیں! کہیں ایسا نہ ہو میں اللہ کی پکڑ میں آ جاؤں۔ وہ شخص ایک بزرگ کے پاس گیا اور عرض کیا کہ میں اپنی فصل کا حساب کرتے کرتے اور سنبھالتے سنبھالتے تھک جاتا ہوں۔ ہر وقت فکرمند رہتا ہوں کہ ایسا نہ ہو غریبوں کا حق ادا نہیں کرسکوں۔ آپ کوئی ایسی ترکیب بتا دیں جس سے میری فصل کی پیداوار کم ہو جائے۔

"بزرگ بولے اس مرتبہ ایسا کرو کہ مکئی کی ایک روٹی پکواؤ۔ جب وہ ٹھنڈی ہو جائے، تو اپنی زمین پر جاؤ اور چلتے چلتے گھوڑے پر بیٹھ کر یہ روٹی کھانا۔

"اگلے سال وہ آدمی بزرگ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا اور بولا کہ حضرت اس مرتبہ تو میری فصل پہلے سے بھی زیادہ ہوئی ہے۔

بزرگ نے پوچھا، میں نے تمھیں جو عمل بتایا تھا وہ تم نے کس طرح کیا؟ اس نے کہا، حضرت! میں نے مکئی کی روٹی گھوڑے پر بیٹھ کر کھانی شروع کی۔ جب روٹی کا کوئی ٹکڑا نیچے گرتا، میں گھوڑا روک کر اُترتا اور اُسے اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا۔ آگے چلتا۔ پھر کوئی ٹکڑا گرتا، میں پھر اتر کر اسے اٹھا کر کھاتا اور پھر آگے بڑھتا۔ اس طرح میں نے بڑی دیر بعد وہ روٹی ختم کی۔

"بزرگ نے فرمایا، تو اللہ کے رزق کی اتنی قدر کرتا ہے۔ اللہ تیرا رزق کم کر ہی نہیں سکتا۔"

"اس قصے سے یہ بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ کی نعمتوں کی قدر دانی اور عزت کرنے سے ان میں اضافہ ہوتا ہے۔ جبکہ بے قدری و پامالی کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے اور ان میں کمی آتی ہے۔ اگر ہم کسی کا دیا تحفہ فالتو سمجھ کر کوڑے میں پھینک دیں، تو وہ آئندہ ساری زندگی ہمیں کبھی دوبارہ تحفہ نہیں دے گا۔ مگر اللہ تو ایسا غفور الرحیم ہے کہ ہم روزانہ اپنے گھر کے بچے ہوئے سالن، روٹی اور دوسرا رزق بیکار سمجھ کر کوڑے میں پھینک دیتے ہیں۔ وہ پھر بھی اگلے دن اسی طرح بے شمار اور مزیدار نعمتیں عطا کر دیتا ہے اور ہم سے کچھ بھی چھینتا نہیں۔"

"بات ختم ہوتے ہی سکینہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کا چہرہ بدلتے خیالات کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ احساس شرمندگی سے چور لہجے میں بولی:

"باہ! باجی، مجھے تو ان باتوں کا پتا ہی نہیں تھا۔ نہ مجھے خود پڑھنا آتا ہے نہ کسی نے کبھی رسول اللہ ﷺ کی پیاری باتیں پڑھ کر سنائیں۔ ہم جاہل لوگ تو آپ ﷺ کی کسی سنت پر عمل نہیں کرتے۔ الٹا رزق کی بہت ناقدری کرتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ہم ساری عمر فاقہ کشی ہی میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے، آج آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اب تو یہ سب باتیں میں اپنے بچوں اور سارے خاندان والوں کو بھی بتاؤں گی۔"

وہ پھر توبہ توبہ کرتی ہوئی اٹھ کر کام میں لگ گئی۔ اور سارہ یہ سوچ کر کہ اس نے محبوبِ خدا کی ایک امتی کو گمراہی سے بچا لیا، دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔

(بشکریہ: ماہنامہ عفت' راولپنڈی)

دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی

دنیا کی سب سے پہلی اسلامی یونیورسٹی مراکش کے شہر فارس میں ۸۵۹ء میں قائم ہوئی۔ محمد بن عبداللہ فہری نے یہ یونیورسٹی بنانے کا حکم دیا۔ موت نے انھیں مہلت نہ دی، مگر ان کی بیٹیوں، فاطمہ اور مریم نے اپنے والد کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے یونیورسٹی مکمل کروائی۔

یونیورسٹی میں ایک جامع مسجد کے علاوہ فقہ اور دوسرے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ جن کے لیے بہت سی عمارتیں بنائی گئیں اور اس یونیورسٹی کو مدینة العلم کا نام دیا گیا۔

(امیر حمزہ بن مشتاق احمد، وار برٹن)

پاکستان میں مقبول ترین سوشل نیٹ ورک سائٹ

فیس بک کے بارہ راز

یہ راز جان کر آپ مثبت انداز میں فیس بک پر اپنی مقبولیت میں اضافہ کر سکتے ہیں

علمدار حسین

ہماری زندگی میں سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس کا عمل دخل خاصا بڑھ چکا۔ آج لاکھوں پاکستانی اپنی ہر چھوٹی بڑی بات ان ویب سائٹس کے ذریعے دوسروں سے شیئر کرتے ہیں۔ کوئی بھی تقریب ہو، اس کا احوال اور تصاویر جب تک فیس بک وغیرہ کے ذریعے دوسروں تک نہ پہنچا دیں، انھیں چین نہیں آتا۔ یہ چونکہ مقبول ترین سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ ہے، اس لیے وہاں ایک کروڑ سے زائد پاکستانی تصاویر و اسٹیٹس اپ ڈیٹ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

درحقیقت فیس بک ان کی زندگی کا لازمی جزو بن چکی۔ اس کے ذریعے نہ صرف دوستیاں، رشتے داریاں بڑھ رہی ہیں بلکہ دشمنیاں بھی پیدا ہو چکیں۔ اس لیے فیس بک بہتر طور پر استعمال کرنے کے ہمیں کچھ آداب معلوم ہونے چاہئیں۔ ضروری نہیں کہ ہر کوئی ان آداب کو ملحوظِ خاطر رکھے، یا ان سے اتفاق کرے۔ لیکن انھیں پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو گا، اگر اُسے استعمال کرتے ہوئے ان باتوں کا خیال رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

ذاتی باتیں پیغامات تک محدود رکھیں

اپنے کسی دوست کے بارے میں کوئی ذاتی بات اپنی یا اس کی وال پر لکھنے کے بجائے پیغام کی صورت بھیجیے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے لیے تو وہ بات اتنی اہم نہ ہو لیکن شاید

دوست اسے سب کے سامنے پیش کرنا پسند نہ کرے۔ اس لیے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیتے ہوئے پہلے ذاتی پیغام میں ایک دوسرے سے بات کیجیے۔ فیس بک ایک عوامی پلیٹ فارم ہے، اگر آپ نے کوئی ایسی ویسی ذاتی بات لکھ دی تو آپ کو اندازہ نہیں، وہ کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔

پہلے تولو پھر بولو

فیس بک پر عموماً ہر کوئی سیکڑوں دوست رکھتا ہے۔ اسے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کبھی دوست کس قسم کے مذہبی و سیاسی خیالات رکھتے ہیں۔ اس لیے کچھ شیئر کرنے سے پہلے ایک دفعہ سوچ لیں کہ کہیں آپ کسی کی دل آزاری تو نہیں کر رہے۔ مثلاً آپ کسی مذہبی تہوار، کسی سیاسی جماعت یا کسی بھی حوالے سے کوئی منفی بات کرتے ہیں جو آپ کی نظر میں شیئر کرنا غلط بات نہیں۔ لیکن جب کوئی متضاد رائے رکھنے والا اس بات کو اپنی فیڈ میں دیکھے تو قدرتاً اسے اچھا نہیں لگے گا۔ اس لیے کچھ بھی شیئر کرنے سے پہلے ایک دفعہ ٹھنڈے دماغ سے سوچ لینا بہتر ہے۔

فیس بک رابطے اور میل جول کا ایک اچھا ذریعہ ہے، اسے مثبت کاموں کے لیے استعمال کریں۔ دوسروں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے متنازع باتیں مت شیئر کیجیے۔ ہوسکتا ہے، آپ کی اپنی سوچ بدل جائے۔ تب آپ کو احساس ہوگا کہ غلط چیز شیئر ہوگئی۔ آپ پوسٹ ڈیلیٹ تو کر سکتے ہیں لیکن تب تک دوسرے آپ سے بدگمان ہو چکے ہوں گے۔

ذاتی خبریں فون کے ذریعے دیجیے

خوشی یا غم کی کوئی ذاتی خبر ہے، تو اپنے قریبی دوستوں کو بذریعہ فون یا ایس ایم ایس دیں۔ یہ بات صرف فیس بک کے دائرہ آداب میں نہیں آتی بلکہ ہماری عام زندگی میں بھی رائج ہونی چاہیے۔ خاص کر دوسروں کے بارے میں ذاتی خبریں شیئر نہ کریں کیونکہ یہ امر بعض اوقات دشمنی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ سنی سنائی خبریں، جن کے مستند ہونے کا آپ کو علم نہیں ہو، فوراً شیئر کرنے سے پہلے فون پر تصدیق ضرور کر لیں۔

تبصروں کا جواب دیں

آپ نے اپنی وال پر کچھ چیز لگائی، تو دوست اسے پسند یا اس پر تبصرہ کرتے ہیں۔ آپ بھی جوابی تبصرہ کیجیے۔ ان کے تبصرے کو پسند کر کے بتا سکتے ہیں کہ آپ نے ان کی ایکٹیویٹی کو نوٹ کیا۔ اپنے اسٹیٹس پر خاص کر سوالیہ تبصروں کا ضرور جواب دیں۔ اگر آپ ہمیشہ دوسروں کے تبصرے اور پسند نظر انداز کرتے رہیں، تو ان میں کمی آتی جائے گی۔ یاد رکھیں، کوئی بھی "دیواروں سے باتیں کرنا پسند نہیں کرتا۔"

ہر پوسٹ پر تبصرے سے گریز کیجیے

اگر آپ کا کوئی بہت اچھا دوست ہے، تو اپنی دوستی ظاہر کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ آپ اس کی ہر پوسٹ کو پسند یا اس پر تبصرہ کریں۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ آپ ہر پوسٹ بنا پڑھے ہی پسند کیے جاتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں، تو ہر پوسٹ پسند کر سکتے ہیں، لیکن کبھی کبھی کسی بات کو نظر انداز کر دینا بھی اچھا ہے۔ کیونکہ دوسرے آپ کی یہ عادت نوٹ کرتے ہیں کہ آپ فلاں بندے کی ہر پوسٹ کو باقاعدگی سے پسند کر رہے ہیں۔

اپنے لہجے کا خیال رکھیے

پڑھنے اور بولی ہوئی بات سننے میں بہت فرق ہے۔ جیسے آپ کوئی بات کریں اور کوئی دوسرا سننے والا جب تیسرے کو بتائے، تو بات میں فرق آ سکتا ہے۔ یہ فرق ہوتا ہے لہجے کا، یعنی تیسرے نے چونکہ براہ راست بات آپ سے نہیں سنی اس لیے اسے نہیں پتا کہ آپ کا لہجہ کیسا تھا۔ اسی طرح فیس بک پر اسٹیٹس اپ ڈیٹ کرتے

ہوئے یہ بات دھیان میں رکھیں کہ آپ کا لہجہ مناسب ہو۔ پڑھنے والا اسے کسی بھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ چونکہ ہر کوئی ٹائپ کرنے کا انداز مختلف رکھتا ہے، لہٰذا کچھ لکھتے ہوئے خیال رکھیں کہ کوئی اس کا غلط مطلب نہ نکال لے۔

سادہ الفاظ میں ہلکی پھلکی اور خوشگوار باتوں کو اپنا فیس بک اسٹیٹس بنائیں۔ جملے کے آخر میں موجود ایک مسکراہٹ بھی اچھا اثر ڈالتی ہے۔ مشہور کہاوت ہے ''مسکرائیے... دنیا آپ کے ساتھ مسکرائے گی۔''

اجنبی لوگوں کو دوستی کی درخواست مت بھیجیے

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ فیس بک پر زیادہ سے زیادہ دوست ہونا ان کی شہرت کا ثبوت ہے۔ اگر آپ کے لاتعداد دوست ہیں، تو یہ بات ٹھیک ہے۔ لیکن دوست حقیقی ہونے چاہئیں۔ ایسے لوگ نہ ہوں جنھیں آپ جانتے بھی نہیں، بس فیس بک پر کہیں نظر آئے اور آپ نے انھیں ایڈ کرلیا۔

دُور کی جان پہچان والے یا ایسے لوگ جن کے متعلق آپ جاننا چاہتے ہوں، انھیں ایڈ کرنے میں کوئی بُرائی نہیں، لیکن اجنبی لوگوں اور خاص کر بڑی تعداد میں اجنبیوں کو ایڈ کرنا کسی بھی طرح آپ کی شہرت ثابت نہیں کرتا، بلکہ یہ آپ کی پروفائل پر منفی اثر ڈال سکتا ہے۔

دوسروں کی بُری تصاویر مت شیئر کیجیے

موبائل کے ذریعے اب کیمرا ہر وقت ہمارے ہاتھ میں رہنے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے، ہمارے اندر کا فوٹو گرافر ہر اہم لمحے کو کیمرے میں قید کرنے کو بے تاب رہتا ہے۔ ایسے میں دوست احباب کی کئی نازیبا یا بُرے پوز میں تصویریں بن جاتی ہیں۔ ایسی تصاویر ہنسی مذاق کی حد تک صحیح ہیں، لیکن انھیں فیس بک پر شیئر کرنا کسی طرح موزوں نہیں۔ ایسی تصویر شیئر کر کے دوست کو ٹیگ کرنا اور زیادہ بُرا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس طرح وہ تصویریں دوستوں اور خاندان تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ یوں وہ نہ صرف مذاق کا نشانہ بنتا ہے بلکہ اس کے خاندان والے بُرا بھی مان سکتے ہیں۔

ذاتی تشہیر مت کریں

اپنی نیوز فیڈ دیکھتے ہوئے آپ کو کسی دوست کی کافی پوسٹس نظر آتی ہیں اور بار بار۔ کچھ لوگ خودنمائی بہت پسند کرتے اور اپنی ذات سے وابستہ ہر بات دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ مثلاً میں فلاں ہوٹل میں ہوں، کھانا بہت اچھا ہے، فلاں میرے ساتھ ہے، اب ہم سنیما جا رہے ہیں۔ ہر دس پندرہ منٹ بعد ایک نئی پوسٹ دیکھتے ہوئے آپ عاجز آتے اور آخرکار اس دوست کی تمام پوسٹس ہائیڈ کر دیتے ہیں۔

اگر آپ دوسروں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں، تو کوئی آپ کے ساتھ بھی ایسا کر سکتا ہے لیکن اسی صورت میں کہ آپ بھی تواتر سے پوسٹیں کریں۔ یہ کوئی غلط بات نہیں لیکن انسانی مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ پڑھنے والے ضروری نہیں کہ آپ کی ہر پوسٹ سے لطف اندوز ہوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ایسا کچھ شیئر کریں کہ سب اس میں دلچسپی لیں۔

چین پوسٹس

آپ نے فیس بک پر یقیناً چین پوسٹیں دیکھی ہوں گی یعنی ایسی پوسٹیں جو بے شمار لوگ شیئر کر چکے۔ آپ کو بھی اسے شیئر کرنے کی تلقین یا درخواست کی جاتی ہے۔ بعض پوسٹوں کے ساتھ تو یہ تنبیہہ ہوتی ہے کہ اگر آپ نے اسے شیئر نہ کیا، تو نقصان اُٹھائیں گے۔ بعض پوسٹوں

کے پیچھے کوئی رضا کارانہ مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔ بعض ثواب کے لیے شیئر کی جاتی ہیں۔ زیادہ تر کے پیچھے کوئی تشہیری عمل کارفرما ہوتا ہے۔ اگرچہ اس امر میں بھی کوئی برائی نہیں لیکن بعض اوقات بار بار ایسی پوسٹس شیئر کرنے سے کوئی دوسرا آپ سے بے زار ہو سکتا ہے۔

دوسروں کی رائے کا احترام کیجیے

انٹرنیٹ کی دنیا میں ہر کوئی آزاد ہے۔ ہر انسان اپنی الگ رائے رکھتا ہے۔ اس لیے فیس بک پر اپنی رائے کا اظہار کرنے میں سبھی آزاد ہیں۔ دوسروں کی کسی بات سے اگر آپ اتفاق نہ کریں، تو انھیں صحیح راہ پر لانے کے لیے خدائی فوجدار بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کسی امر سے متفق نہیں، تو کوئی بات نہیں، اختلاف نظرانداز کر کے آگے بڑھ جائیے۔ جذبات میں آ کر اُلجھنا آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دوسروں کے لیے بدگمانی مت پالیے۔

ایک چھوٹی سی بات پر اگر آپ کسی دوست سے اُلجھ جاتے ہیں، تو کچھ دن بعد وہ ایسی پوسٹ بھی لگا سکتا ہے جس سے آپ متفق ہوں۔ پھر آپ اس کی تائید کرنے میں ہچکچائیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں۔ ہمیشہ دل بڑا رکھیں اور اگر کسی کی کوئی بات پسند نہ آئے، تو فوراً جتلانے کے بجائے درگزر کر دیں۔ غصہ ویسے بھی حرام ہے۔ اس لیے ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ کے اندر جتنی بھی برداشت ہے، اسے آزمانے کے لیے فیس بک استعمال کریں اور ناپسندیدہ پوسٹوں سے درگزر کرتے جائیں۔ جب لوگ کوئی اچھی چیز پوسٹ کریں، تو اسے پسند کر کے ان کی تعریف کریں۔ دیکھیے گا اس عمل سے نہ صرف آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہو گا بلکہ آپ خود بھی اچھا محسوس کریں گے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ دوست کے دوست سے تبصروں میں جنگ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح بیچ والا دوست بلاوجہ پریشانی اُٹھاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ چھڑنے والی بحث میں آپ ہر تبصرے کا فوراً جواب دیں۔ بعض اوقات بحث و مباحثے سے فرار اس بحث کو وہیں ختم کر سکتا ہے۔ ورنہ بہتر تو یہی ہے کہ شائستگی کا دامن تھامے رکھیں۔ اگر کوئی آپ سے متفق نہیں ہو رہا، تو معذرت کرتے ہوئے گفتگو سے الگ ہو جائیں۔ کیونکہ تمام بحث دیگر لوگوں تک بھی پہنچتی ہے اور لوگ آپ کے متعلق منفی رائے پال سکتے ہیں۔

پرائیویسی سیٹنگز

اپنے فیس بک اکاؤنٹ کی پرائیویسی سیٹنگز ضرور چیک کریں۔ قریبی دوستوں کے علاوہ رشتے دار، جان پہچان کے لوگ اور دفتر کے ساتھی بھی فیس بک پر ایڈ ہوتے ہیں۔ اس لیے کچھ بھی شیئر کرنے سے پہلے دھیان رکھیں کہ آپ کی پوسٹ کن کن لوگوں تک پہنچے گی۔ بہتر ہے کہ دوستوں کے مختلف گروپس بنا لیں۔ اگر کوئی بات صرف رشتے داروں سے شیئر کرنے والی ہے تو صرف فیملی کے لیے پوسٹ کریں۔ جو دوستوں سے شیئر کرنے والی بات ہو، اسے دوستوں سے کریں۔ اگر عام سی کوئی بات ہے جسے آپ سب سے شیئر کرنا چاہتے ہیں، تو پوسٹ کرتے وقت پبلک بھی منتخب کر سکتے ہیں۔

اختتامیہ

ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ ان تمام ہدایات پر سختی سے کاربند ہو کر فیس بک سے لطف اندوز ہونا ہی چھوڑ دیں۔ دراصل فیس بک ایک دو دھاری تلوار ہے، اسے احتیاط سے استعمال کرنا ہی عقلمندی کا تقاضا ہے۔

◆◆●

دیانت داری کا سبق پڑھتے ہوئے

جب آئی جی نے پیاز چرایا

ایک پولیس افسر کے قلم سے جدوجہد زندگی میں درست راہ دکھلانے والے قیمتی مشورے

سردار احمد چودھری

آپ بیتی

جن دنوں ہم لاہور کے قریب مراکہ میں قیام پذیر تھے، تو ہمارے شب و روز بڑی تنگ دستی میں کٹ رہے تھے۔ اس وقت بھی ہماری والدہ زمین پر گرا ہوا بیر تک اُٹھانا پسند نہ کرتیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ بیر کا درخت کسی اور کی ملکیت ہے۔ اس لیے وہ کسی کا بیر کھانے کے بجائے بھوکا رہنے کو ترجیح دیتیں۔ میری والدہ ہمیشہ سچائی اور اخلاقی اقدار پر زور دیتی تھیں۔ وہ ہمیں ہر وقت نصیحت کیا کرتیں:

''کسی کی چیز مت چراؤ'
ہرگز جھوٹ نہ بولو۔''

انھوں نے زندگی بھر اس منشور پر عمل کیا اور ہماری زندگی پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مراکہ میں دورانِ قیام ایک دن میں نے ایک کھیت میں سے کچا پیاز اُکھاڑ لیا۔ پیاز چوری چوری اُکھاڑتے وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے اور ساری دنیا مجھے دیکھ رہی ہے۔ دیانت داری کی قدر و قیمت میرے ذہن میں اس طرح نقش کر دی گئی تھی کہ معمولی سی چوری کرنے پر مجھے شدید بخار چڑھ گیا اور میں کئی دن پریشان رہا۔

ایسے غریبانہ لیکن اخلاقی لحاظ سے بلند ماحول میں آنکھ کھولنے کی بنا پر میں زندگی بھر سخت جدوجہد کرنے سے کبھی نہیں ہچکچایا۔ اپنے ماضی

پرنظر ڈالوں، تو ایسا لگتا ہے کہ مجھے میری محنت کا بہت اچھا صلہ مل چکا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے جس کی بدولت ایک بندۂ ناچیز بلند مرتبہ عہدوں پر فائز ہوا۔

اسکول میں داخلہ

میرے والدین مجھے اسکول میں داخل کرانے کے خواہش مند تھے۔ چناں چہ میں نے ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی اسکول، ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پانچویں جماعت میں داخلہ لیا۔ میں نے وہاں بہت اچھی کارکردگی دکھائی اور اپنی جماعت کے بہترین طلبہ میں شمار ہونے لگا۔

ہمارے اسکول کی عمارت انتہائی خستہ تھی۔ اس میں فرنیچر تھا' نہ ٹاٹ اور چٹائیاں۔ کوئی لیبارٹری تھی نہ بیت الخلا۔ عمارت بجائے خود ناکافی تھی۔ ہم سردیوں میں کھلے میدان میں فرش پر اور شدید گرمیوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

مادی وسائل کی کم یابی اور دیگر مشکلات کے باوجود اساتذہ کا شخصی کردار اور اپنے فرض سے لگن قابلِ تعریف تھی۔ وہ وقت کے پابند انتہائی دیانت دار اور اصول پسند تھے۔ جماعت میں نقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ناجائز شخصی فائدہ اُٹھانے کی بابت سوچنے کا تصور ہی نہیں تھا کیونکہ اخلاق اقدار بڑی مضبوط تھیں اور لوگ ملک کے بارے میں مخلصانہ سوچ رکھتے تھے۔ طلبہ کے دلوں میں بھی اعلیٰ خیالات موجزن رہتے اور وہ اچھے پاکستانی بننے کے لیے سخت محنت کرتے تھے۔

مثالی اُستاد...... شیخ غلام قادر

اسکول کا ماحول شرپسند عناصر کو اپنا کھیل کھیلنے کی اجازت نہ دیتا۔ ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک کے دوران ایک طالب علم نے غالباً کسی بیرونی آدمی کی شہ پر یہ افواہ پھیلانے کی کوشش کی کہ ہمارا ہیڈ ماسٹر قادیانی ہے۔ اسکول کے ہر آدمی نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور شرارت کامیاب نہ ہو سکی۔

ہمارے ایک مثالی استاد شیخ غلام قادر تھے جو ہمیں انگریزی پڑھاتے۔ وہ چھٹی کے بعد بھی ہمیں روک لیتے۔ وہ منتخب طلبہ کو اینگلوورنیکلر فائنل امتحان کی تیاری کراتے تاکہ وظیفہ کے امتحان میں کامیاب ہو کر اسکول کا نام روشن کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے وہ چھٹیوں کے دوران بھی ہمیں اپنے گھر پڑھاتے تھے۔ ٹیوشن فیس لینے کے بجائے وہ ہمیں کھانا بھی کھلاتے۔

ماسٹر غلام قادر بڑے فرض شناس اور مخلص تھے۔ ایک صبح ہم پڑھنے کے لیے ان کے گھر پہنچے' تو یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ ان کی صاحبزادی فوت ہو گئی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ کم از کم آج پڑھائی نہیں ہو گی اور ماسٹر صاحب چھٹی کریں گے۔ لیکن ہماری سوچ غلط نکلی۔ وہ قبرستان سے واپس آ کر حسبِ معمول ہمیں پڑھانے لگے اور اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

میں ایک اچھا مقرر تھا، اس لیے مختلف تقریبات کے موقع پر میری ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی۔ مجھے تقریر کرنے کا فن اُستاد غلام قادر نے ہی سکھایا تھا۔ ایک بار انھوں نے ۱۵ صفحات پر مشتمل تقریر لکھی اور ساتویں جماعت کے پانچ طالب علموں کو یاد کرنے کے لیے دی۔ انھوں نے ہمیں کہا ''باہر کھیتوں میں نکل جاؤ۔ وہاں فصلوں اور درختوں کو سامعین تصور کر کے ان سے خطاب کرو۔'' یہ نصیحت بھی کی کہ سامعین سے ہرگز خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ لوگوں کا ہجوم کچھ نہیں سوچتا، وہ صرف سننے کے لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی قطعاً پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے' تو وہ ہرگز نہیں پکڑ سکتے۔ خود کو ان

سے برتر اور تقریب کا اصل روح رواں سمجھنا چاہیے۔''

میں نے ان کی باتوں پر حرف بحرف عمل کیا۔ میں کھیتوں میں چلا گیا اور درختوں کو مخاطب کر کے بلند آواز سے تقریر کرنے لگا۔ یوں تھوڑی سی دیر میں پورے پندرہ صفحے یاد کر لیے۔ اگلے دن ماسٹر صاحب نے پہلا صفحہ سنانے کو کہا تو میں نے پوری تقریر سنا دی جس کے دوران صرف ایک غلطی ہوئی۔ وہ بڑے حیران ہوئے اور مجھے جینیئس (نابغۂ عصر) قرار دیا۔ مجھے اس لفظ کے معنی نہیں آتے تھے، نہ ہی ان سے پوچھنے کی ہمت تھی۔ دوسرے روز میرے ہم جماعت راجا رفیق نے بتایا کہ 'جینیئس' کے معنی ہیں 'شیطان' تو مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس وقت اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔

مارشل لا کے خلاف تقریر

ان دنوں ۱۴/ اگست ہر جگہ بڑی دھوم دھام اور جوش وخروش سے منایا جاتا۔ آزادی کی اہمیت کے موضوع پر ایمان افروز تقاریر ہوتیں۔ میں طلبہ کے پسندیدہ مقررین میں سے ایک تھا۔ پاکستان پر یقین ہی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ ہم اس عزم کا پرزور الفاظ میں اعلان کرتے کہ وطن عزیز کو ایک مضبوط اور خوشحال ملک بنائیں گے۔ یہ اتنی بڑی حقیقت تھی کہ انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں رہتے ہوئے بھی میں اسے واضح طور پر محسوس کیا کرتا۔

لیکن ۱۹۵۸ء میں نفاذِ مارشل لا کے بعد ایمان و ایقان سے بھرپور وہ جذبہ اچانک ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اگلے سال یعنی ۱۴/ اگست ۱۹۵۹ء کو میں نے لوگوں کو اداس، افسردہ اور اپنے دلی خیالات کے اظہار سے گریزاں پایا۔

میں نے اپنی تقریر میں مارشل لا کو بدترین اقدام قرار دیا جس نے ہماری آزادی سلب کر لی جو ہم نے بڑی جدوجہد سے حاصل کی تھی۔ لوگوں نے زوردار تالیاں بجائیں اور بعد میں مجھے کندھوں پر اُٹھا کر پورے بازار میں جلوس نکالا۔ شاید یہ چیز مقامی انتظامیہ کو ناگوار گزری۔ چناں چہ جونہی جلوس ختم ہوا، پولیس نے میری خوب ٹھکائی کی۔ شاید وہ مجھے جیل بھیج دیتے لیکن شہر کے ایس ڈی ایم، جناب کے ایم اے صمدانی نے جن کے زیرِصدارت جلسہ ہوا تھا، مداخلت کر کے میری گلوخلاصی کر دی۔ صمدانی صاحب بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں یومِ آزادی منانے پر پابندی لگا دی گئی۔

ان دنوں یومِ آزادی پر والی بال ٹورنامنٹ دوسرا اہم واقعہ ہوا کرتا تھا۔ ملک بھر کی منتخب ٹیمیں تین روزہ ٹورنامنٹ میں حصہ لینے ٹوبہ ٹیک سنگھ آتیں۔ وہ بڑا ہیجان خیز ٹورنامنٹ ہوتا۔ اس دور کے نمایاں افراد میں میاں عبدالخالق، چودھری زمان، چودھری عبدالحمید اور عبدالکریم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پولیس میں بھرتی ہونے کے بعد پتا چلا کہ ان میں سے میاں عبدالخالق کے سوا سب پولیس کے کھلاڑی تھے۔ ٹورنامنٹ نے والی بال سے میری دلچسپی میں اضافہ کیا اور میں بہت اچھا کھیلنے لگا۔

ترقی پر حسد نہ کر

۱۹۵۲ء میں وظیفہ کے امتحان کے لیے اُستاد غلام قادر نے جن چار طلبہ کا انتخاب کیا، ان میں راشد ضیا اور راجا رفیق کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ راشد اپنے گاؤں سے میرے پاس آ گیا تاکہ ہم مل کر تیاری کر سکیں۔ ایک دن ضیا کو حساب کے بعض سوالات حل کرنے میں دقت محسوس ہوئی تو اس نے مجھ سے مدد مانگی۔ میں نے پورا دن اس کے ساتھ گزارا اور اسے مشکل سوال حل کرنے کا طریقہ سمجھایا۔ وہ بہت خوش ہوا اور میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔

جب ضیا چلا گیا' تو راشد نے مجھ سے کہا"آپ نے اس کی مدد کیوں کی؟"

"کیونکہ وہ ہمارا ہم جماعت اور دوست ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن وہ ہمارا حریف بھی تو ہے۔" راشد نے قدرے غصہ سے کہا۔"تمہاری مدد کی بدولت وہ زیادہ نمبر حاصل کر کے ہمیں شکست دے سکتا ہے۔ مجھے تم نرے "بدھو" لگتے ہو۔"

اس کے ان جملوں پر مجھے زبردست افسوس ہوا۔ میں نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا: "نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے' ہمیں کسی کی ترقی پر حسد نہیں کرنا چاہیے۔"

ان دنوں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بجلی نہیں تھی۔ ہم لالٹین کی روشنی میں تیاری کیا کرتے۔ میں نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: "علم اس لالٹین کے مانند ہے۔ اگر آپ اس سے دوسری لالٹین روشن کر لیں' تو اس کی روشنی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔"

میں نے راشد کو یہ بھی بتایا کہ قرآن پاک نے ہمیں بتایا ہے: "ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے' اپنے فضل سے نواز دیتا ہے۔" بہرحال راشد میری وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا۔

جب نتیجہ نکلا' تو میں اسکول میں اوّل آیا۔ ہمارے واجب الاحترام ہیڈماسٹر جناب حبیب احمد خاں کے بقول میں نے اسکول کے قیام سے اس وقت تک ۲۶ر سال کی مدت میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے۔

بعدازاں ضیا فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس کے متعلق آخری بار سننے میں آیا کہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا بریگیڈیئر بن چکا۔ راشد گورنمنٹ کالج لاہور میں لیبارٹری اسسٹنٹ بنا اور اب بھی وہیں کام کر رہا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اُس کا سب سے بڑا بیٹا ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے۔

چند دنوں بعد علاقے کے نئے تحصیلدار، شیخ محمد اسلم نے اپنے عہدے کا چارج سنبھالا' تو وہ میرے والدین کو مبارکباد دینے ہمارے گھر آئے۔ انھوں نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھارت میں متروکہ اراضی کے عوض ہمیں کچھ زرعی زمین بھی الاٹ کر دی۔ انھوں نے والد کو میرے متعلق یہ کہہ کر ان کا حوصلہ بڑھایا "پاکستان کو سردار محمد جیسے لائق نوجوانوں کی ضرورت ہے۔"

مرحوم آئی جی پنجاب، سردار احمد چودھری

تحصیلدار صاحب نے مجھے ترغیب دی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لارنس کالج گھوڑا گلی میں داخلہ لوں۔ مجھے مذکورہ کالج میں حصولِ تعلیم کی خاطر ۷۵ر روپے ماہوار وظیفہ مل گیا تھا۔ تاہم شہر کے معروف تاجر' شیخ محمد یوسف نے مشورہ دیا کہ میں خود کو اس ادارے کے امیر اور شہری لڑکوں میں ذہنی طور پر ہم آہنگ نہیں کر سکوں گا۔ ممکن ہے احساسِ کہتری کا شکار ہو جاؤں۔ اس لیے اپنے معیار کے کسی دوسرے کالج میں داخلہ لوں۔ میں نے ان کے مشورے پر جو سو فیصد درست اور برمحل تھا' عمل کیا اور لارنس کالج میں داخلہ لینے کا ارادہ ترک کر دیا۔

(جناب سردار احمد چودھری کی آپ بیتی، "جہانِ حیرت" کا ایک باب)

تاریخ کے جھروکوں سے
حیرت انگیز انکشافات سے بھرپور تحقیق
ٹائی ٹینک جو کبھی نہیں ڈوبا
صاحب مضمون شواہد سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ۱۴/اپریل ۱۹۱۲ء کی شب برفانی تودے سے ٹکرا کر ٹائی ٹینک نہیں اسی کمپنی کا دوسرا جہاز، اولمپک ڈوبا تھا.... قارئین کے لیے تحفۂ خاص
ٹموتھی سپیئرمین/حسن بی بی

۱۵/ اپریل ۱۹۱۲ء کو امریکی وہائٹ اسٹار لائن کمپنی کا تیار کردہ دیوہیکل بحری جہاز، ٹائی ٹینک جس کے بارے میں اس کے مالک، سرمایہ کار جے پی مورگن نے یہ کامیاب تشہیری مہم چلائی تھی کہ یہ کبھی نہ ڈوبنے والا جہاز ہے، وائے بدنصیبی اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی بحراوقیانوس کی گہری و تاریک لہروں کی نذر ہو گیا۔

مگر اس سانحے کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ اسرار کی ایک مبہم دھند اس کے گرد احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دبے لفظوں میں کہا جاتا ہے کہ یہ حادثہ کسی سازش کا نتیجہ تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اتنا بڑا حادثہ بھلا سازش کیسے ہوسکتا ہے جس میں ۱۵۰۰ سے زائد انسان ہلاک ہوئے؟ کون کرسکتا ہے یہ سب کچھ اور کیوں؟ یہ سوالات عجیب قسم کی سنسنی خیزی، پُراسراریت، تجسس اور تشنگی کو جنم دیتے ہیں جس کی تشفی کے لیے مہم جو افراد نے بحراوقیانوس کی گہرائیوں میں غواصی بھی کی۔

نتیجے میں کئی چونکا دینے والے شواہد سامنے آئے۔ مثلاً یہ کہ سمندر کی گہرائی میں جس جہاز کا ملبہ پڑا ہے، اس کے سامان میں سے کسی بھی چیز کا تعلق ٹائی ٹینک سے ثابت نہ ہو سکا۔ تو کیا بحراوقیانوس کی گہرائی میں پڑا تباہ شدہ جہاز دراصل ٹائی ٹینک نہیں بلکہ کوئی اور ہے؟ کیسے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ذہن یہ ماننے کو تیار ہی نہیں۔ یہ محض افسانوی داستان لگتی ہے مگر کبھی کبھی حقیقت داستانوں سے زیادہ رنگین اور پُراسرار ہوتی ہے۔

ٹائی ٹینک کی تباہی انسانی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش المیہ ہے۔ اس ہمہ گیر صدمے کے سحر سے گزشتہ ایک سو برس کے دوران نکلا نہیں جا سکا۔ تاہم ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو جہاز کا ملبہ بیچ کر دولت کمانا چاہتے تھے۔

اس مقصد کے لیے کئی ٹیمیں بحراوقیانوس کی تہ میں اُتریں۔ تاہم ایک شخص، رابرٹ بیلارڈ نے خالص تحقیقاتی مقاصد کے لیے تربیت یافتہ ٹیم اور روبوٹ کیمروں کی مدد سے جہاز کا جائزہ لیا تو کئی چونکا دینے والے حقائق سامنے آئے۔ مثلاً یہ کہ جہاز کے نام کی تختی سرے سے غائب تھی۔ جبکہ سامان میں سے بالشت بھر ایسی چیز نہ مل سکی جس کا تعلق ٹائی ٹینک کے ساتھ جوڑا جا سکے۔

یہ حقائق ان افواہوں کو تقویت پہنچاتے ہیں جن کے مطابق بحراوقیانوس کی گہرائیوں میں پڑا ہوا جہاز ٹائی ٹینک نہیں بلکہ تقریباً اسی جسامت اور شکل و صورت کا دوسرا جہاز ''اولمپک'' ہے۔ اس جہاز نے ٹائی ٹینک کی تیاری سے قبل متواتر بحراوقیانوس کے آر پار امریکا تک سفر کیے تھے۔ مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ بحراوقیانوس کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑا تباہ شدہ جہاز واقعی اولمپک ہے ٹائی ٹینک نہیں؟ آئیے کچھ شواہد دیکھتے ہیں۔

اولمپک ہونے کے شواہد

رابرٹ بیلارڈ نے ٹائی ٹینک کی تصاویر لیں، تو ان سے صاف ظاہر ہوا کہ جہاز کے بالائی رنگ کی تہ سے پرانا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔ وہ کسی پہلو سے ظاہر نہیں کرتا کہ یہ نیا جہاز ہے۔

جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا، نئے جہاز کی رونمائی بڑی دھوم دھام اور رنگین تقریب کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ مگر ایسی کوئی تقریب ٹائی ٹینک کے لیے برپا نہیں کی گئی۔ بلکہ مالکان کی کوشش رہی کہ اسے حتی الامکان عام لوگوں کی نظروں سے دور رکھا جائے۔ جب (بظاہر) ٹائی ٹینک بندرگاہ سے روانہ ہوا، تو مسافروں میں یہ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ جس جہاز پر سفر کر رہے ہیں، وہ دراصل اولمپک ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ جہاز کی روانگی سے قبل اس کے کوئلے سے چلنے والے انجن میں زوردار دھماکے کی آواز سنی گئی۔ پھر آگ بجھانے والے عملے کی سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں۔ مطلب یہ کہ جہاز کی حالت سفر پر نکلنے سے پہلے ہی دگرگوں تھی۔ کچھ بعید نہیں کہ جہاز میں پانی رسنا شروع ہوگیا تھا جس کی جانب سے غفلت برتی گئی۔

اس ضمن میں جہاز کے کپتان اسمتھ کا رویہ بہت ہی ناقابل فہم اور مبہم ہے۔ جب بحراوقیانوس میں رواں دواں جہاز برفانی تودے کے قریب پہنچا، تو اس نے تمام احتیاطی تدابیر بالائے طاق رکھ کر رفتار بڑھا دی۔ اس دوران اسے تنبیہی ٹیلی گرام موصول ہوئے کہ رفتار کم کرو مگر کپتان نے نہایت غیر پیشہ ورانہ رویے کا اظہار کرتے ہوئے سنی ان سنی کر دی۔ ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس نے نہ صرف رفتار کم کی بلکہ جہاز روک کر اسے پیچھے کی سمت چلانے لگا۔ اس دوران جہاز میں کافی پانی بھر چکا تھا اور مسافروں میں بھگدر مچی ہوئی تھی۔ مگر مستول پر سمندر میں موجود دوسرے جہازوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے لال کے بجائے سفید روشنی برقرار رکھی گئی۔ چناں چہ اردگرد چلتے جہازوں کو تاثر ملا کہ جہاز کے اندر جشن منایا جا رہا ہے۔

مستول پر دوربین سے دیکھ کر خطرے کی پیشگی اطلاع دینے والے شخص کو عین روانگی سے قبل فرائض سے سبکدوش کر کے فارغ کر دیا گیا۔ وہ جلدی میں جہاز سے جاتے ہوئے دوربین کی واحد جوڑی بھی ساتھ لے گیا۔ اس بات کے بھی شواہد ملے ہیں کہ جہاز کی غرقابی کے دوران کپتان اسمتھ پستول لے کر لائف بوٹس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے صرف گنے چنے لوگوں کو لائف بوٹس میں سوار ہونے دیا جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔

بعدازاں تحقیقات سے پتا چلا کہ جہاز پر موجود

لائف بوٹس کافی بوسیدہ تھیں۔ انھیں جب چھوڑا گیا، تو ان میں پانی رس کر بھرنے لگا۔ مزید برآں جہاز کی روانگی کے اوقات میں یہ خلاف توقع تبدیلی لائی گئی کہ جہاز کو تین دن تک بندرگاہ سے دور سنسان کھاڑی میں کھڑا رکھا گیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ ان تین دن میں طوفانی ہوائیں چلنے کی پیشین گوئی ہوئی ہے۔ تب کسی کے بھی ذہن میں یہ بات نہ آسکی کہ اگر ٹائی ٹینک جیسا عظیم الشان اور مضبوط جہاز ساحل پر ہی طوفانی ہواؤں کا سامنا نہیں کر سکتا، تو بھلا بحراوقیانوس کی موجوں میں کیسے سفر کرے گا؟

مگر ٹھہریے! کہیں اصل وجہ یہ تو نہیں کہ روانہ ہونے والا جہاز ٹائی ٹینک نہیں بلکہ بوڑھا اولمپک تھا؟ اور ساحل ہی پر جہاز طوفان کے آگے ہار مان جائے، یہ کسی طور مالکان کو منظور نہ تھا! دوسری بات یہ کہ ان تین دنوں کے بعد چاندنی بھی ماند پڑ جاتی کیونکہ چاند کی آخری تاریخیں چل رہی تھیں۔

اس بات کے کافی قوی شواہد موجود ہیں کہ بحراوقیانوس کی گہرائیوں میں پڑے جہاز کا ملبہ آنجہانی اولمپک کا ہے۔ اصل ٹائی ٹینک کو اس المناک حادثے کے بعد کافی عرصے تک اولمپک کے نام سے استعمال کیا گیا۔ حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم میں وہ تباہ ہو گیا۔ مالک جے۔ پی مورگن نے اس کا ملبہ بیچ کر خوب پیسا کمایا۔

جب جہازوں کی ٹکر ہوئی

ٹائی ٹینک (اولمپک) جہاز کی حالت روانگی سے قبل ہی اس قدر نازک کیوں تھی، یہ جاننے کے لیے ہمیں پیچھے جانا پڑے گا۔ یہ ستمبر ۱۹۱۱ء کا ایک یخ بستہ دن تھا جب اولمپک حسب معمول امریکا جانے کے لیے بحراوقیانوس میں اترا اور کھلے پانیوں میں جانے کے لیے اپنی رفتار بڑھانے لگا۔ عین اس وقت حفاظتی گشت پر مامور ایک کشتی کے ساتھ اولمپک کا سامنا ہو گیا۔ دونوں کپتانوں نے ممکنہ حادثے سے بچنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، مگر اب تک دیر ہو چکی تھی۔

رفتار کی تیزی نے بچاؤ کی تمام کوششیں ناکام بنا دیں اور دونوں جہازوں کے درمیان سنگین تصادم ہو گیا۔ نتیجے میں اولمپک کو جو پہلے ہی بحراوقیانوس کی کافی مار کھا چکا تھا، ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس کے تین انجنوں کے پنکھے مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔ مرکزی سلاخ ۳۵ کے زاویے تک مڑ گئی۔ اطراف میں لگی تختیاں اکھڑ گئیں اور جہاز کے پیندے کے قریب ۴۰ فٹ چوڑا شگاف پڑ گیا۔ اس کے چار ہائیڈرالک چیمبر بھی پانی کا رساؤ روکنے کے قابل نہ رہے۔ مختصر یہ کہ بعداز حادثہ اولمپک آئندہ بحری سفر کے لائق نہیں رہا۔

اس کی مالک، وہائٹ اسٹار لائن کمپنی ٹائی ٹینک تیار کرنے کے آخری مراحل میں تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اولمپک کو بندرگاہ پر کھڑا نہ کیا جائے ورنہ کمپنی کو بھاری مالی نقصان اٹھانا پڑتا۔ چناںچہ صرف دو ہفتے کی قلیل مدت میں جہاز کی مرمت کرا سے واپس ساحل پر لنگرانداز کر دیا گیا۔ اس قدر شکستہ ساخت جہاز کو سمندر کے حوالے کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔

اندرونی ٹوٹ پھوٹ کو نظر انداز کر کے ظاہری ساخت پر رنگ کی تہ چڑھا دینا ایسے ہی تھا گویا جنگجو سپاہی کی ٹوٹی پسلیوں کو جوڑے بغیر پٹی باندھ کر میدان جنگ بھیج دیا جائے۔ دلچسپ مگر حیرت انگیز بات یہ کہ جہاز جب مرمت کے بعد بندرگاہ پہنچا، تو اس کی ظاہری ہیئت، روپ اور رنگ و روغن ٹائی ٹینک کی شکل و صورت سے بہت مشابہ تھا۔ دور سے دیکھنے سے اس پر ٹائی ٹینک کا ہی گمان ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی لائف بوٹس پر بھی ٹائی

ٹائی ٹینک اپنی تکمیل کے بعد

ٹینک والی زندگی بچاؤ کشتیوں جیسا رنگ چڑھا دیا گیا۔

اولمپک کی مرمت پر وہائٹ اسٹار لائن کمپنی کے ۷،۵۰،۰۰۰ پاؤنڈ سٹرلنگ خرچ ہوئے جو آج کے لحاظ سے بھی بہت بڑی رقم ہے۔ چناں چہ اب ایسی شاطرانہ چال کی اشد ضرورت تھی کہ نہ صرف اس ٹوٹے پھوٹے جہاز سے جان چھوٹے بلکہ انشورنس کا پیسا وصول کر کے دیوالیہ ہونے سے بھی بچا جا سکے۔

سوال یہ ہے کہ اولمپک کو تباہ کرنا مقصود تھا، تو نئے تعمیر شدہ جہاز ٹائی ٹینک کا نام استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ نیز ٹائی ٹینک کو کبھی نہ ڈوبنے والا جہاز قرار دے کر اس قدر تشہیر کیوں کی گئی؟ کہیں اصل وجہ یہ تو نہیں کہ وہائٹ اسٹار لائن کمپنی ایک تیر سے دو کے بجائے تین شکار کرنا چاہتی تھی لہٰذا یہ بہترین موقع تھا کہ بوڑھے اولمپک پر رنگ و روغن چڑھا کر اسے ٹائی ٹینک کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے لایا جائے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ محض ایک جہاز کی انشورنس کا پیسا حاصل کرنے کے لیے سیکڑوں معصوم لوگوں کو جان بوجھ کر موت کے منہ میں دھکیلنا کیا ضروری تھا؟ یہ کہاں کی انسانیت اور کہاں کی عقل مندی تھی؟

مگر جب ہم مرنے والے لوگوں کی فہرست پر نظر ڈالیں، تو اس بھیانک راز سے پردہ اٹھتا ہے۔ انسان یہ سوچ کر ششدر رہ جاتا ہے کہ کوئی انجمن یا تنظیم اپنے مذموم مقاصد کے لیے ایسا سفاک اور انسانیت سوز فعل کرنے پر کیسے آمادہ ہو سکتی ہے جس کے صدمے سے انسانیت آج تک سنبھل نہیں پائی؟

مخصوص قوتوں کا ورلڈ آرڈر

آپ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ اگر ٹائی ٹینک (اولمپک) نہ ڈوبتا، تو دونوں عالمگیر جنگیں کبھی برپا نہیں ہوتیں۔ اقوام متحدہ کا ادارہ وجود میں نہ آتا جس کے سائے تلے دنیا کا ہر ناجائز کام جائز ہو کر پایہ تکمیل تک

پہنچتا ہے۔ جس کی عین ناک کے نیچے مظلوم کی گردن کٹتی ہے، مگر اسے ظالم کے ساتھ ہمدردی جتانے اور اس کی اشک شوئی کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔

تف ہے ہماری عقلوں پر کہ نصف صدی سے زیادہ گزرنے اور اقوام متحدہ کا تمام ریکارڈ دیکھنے اور جاننے کے بعد بھی ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے در پر کسی کی شنوائی ہو سکتی ہے۔ ہم آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ یہ ادارہ صرف خاص ممالک اور طبقوں کے مفاد کو تحفظ دینے کے لیے وجود میں آیا۔ اسے بھوک، غربت و جنگ زدہ، بے خانماں، مقہور و مظلوم انسانیت سے رتی برابر ہمدردی بھی نہیں۔ یہ فضول باتیں اس کے ایجنڈے کا حصہ تھیں، نہ ہیں اور نہ کبھی ہوں گی۔

اقوام متحدہ کو وجود میں لانے والوں کا پیسا دنیا میں قیام امن نہیں بلکہ چھوٹے تنازعات کو باقاعدہ جنگوں میں تبدیل کرنے پر خرچ ہوتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جنگ میں ملوث فریقین کے ہاتھوں اپنا بنایا ہوا اسلحہ فروخت ہو سکے۔ ایک مقصد تیل سے مالا مال عرب ممالک میں اپنی منشا و مرضی کی قیادت لانا اور اسرائیل کو طاقتور بنا کر انھیں دفاع کے نام پر بے دریغ اسلحہ فروخت کرنا تھا۔

اقوام متحدہ کو وجود بخشنے والی طاقتوں نے پہلی جنگ عظیم کے لیے موافق حالات پیدا کیے۔ انہی نادیدہ طاقتوں نے ہٹلر کو اپنی انگلیوں پہ نچایا۔ اس کے نازی ازم کو فروغ دینے کے لیے پیسا پانی کی طرح بہایا تا کہ دوسری عالمگیر جنگ کا جواز پیدا کیا جا سکے جس نے اسلحے کی تجارت کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔

انہی نادیدہ طاقتوں کی ایما پر یہود کے ساتھ انسانیت سوز مظالم روا رکھے گئے تا کہ اگلے چل کر یہودی ریاست کو وجود میں لایا جا سکے۔ اس سے کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ انھیں یہودیوں سے ہمدردی ہے، ایسا ہرگز نہیں۔ وہ یہود رحم کھاتے، تو نازی جرمنی سے انھیں برطانیہ، فرانس یا روس کی طرف فرار کا راستہ دے دیتے۔ ان بے بسوں پر جان بوجھ کر چاروں طرف سے گھیرا تنگ کیا گیا۔ ان کے لیے صرف دو ہی راستے کھلے رکھے گئے کہ یا تو جرمنی سے نکل کر فلسطین کی طرف کوچ کر جائیں یا انھیں جانوروں کی طرح ہانک کر کیمپوں میں لایا جائے۔

وہائٹ اسٹار لائن کمپنی کا مالک، جے پی مورگان

کسی بھی قوم کو اگر ریاست بنانا مقصود ہو، تو وہ حصول کے لیے ایسا جان لیوا راستہ کبھی اختیار نہیں کرتی جس پر چل کر یہودی قوم اسرائیل تک پہنچی۔ یہ ملک یہودیوں کو بطور تحفہ نہیں ملا بلکہ اس ریاست کے قیام کے پیچھے مخصوص طاقتوں کے اپنے عزائم پوشیدہ ہیں۔ ایک یہ کہ ہیکل سلیمانی کی کھدائی کر کے سحر وافسوں کی وہ قدیم کتابیں بازیاب کی جائیں جنھیں حضرت سلیمانؑ نے فتنہ و فساد کی بیخ کنی کے لیے زمین کی گہرائیوں میں دفن کیا تھا۔

اقوام متحدہ کا منصوبہ قحط مٹانا نہیں، بڑھانا ہے۔ اسے وجود میں لانے والوں کا پیسا مونسانٹو (اقوام متحدہ کے تحت معیاری بیج فراہم کرنے والے ادارے) پر خرچ ہوتا ہے۔ اس ادارے سے منسلک ماہرین بیجوں کا معیار نہیں
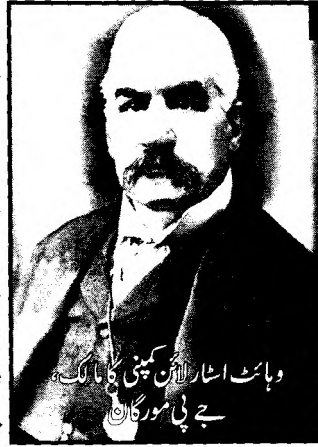
بڑھاتے بلکہ ان میں جینیاتی ردوبدل کرتے ہیں۔ چناں چہ غیر نامیاتی غذاؤں نے جنم لیا جنھوں نے کئی جدید امراض مثلاً موٹاپے کو باقاعدہ وبائی مرض کی شکل دے دی۔

آج سے چالیس پچاس سال پہلے امریکا میں دس میں سے ایک آدمی فربہ ہوتا تھا۔ آج دس میں سے سات آدمی موٹاپے کا شکار ہیں۔ اب دکانوں میں خوردنی اشیا کی نہ ختم ہونے والی فہرست دیکھ کر انسان چکرا جاتا ہے کہ کیا خرید لے اور کیا نہ خریدے۔ ان غیر نامیاتی غذاؤں نے کبھی نہ ختم ہونے والی بھوک کو جنم دیا۔ لوگ بسیارخوری کی وجہ سے پھول کر کپا بن گئے۔ مگر بھوک ہے کہ مٹتی ہی نہیں۔ آج یورپ اور امریکا دونوں کی سڑکوں پر لوگوں کی اکثریت موٹاپے کی وجہ سے عجب مضحکہ خیز چال چلتی اور یہ زبان حال کہتی ہے۔

کبھی ہم بھی خوبصورت تھے

اقوام متحدہ کو وجود میں لانے والوں کا پیسا ''بگ فارما'' کے ذریعے علاج نہیں امراض کی علامات وقتی طور پر دبائے رکھنے پر خرچ ہوتا ہے تا کہ میں اور آپ دن رات محنت مشقت کر کے ان کی مہنگی ادویہ خرید سکیں۔ سرطان (کینسر) اور دیگر موذی امراض کا خوف ہمیشہ ننگی تلوار کی طرح ہمارے سروں پر لٹکتا رہے اور ان سے نمٹنے کے لیے ہم ہر جائز و ناجائز وسیلہ اپنانے سے لمحہ بھر کو نہ ہچکچائیں۔

یہ مونسانٹو اور بگ فارما کن طاقتوں کی نمائندگی کرتی ہیں؟ ان کی ڈور کن نادیدہ ہاتھوں میں ہے؟ میں اور آپ تو یہی کہیں گے کہ یہودیوں کے ہاتھوں میں ہے' مگر ٹھہریئے، یہاں ہم بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ یہود میں آٹے میں نمک کے برابر لوگ ان نادیدہ قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن یہی مقدار دوسری اقوام میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس بات کی تفصیل میں جانے کی اشد ضرورت ہے تا کہ ہم ایک غلط بات بار بار دہرا کر مزید غلط فہمیوں کا شکار نہ ہوں۔

جن خفیہ ہاتھوں نے یہودی مذہب میں صیہونی فرقے کو فروغ دے کر پورے مذہب اور قوم کو یرغمال بنایا، وہی طاقتیں عیسائیت میں بھی کیتھولک فرقے کے ذریعے بنیادی تبدیلیاں لا کر مطلق العنان پاپائے روم کو سرچشمہ طاقت اور اقتدار بنانے کی ذمے دار ہیں۔ پاپائے روم کی تابعداری کا عیسائی مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، یہ گھن چکر محض دولت اور اقتدار کے لیے وجود میں لایا گیا۔ چونکہ موجودہ زمانے میں اقتدار کا محور مذہب سے تجارت کی طرف منتقل ہو چکا لہٰذا اب ان طاقتوں کا محور بھی عالمی تجارت اور ذرائع ابلاغ ہیں جس کے ذریعے مختلف ممالک کے سیاہ و سفید کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

وسطی یورپ کے خزر

اب اصل حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اسلامی فتوحات کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسلامی لشکر یورپ کی سرحدوں تک پہنچ چکے تھے۔ وسطی یورپ میں خزر (Khazar) نام کی ایک کافر قوم رہتی تھی جن کے عقیدے کا ماخذ اور محور مصری فراعنہ کی تریمورتی (ہورس اور ایزیس' اوزیریس) تھی۔ اسلامی فتوحات کے نتیجے میں خزر قوم عجیب صورت حال سے دوچار ہوگئی۔ ان کے ایک طرف عیسائی برسراقتدار تھے تو دوسری طرف اسلامی لشکر ان کی سرحدوں پر آپہنچے۔ خزروں کو خدشہ تھا کہ ہر دو قوموں کے ساتھ ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ نیست و نابود ہو جائیں گے۔ دونوں میں ان کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا غنیمت یہی تھا کہ قوم خزر کوئی درمیانہ راستہ چن لے تا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ پُرامن طور پر رہ سکے۔

چناں چہ انھیں یہ حل نظر آیا کہ خود کو یہودی ظاہر کر دیں اور یہی ان لوگوں نے کیا۔ یہودی مذہب اور نسل کے ساتھ ان کا دور دور تک واسطہ نہیں۔ مگر یہود کے لبادے میں جو نقصان اس قوم نے یہودیت، عیسائیت اور اسلام کو پہنچایا، اسے جان کر حیرت ہوتی ہے۔

انھیں چاہیے آپ اشکنازی یہودی کہیں، فری میسنری کا نام دیں، الومناتی اور یسوعی کہیں، یا روتھ شیلڈ اور جے سوٹ، اپنے مقاصد اور طریقہ واردات میں وحدت و پختگی میں یہ ایک ہی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ انھوں نے کمال ہوشیاری سے اپنے مشرکانہ عقائد کی قلعی عیسائیت کے اوپر چڑھا کر عیسائیوں کو عقیدہ تثلیث کے گورکھ دھندے میں الجھا دیا۔ اس کی گرد میں حضرت عیسیٰ کی دعوت حق نہ صرف گم ہوئی بلکہ اس کا مفہوم ہی اپنے نقطہ آغاز سے ۱۸۰ کے زاویے پر بالکل مخالف سمت چلا گیا۔ عقیدہ تثلیث کا منبع وہی فراعنہ مصر ہیں جن کی علامت ہرم اور ایک آنکھ پر مشتمل ہے۔ حیرت ہے، بالکل یہی علامت امریکا کے کرنسی نوٹ پر کہاں سے اور کیوں آ گئی؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نئی دنیا (امریکا) کا وجود ہی ان قوتوں کی مرہون منت ہے؟

بین الامذہبی تنازعات اور انسانی معاشروں میں وسیع پیمانے پر جنم لیتی تبدیلیوں کے پیچھے پوشیدہ ہاتھ انہی قوتوں کا ہے۔ اقوام متحدہ کے قیام، بگ فارما، مونسانٹو اور دونوں عالمگیر جنگوں کے پیچھے بھی انہی کا ایجنڈا کام کر رہا ہے۔ ڈی پاپولیشن یعنی آبادی کو کم کرنا اور زمین پر بسنے والے انسانوں کو ایک مخصوص حد میں لانا ان کے ایجنڈے کا محور ہے؟ اس مقصد کے حصول کی خاطر مختلف بیماریاں مثلاً ایڈز، ایبولا، برڈ فلو وغیرہ ایجاد کرنا، خاندانی منصوبہ بندی لاگو کرنا، پینے کے پانی میں فلورائڈ ملانا، غیر موثر ادویہ کو فروغ دینا، مونسانٹو کے ذریعے خوردنی اشیا کے بیجوں میں جینیاتی تبدیلی لانا، عام پانی کے بجائے بوتل کے پانی کو فروغ دینا ان کے منصوبے ہیں تاکہ نیو ورلڈ آرڈر کی راہ ہموار ہو سکے۔

اس گروہ کی علامت وہی فراعنہ مصر کی ہر طرف دیکھنے والی آنکھ ہے۔ یعنی ایسی برسراقتدار آنے والی قوت جس کی آنکھ سے کسی کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی پوشیدہ نہیں۔ آج کل آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ آپ کا بینک اکاؤنٹ، ای میل، ہیلتھ رپورٹ غرض ہر ذاتی قسم کی چیز کمپیوٹر میں محفوظ ہے، جن تک رسائی انگلیوں کے ذریعے چند سیکنڈوں کا کام ہے۔

دینِ اسلام کا دجال

دلچسپ بات یہ کہ ایسی ہی ایک آنکھ والی قوت کی پیشین گوئی مذہب اسلام میں بھی کی گئی ہے جسے ''دجال'' کہتے ہیں۔ اس کے متعلق پیغمبر اسلامﷺ نے فرمایا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا دریا ہوگا جبکہ دوسرے میں روٹی کا پہاڑ۔ بہت خوب! تو اب ڈبلیو ایچ او (WHO) کے بارے میں کیا خیال ہے جس کے ہاتھ میں تمام فصلوں کے بیج اور بوتل بند پانی کے کارخانے ہیں۔ یہ کارخانے کن لوگوں کی ملکیت ہیں؟ جی ہاں آپ نے صحیح اندازہ لگایا، وہی جے سوٹ، روتھ شیلڈ اور راک فیلرز جن کی بنیادیں خزر قوم سے پھوٹی ہیں۔ ان کا خدا فرعون مصر (ایک آنکھ والا) ہورس یا (دجال) ہے۔ اور جو نیو ورلڈ آرڈر (ہورس یا دجال کی حکومت کے لیے) ہزاروں سال سے سرگرم عمل ہیں۔ ان سب حقائق کی ایک چھوٹی سی جھلک دیکھنے کے لیے آئیے چلتے ہیں امریکی جزیرے جیکال کی طرف......

فیڈرل ریزروسسٹم کا کٹھن چکر

یہ نومبر ۱۹۱۰ء کا زمانہ ہے۔ امریکی سینیٹر نیلسن آلڈرچ سمیت چھے اور اشخاص...... تب کے مالدار اور ماہر بینکار انتہائی رازداری کے ساتھ جزیرہ جیکال پہنچے۔ پورے نو دن تک ایک خاص کمرے میں ان کے اجلاس ہوتے رہے۔ ان میں یہ نقطہ زیر بحث رہا کہ اجلاس کے شرکا (جو آپس میں حریف تھے) اگر ایک دوسرے کے حلیف بن کر منافع بخش کاروبار میں سرمایہ کاری کریں، تو یہ ان کے حق میں زیادہ بہتر ہو گا۔ لہٰذا متفقہ طور پر ایک مشترکہ

وسطی یورپ کے خزری جو جعلی یہودی بن بیٹھے

بینک (فیڈرل ریزروسسٹم) کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ خالص سودی منافع کے لیے قائم کیا گیا بینک ہے جس کا ایک شراکت دار وہائٹ اسٹار لائن کمپنی کا مالک جے پی مورگن بھی تھا۔

مگر جہاں اس بینک کے قیام کے لیے جے سوٹ، روتھ شیلڈ اور فری میسن آپس میں شیر و شکر ہو گئے، وہاں برطانیہ کی کچھ بااثر شخصیات خلاف بھی تھیں۔ مزید برآں یہ لوگ لیگ آف نیشن کے خاتمے اور قیام اقوام متحدہ کے بھی سخت مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لیگ آف نیشن منصفانہ قوت فیصلہ رکھنے والا ادارہ ہے جس کے فیصلوں کو کوئی ملک یا ادارہ سبوتاژ نہیں کر سکتا۔ مگر اقوام متحدہ کے قیام سے ایسی عالمی طاقت کا ظہور ہو گا جو جانب دارانہ فیصلے کر سکتی ہے۔ چناں وہ امریکا جا کر امریکی عوام اور حکومت کو اپنے تحفظات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ امریکی عوام کو بتانا چاہتے تھے کہ فیڈرل ریزروسسٹم انھیں کس کٹھن چکر میں پھنسانے والا ہے۔

تب امریکی عوام کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس بینک (فیڈرل ریزروسسٹم) سے آسان شرائط پر ملنے والا قرضہ انھیں دیمک کی طرح چاٹ جائے گا۔ گھر، گاڑی، ملازمت، دیگر اخراجات اور لامتناہی ٹیکسوں کی ادائیگی کے لیے دن رات انتھک محنت اور مشقت انھیں ذہنی طور پر اپاہج بنا دے گی۔ انھیں اس بات کا علم ہی نہیں ہو گا کہ ۵۰، ۶۰ سال کی مختصر زندگی میں کولھو کے بیل کی طرح محنت و مشقت کر کے جو پیسا بناتے ہیں، وہ جاتا کہاں ہے اور نتیجے میں انھیں کیا ملتا ہے؟...... دیوالیہ پن، بلڈ پریشر، ذیابیطس، موٹاپا اور الزائمر!

فیڈرل ریزروسسٹم اور اقوام متحدہ کی مخالفت کرنے والے ان انسان دوست افراد میں بنجمن گوگنہائم، آئسی ڈور سٹراس اور جیکب آسٹر سرفہرست تھے۔ امریکا تک سفر کے لیے ان کی نظر انتخاب ٹائی ٹینک (اولمپک) پر پڑی۔ اس وقت ٹائی ٹینک جہاز کی سفری سہولیات اور جے پی مورگن اور دیگر سرکردہ ہستیوں کے لیے سجائے گئے فرسٹ کلاس کیبن کا بڑا شہرہ تھا۔ فرسٹ کلاس کیبن کا ٹکٹ ۵۰ ہزار پاؤنڈ میں فروخت ہو رہا تھا جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ چناں چہ ان لوگوں نے خوشی خوشی فرسٹ کلاس کیبن کے ٹکٹ خرید لیے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ عین روانگی سے قبل جے پی

مورگن اور اس کے ساتھی اپنی بکنگ ملتوی کرا لیں۔ بحر اوقیانوس میں غرق کرنے کی خاطر سفاک کپتان اور بوڑھے اولمپک کے حوالے کر دیں گے۔

جہاز کی روانگی سے قبل جے پی مورگن سمیت ۵۵ افراد نے اپنی بکنگ ملتوی کر دی۔ اس نے بیماری کا بہانہ کیا۔ مگر جہاز کی روانگی کے دو روز بعد اسے فرانس کے ایک پرتعیش ہوٹل میں اپنی محبوبہ کے ہمراہ دیکھا گیا۔ بقیہ ۵۴ افراد نے یہ کہہ کر اپنی بکنگ ملتوی کرائی کہ ان کی بیویوں نے برے خواب دیکھے ہیں۔ عجیب اتفاق کہ ان سب کی بیویوں نے ایک ساتھ ہی ڈراؤنے خواب دیکھے!

جنھوں نے بکنگ ملتوی کرائی

اگر منصوبے کا جائزہ لیا جائے، تو اس کی گہرائی اور تاریکی ٹائی ٹینک (اولمپک) کی آبی قبر سے بھی زیادہ دہشت ناک، تاریک اور سفاک ہے۔ دنیا پر اپنا ایجنڈا مسلط اور نیو ورلڈ آرڈر کے قیام کی خاطر راستہ ہموار کرنے کے لیے انھوں نے جان بوجھ کر بوڑھے اولمپک کو ٹائی ٹینک کا نام دے بحر اوقیانوس کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیا۔

گویا ٹائی ٹینک (اولمپک) بطور چارہ استعمال ہوا۔ اس کے ذریعے بعض بااثر اور مالدار ترین ہستیوں کو پیش منظر سے ہٹانا مقصود تھا تاکہ ایک طرف فیڈرل ریزرو بینک اور اقوام متحدہ کے قیام کی راہ ہموار ہو سکے اور دوسری طرف ان کی بے اندازہ دولت بھی ہاتھ آ جائے۔

ڈوبنے والی مالدار ہستیوں کی مجموعی دولت کا تخمینہ اس وقت پانچ کروڑ ڈالر کے لگ بھگ تھا جسے یسوعی کارندوں نے مختلف حربے استعمال کر کے پسماندگان سے وصول کر لیا۔ ہمیں اس بات پر تعجب نہیں کہ ڈوبنے والوں کے پسماندگان مختلف مواقع اور جگہوں پر پراسرار انداز میں مردہ پائے گئے۔

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ بکنگ ملتوی کرانے والے لوگ کون تھے؟ ان میں سرفہرست جے پی مورگن کا دست راست اور کاروباری شراکت دار، امریکی سٹیل کے کارخانوں کا مالک ہنری کلے فرک تھا جس کا کاروبار عالمگیر جنگوں میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کر گیا۔ ریلوے لائن اور بحری شپ یارڈ کا مالک جورج ڈبلیو وانڈر بیلٹ بھی جس نے دونوں عالمی جنگوں میں دور دراز تک ریلوے لائن بچھا اور نئے بحری جہاز بنا کر خوب منافع کمایا۔ امریکن چاکلیٹ پروڈکشن ہرشی کا بے تاج بادشاہ ملٹن ہرشی جس نے دونوں عالمگیر جنگوں کے دوران فوجیوں کو چاکلیٹ کی فراہمی کا ٹھیکا لیا۔

امریکی ایک ڈالر پر طبع ہرم اور ایک آنکھ

امریکا میں اشکنازی یہود کی زیرنگرانی کام کرنے والی فلمی کمپنیوں نے باقاعدہ فلم انڈسٹری کی شکل اختیار کر لی جسے ہم ''ہالی ووڈ'' کے نام سے جانتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے، اس نام کے پیچھے کیا فلسفہ کارفرما ہے۔ ہالی ووڈ کے لغوی معنی ہیں مقدس یا جادوئی چھڑی...... وہی چھڑی جو سحر وافسوں کے دوران استعمال کی جاتی ہے۔ نام ہی سے ان

کا اصل عقیدہ نمایاں ہے۔ یہ قدیمی دیوی دیوتاؤں (فراعنہ مصر) کو پوجنے والے کافر ہیں مگر خود کو (اشکنازی) یہودی ظاہر کرتے ہیں۔ کئی یہودی انھیں اپنے میں سے ماننے کو تیار نہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ کس طرح اپنے مذموم عزائم کے لیے ان کا استحصال کر رہے ہیں۔

بالی ووڈ دولت کمانے کے لحاظ سے کئی صنعتوں سے آگے ہے۔ وہاں باقاعدہ سائنسی تحقیق اور ٹیکنالوجی کے باہم امتزاج سے ایسی کئی فلمیں بنتی ہیں جو مستقبل کے حالات کی عکاسی کریں۔ کم لوگوں کو علم ہوگا کہ ان فلموں کے بنانے میں بنیادی اوّلیت اور فوقیت سائنسی تحقیق اور نظریات کو دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں سائنس دانوں کی پوری ٹیم دن رات سائنسی تحقیق و جستجو میں مصروف رہتی ہے۔ بلکہ مختلف موضوعات کے الگ الگ شعبے قائم ہیں جہاں سائنسی بنیادوں پر مبنی کہانیاں لکھیں اور فلمائی جاتی ہیں۔ یہ محض دیوانے کی بڑ نہیں بلکہ پوری تحقیق و تفتیش اور حقائق پر مبنی کہانیاں ہوتی ہیں۔

ٹائی ٹینک اور ٹون ٹاورز

یہ محض نظریہ ہے کہ ٹائی ٹینک (اولمپک) برفیلی تودے سے ٹکرا کر دو نیم ہوگیا۔ جیسا کہ امریکی سرکاری بیان کے مطابق ہوائی جہازوں کے ٹکرانے سے ''ٹون ٹاورز'' زمین بوس ہوگئے۔ اگر اسے سچ مان بھی لیا جائے، تو یہ بات سمجھ اور منطق سے بالاتر ہے کہ عین اسی وقت بلڈنگ نمبر سات خود بخود کیسے زمین بوس ہوگئی؟ حالانکہ اس کے ساتھ پرندہ بھی نہیں ٹکرایا۔

سادگی اور بے وقوفی کی انتہا دیکھیے، مضبوط بنیادوں پر استوار ٹون ٹاورز کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ انھیں ہوائی جہاز ٹکرانے یا شدید قسم کے زلزلے سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن وہ ایسے ہوائی جہازوں کے ٹکرانے سے زمین بوس ہوگئے جو ان دیوہیکل عمارتوں کے سامنے مچھر کی حیثیت رکھتے تھے۔

درونِ خانہ حقیقت یہ تھی کہ لیری سلورسٹین نامی کروڑ پتی شخص نے ان عمارتوں کا سودا ننانوے برس کی اقساط پر کیا ہوا تھا اور ان کی انشورنس بھی اسی کمپنی سے کرائی جو ٹکرانے والے ہوائی جہازوں کی انشورنس کراتی ہے۔ کیا یہ اتفاق ہے؟

واقعہ نائن الیون سے ایک دن پہلے نیویارک ہوائی اڈے سے جہازوں کی پروازوں کا خصوصی مظاہرہ کیا گیا۔ اس دوران کنٹرول روم کو آگاہ کیا گیا کہ آج جو کچھ بھی ہوگا، آپ اسے معمول کے مطابق کچھیے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں مظاہرے کا حصہ ہوگا۔ نتیجتاً اگلے روز یعنی گیارہ ستمبر کو دو ہوائی جہازوں کی غیر معمولی پرواز منظر عام پر آئی، تو کنٹرول روم سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ ایک اور اتفاق؟

۹/۱۱ سے ایک ہفتہ قبل ٹون ٹاورز میں ایک اسکول کی طرف سے کچھ طالب علم خصوصی طور پر آرٹ کی نمائش لگانے آئے۔ انھیں ہر کمرے میں جانے کی کھلی اجازت ملی کہ دروازوں پر مختلف رنگا رنگ چمکدار چیزیں چپکائی تھیں۔ عمارتوں کے ملبے سے ملنے والی ایسی ہی چیزوں کا جب جائزہ لیا گیا، تو پتا چلا کہ یہ دھماکا خیز مواد تھا جس کے ذریعے عمارتوں کو گرایا جاتا ہے۔ ایک اور اتفاق؟

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ حادثے والے دن مخصوص (اشک نازی) لوگوں کا ایک فرد بھی عمارت میں موجود نہیں تھا۔ ایک اور اتفاق؟

اسی طرح امریکی شہر، اوکلاہوماسٹی میں دھماکوں کے دوران بھی کچھ مخصوص لوگ جائے وقوعہ سے غائب تھے۔ ایک اور اتفاق؟

◆◆◆

غریب کا بادام

مونگ پھلی

گوشت سے بھی زیادہ پروٹین رکھنے والا اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ بیش بہا غذائی تحفہ

محمد خلیل چودھری

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تندرست رکھنے کی خاطر بے شمار پھل اور میوہ جات پیدا فرمائے۔ مونگ پھلی بھی ان میں سے ایک ہے۔ بھنی ہوئی گرم گرم مونگ پھلی لوگ بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ یہ عوام و خواص، نوجوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں سب کا دل پسند میوہ ہے۔ اسے غریب کا بادام بھی کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں بہ کثرت پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک بیل کا پھل ہے۔ اسے مغز بادام کی طرح شوق سے کھایا جاتا ہے۔ سستا اور خشک میوہ ہے۔ آج کل اس کا موسم ہے۔ اس کا تیل بہت استعمال ہوتا ہے۔

مونگ پھلی کا آبائی وطن جنوبی امریکا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ایک ہزار سال پہلے آثار قدیمہ کے ماہرین نے پیرو کے ساحلی علاقوں کی کھدائی کی، تو انھیں وہاں مونگ پھلی کے بھی آثار ملے۔ آج برصغیر پاک و ہند میں دنیا بھر کی مونگ پھلی کی پیداوار کا ۴۰ فیصد حصہ پیدا ہوتا ہے۔

اس کی پھلیاں زمین کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ پھر بھی اس کا شمار مغز اور بیج کے زمرے میں ہوتا ہے۔ مونگ پھلی کی کاشت سالانہ بنیاد پر ہوتی ہے۔ ایک پھلی میں بالعموم ایک سے تین دانے ہوتے ہیں۔ بعض توانا اور بڑے ہوتے، بعض کمزور اور چھوٹے۔ زمین کے اندر یہ دانے دو ماہ میں پک کر تیار ہو جاتے ہیں۔ پکنے کی صورت میں اس کی بیلوں کو اکھاڑ لیا جاتا ہے۔ چار سے چھے ہفتوں کے دوران یہ مکمل طور پر خشک ہو جاتے ہیں۔

مونگ پھلی کے غذائی اجزا

اپنے مزاج کے اعتبار سے یہ پھلی گرم خشک ہے۔ لہٰذا ۱۰۰ گرام مونگ پھلی میں غذائی اجزا کا تناسب حسب ذیل ہے:

فاسفورس ۳۵۰ ملی گرام، چکنائی ۱ء۴۰ فیصد، فولاد ۸ء۲ ملی گرام، کیلشیم ۹۰ ملی گرام، وٹامن ای ۴ء۲۶۱ ملی گرام، لحمیات ۳ء۲۵ فیصد، ریشے ۱ء۳ فیصد، رطوبت ۰ء۳ فیصد، کاربوہائیڈریٹس ۱ء۲۶ فیصد اور معدنی اجزا ۴ء۲ فیصد۔ کچھ مقدار میں وٹامن بی کمپلیکس بھی پایا جاتا ہے۔ ۱۰۰ گرام مونگ پھلی میں حراروں کی تعداد ۵۶۷ ہوتی ہے۔

غذائی اور طبی اہمیت

مونگ پھلی میں دیگر پھلوں اور میوہ جات کی طرح بے شمار طبی اور غذائی فوائد مضمر ہیں۔ اس میں اعلیٰ درجے کی پروٹین وافر مقدار میں موجود ہوتی ہے۔ اسی پروٹین کی بنا پر اسے خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ ایک کلوگرام مونگ پھلی میں ایک کلوگرام گوشت کی نسبت زیادہ لحمیاتی اجزا پائے جاتے ہیں۔ جبکہ اتنی ہی مقدار میں انڈوں کے بالمقابل تقریباً اڑھائی گنا زیادہ پروٹین ملتی ہے۔ اسی طرح پنیر اور سویابین کے سوا دیگر کوئی بھی نباتات پروٹین کی مقدار کے سلسلے میں مونگ پھلی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس میں پائی جانے والی پروٹین متوازن ہوتی ہے۔

بطور غذا

مونگ پھلی کو اگر بغیر بھونے کھایا جائے، تو اسے خوب چبا کر کھائیے کیونکہ اس کو جس قدر زیادہ چبایا جائے، یہ اتنی ہی زیادہ زود ہضم ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت میں یہ دیر ہضم ہے۔ یہ مونگ پھلی کی خامی ہے۔ لیکن بھون کر استعمال کرنے سے اس کی یہ خامی دور ہو جاتی ہے۔ اسے پکا لینے سے نشاستہ مزید قابل ہضم ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ پکانے کی زحمت سے بچنا ہو، تو اسے پیس کر آٹا بنا لیجیے۔

مونگ پھلی میں روغن وافر ہوتا ہے۔ اس لیے پیسنے سے یہ مکھن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنے سے پیشتر تھوڑا سا خوردنی نمک ضرور شامل کر لیجیے۔ اگر اس مکھن کا قوام زیادہ گاڑھا ہو تو اس میں پانی وغیرہ نہ ملائیے بلکہ پتلا کرنے کے لیے مونگ پھلی کا تیل ملائیں۔

مونگ پھلی محض لذیز غذا ہی نہیں، یہ شفا بخش اثرات بھی رکھتی ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

موٹاپا

موٹاپا بنفسہ کوئی مرض نہیں، لیکن بہت زیادہ موٹاپے سے جسم کئی بیماریوں کو گھیر لیتی ہیں۔ مونگ پھلی کے استعمال سے موٹاپے میں کمی واقع ہوتی ہے۔ دوپہر کھانے سے کچھ دیر قبل مٹھی بھر مونگ پھلی (بھنی ہوئی) کھائیے ساتھ ہی بغیر چینی کے چائے یا کافی استعمال کیجیے۔ وزن میں رفتہ رفتہ کمی آ جائے گی۔ یہ نسخہ برتنے سے بھوک بھی لگتی ہے۔ نتیجتاً دیگر اغذیہ کے کم استعمال سے وزن بھی کم ہو جاتا ہے۔

ذیابیطس

اس عارضے میں مبتلا مریض اگر مونگ پھلی مناسب مقدار میں استعمال کریں، تو انھیں افاقہ رہتا ہے۔ مریض اگر روزانہ ۶۰، ۵۰ گرام مونگ پھلی کھا لیں، تو وہ غذائیت کی کمی سے محفوظ رہیں گے۔ بیشتر بدن کو درکار نایاسین کی مقدار بھی پوری ہوتی رہے گی۔

دانتوں اور مسوڑھوں کا علاج

دانتوں کی مضبوطی میں مونگ پھلی اکسیر ہے۔ اسے نمک کے ساتھ ملا اچھی طرح چبا کر کھایا جائے، تو مسوڑھے مضبوط ہوتے ہیں۔ یوں مضرت رساں جراثیم کا انسداد ہوتا اور دانتوں کا قدرتی رنگ برقرار رہتا ہے۔ مونگ پھلی کھانے کے بعد منہ پانی سے اچھی طرح صاف کر لیں تاکہ اس کے ذرات دانتوں میں نہ رہ جائیں۔

جریان خون اور نکسیر

بعض اوقات چوٹ لگنے سے زخم کی صورت خون مسلسل بہتا اور اسے روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مونگ پھلی کا متوازن استعمال جریان خون (ہیموفیلیا) کا کامیاب علاج ہے۔ حیض مقدار میں زیادہ آنے کے عارضے میں بھی مونگ پھلی مفید اثرات رکھتی ہے۔

چہرے کی تروتازگی

اس کا روغن حسن و جمال میں اضافے کے لیے مستعمل ہے۔ یہ بیرونی جلد کی نشوونما کرتا اور خوبصورتی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جوانی میں چہرے پر ظاہر ہونے والے کیل مہاسوں، چھائیوں اور کیلوں کی پیدائش روکتا ہے۔ مونگ پھلی کے روغن میں مساوی وزن لیموں کا رس شامل کر لینے سے نتائج زیادہ بہتر اور حوصلہ افزا نکلتے ہیں۔ رات کو سوتے وقت یہ آمیزہ چہرے پر ملیے، تروتازگی نکھار اور شادابی آ جائے گی۔

متفرق امراض

مونگ پھلی میں بے شمار فوائد پوشیدہ ہیں۔ مثلاً اس میں بہ آسانی ہضم ہو جانے والا تیل کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ یہ تیل جلد میں نرمی اور ملائمت پیدا کرتا ہے۔ معتدل طور پر مسہل بھی ہے۔ ایسی خواتین جو بچوں کو دودھ پلا رہی ہوں، ان کے لیے شکر اور دودھ کے ساتھ مونگ پھلی کھانا عمدہ اور طاقت بخش غذا ہے۔ اس غذا میں ہر طرح کی چھوت روکنے کی صلاحیت ہے۔ ٹی بی اور یرقان کے مریضوں کے لیے یہ نادر روزگار شفا بخش دوا ہے۔

استعمال میں احتیاط

یہ یاد رہے کہ مونگ پھلی کو غذا کی جگہ نہ دیجیے۔ بعض محققین کی رائے میں مونگ پھلی کے روزمرہ استعمال سے جسم میں تیزابیت بڑھ جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو بھونی ہوئی مونگ پھلی کھانے سے الرجی ہو جاتی ہے۔ سانس کی تکلیف اور بالخصوص دمہ کے مریض مونگ پھلی کم کھائیں۔ البتہ اگر یہ مونگ پھلی نمک ملے پانی میں ابال لیں، تو زیادہ نقصان سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ معدے کے عوارض میں مبتلا اور یرقان کے مریض بھی اس سے گریز کریں۔

◆◆◆

دُکھتی رگ

امریکا میں عورتوں نے ایک نئی ایجاد پر بہت زبردست احتجاج کیا ہے۔ وہ ایجاد کیا ہے؟ ''ایک ایسا کیمرہ جو میک اپ کے باوجود چہرے کی اصلی تصویر اتارنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' (شبیر حسین، قصور)

بیتے ہوئے دن سبھی کو یاد آتے ہیں، مگر یہ میرا محبوب مشغلہ نہیں! میں تو اکثر شب تنہائی میں بھی ان دنوں کو یاد نہیں کرتی بلکہ سوچتی رہتی ہوں کہ آنے والے دنوں میں کہاں کہاں نجل خواری کرنی ہے؟ بجلی کا بل جمع کرانا ہے، گاڑی مستری کے پاس لے جانی ہے، کسی فنکشن میں جا کر کسی کتاب کی جھوٹی سچی تعریفیں بیان کرنا یا ملکی حالات پر کڑھنا ہے۔

بیتے دن یاد نہ کرنے کی ایک خاص وجہ بھی ہے۔ میں پکے ہوئے پھوڑوں میں سوئیاں مار کر بے لطف نہیں ہونا چاہتی۔ رفتگاں کی یاد اور گئی محفلوں کی دھول سے میرا سانس گھٹنے لگتا ہے۔

ہاں مگر یہ اقرار ضرور کروں گی کہ بیتے دن میرے آس پاس سائے بن کر منڈلاتے رہتے ہیں۔ میں شعوری طور پر بے شک انھیں اہمیت نہ دوں، مگر یہ ضرور جانتی ہوں کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں..... اس گھاگھو گھوڑے کو بیتے دنوں کی کچی مٹی نے ہی وقت اور تجربے کی بھٹی میں پکا کر یہ شکل دی۔

کتابوں میں بسی خوشبو کی مانند

کبھی ہم بھی خوبصورت تھے

گزرے وقت کی کھٹی میٹھی یادیں جس کا پہیہ اپنا چکر کاٹتا اور سبھی میں قطرہ قطرہ جیون بانٹتا ہے

نیلم احمد بشیر

میں خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں۔ دنیاوی طور پر مالدار نہ ہونے کے باوجود ہمارا گھرانا بہت انوکھا اورا لٹا پلٹا تھا۔ میں منہ میں سونے کا چمچ لیے پیدا ہوئی...... ابا ادیب تھے، اس لیے گھر میں ادب کے سنہرے چمکیلے پہاڑ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ آرٹ، کلچر اور ٹیلنٹ کی دولت کے دریا گھر ہی میں بہ رہے تھے۔ ایک طرح سے میں نے بہت زرخیز بچپن گزارا۔ یہ خوش قسمتی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔

بچپن کی یادوں کے دریچے دھیرے دھیرے وا ہوں، تو ٹھنڈی میٹھی ہواؤں کے جھونکے چہرے کو نرم نرم بوسے دیتے ہیں۔ دیکھتی ہوں کہ اسکول ہیڈ ماسٹر دادا جی حقہ گڑگڑاتے، بستر پر لیٹے ٹائم میگزین پڑھتے نظر آرہے ہیں۔ دادی اماں بل دار پراٹھے بنایا مجھے محلے کی لائبریری سے کوئی کتاب لانے بھیج رہی ہیں۔ لائبریری والا کہتا ''کون سی کتاب بھیجوں...... اماں جی نے تو سب کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔''

گھر میں ابا کے ادبی دوستوں کی محفلیں سجتیں۔ مجھے ان کی عالمانہ فاضلانہ باتیں سن کر بڑا مزا آتا۔ سات آٹھ برس کی تھی جب امی ابا مجھے ابنِ انشا کے گھر لے جاتے۔ ان کے گھر کمرے میں ایک شیلف تھی جس پر بہت سی کتابیں قطار اندر قطار رکھی نظر آتیں۔ میں بڑوں کی نظر بچا کر اس پرچھتی میں جا گھستی اور گھنٹوں کتابیں پڑھتی رہتی۔

ایک رات حفیظ جالندھری کے کلفٹن (کراچی) والے گھر پر کلاسیکی موسیقی کی محفل ساحل سمندر پر رکھی گئی۔ میں بچی تھی، اسکول یونیفارم ہی میں تادیر ساحل پر بیٹھی رہی۔ موسیقی کے سُر سمندری ہواؤں کے سنگ اُڑاتے رہے...... مجھے بھوک لگی تھی اور غسل خانے بھی

نیلم احمد بشیر ممتاز ادیب، احمد بشیر (مرحوم) کی صاحب زادی ہیں۔ آپ کے افسانے باقاعدگی سے ادبی رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ آپ نے منفرد اپنی یادوں پر مشتمل زیرِنظر تحریر بطور خاص اردو ڈائجسٹ کے لیے بھجوائی ہے۔ اس آپ بیتی میں ادبی چاشنی کی مہک بھی رچی بسی ہے۔

جانا تھا مگر کچھ نہ بولی۔ اس زمانے میں والدین کا رعب ایسا ہی ہوتا تھا۔ بچوں سے کچھ پوچھا نہ جاتا، بس بتا دیا جاتا کہ انھیں یہ یہ کرنا ہے اور بس......

ابنِ انشاء بچوں کی نظمیں لکھتے۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ''بلو کا بستہ۔'' اس میں ایک نظم مجھ پر اور میری بہن پہ بھی لکھی جس کا عنوان تھا...... ایک نیلی اک پوپی۔

میں گڑیوں سے کھیلنے والی بچی نہیں تھی۔ یعنی شروع ہی سے دماغ الٹا تھا۔ کتابیں پڑھتی یا ممتاز مفتی، ابنِ انشا، اشفاق احمد جیسے لوگوں کی باتوں پر سر دُھنتی۔ کالج کے زمانے میں امریکی ناول ''Gone with the wind'' پڑھا، تو اس کے ہیرو سے محبت ہوگئی۔ وہی میرا آئیڈیل بن گیا۔ مگر آئیڈیل کہاں ملتے ہیں؟ سو وہ بھی نہ ملا۔

ہمارے ابا نے گھر میں نظام مساوات رائج کر رکھا تھا۔ میں دودھ پیتی بچی تھی، تو ابا کا حکم تھا کہ نیلم کو صرف ماں نہیں بلکہ نوکرانیوں اور مہترانیوں کا بھی دودھ پلایا جائے۔ ان کا کہنا تھا، ہر ماں ایک جیسی اور ہر ایک کا

دودھ سفید ہوتا ہے...... چناں چہ کئی نوکرانیوں اور جمعدارنیوں کے بچے میرے رضاعی بہن بھائی بن گئے۔ شاید اسی لیے میرا مزاج بھی ہمیشہ عاجزانہ رہا۔ میں کبھی کسی اونچائی پر نہ پہنچ سکی۔

ابا کا یہ بھی حکم تھا کہ گھر میں جو ملازم رکھو، اسے پڑھایا جائے۔ لہٰذا ہم سب بچوں کی ڈیوٹی لگی رہتی کہ کسی ملازم کو کام کے بعد فارغ نہ بیٹھنے دیں۔ ہم بہنیں گھریلو ملازمین کو قاعدے اور اے بی سی پڑھاتے پڑھاتے بڑی ہوئیں۔ مجھے ایک خاص الخاص ڈیوٹی سونپی گئی جس سے شدید کوفت ہوتی۔ گھر میں رکھے جانے والے ملازم جن میں مرد و زن شامل تھے، جب گاؤں جاتے اور لوٹتے تو اکثر بتاتے کہ انھیں فلاں بیماری چمٹ چکی یا کتے نے کاٹ لیا۔ بس یہ سننا تھا کہ ابا مجھے حکم دیتے ''نیلم! اسے اسپتال لے کر جاؤ اور ٹیکے لگواؤ......'' میں دل ہی دل میں کڑھتی طوعاً کرہاً ملازم کو ساتھ لیتی اور پندرہ روز بلاناغہ اسے پیٹ میں ٹیکے لگوانے جاتی۔

آج سوچتی ہوں تو اپنے اوپر ترس آتا ہے اور یہ خیال بھی کہ آج کوئی باپ اپنی بیٹی کو نہ ایسا کام کہتا ہوگا اور نہ وہ اُسے کرنے پر رضا مند ہوگی۔ دراصل ابا کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹیاں خوداعتماد بن جائیں۔ اچھا کھانا کھانے کا بھی چسکا تھا۔ ایک روز ان کا جی چاہا کہ آج گھر میں مرغی پکائی جائے۔ اس زمانے میں چکن کو مرغی یا ککڑی کہا جاتا تھا۔ ظاہر ہے گھر میں ککڑی نہ تھی کیونکہ فریج نہیں تھا۔

مجھے بلایا اور کہا ''دو نمبر بس پر چڑھو، ٹولنٹن مارکیٹ جاؤ اور ایک مرغی خرید کر لاؤ۔'' میں بارہ برس کی تھی۔ کرشن نگر سے اکیلے ٹولنٹن مارکیٹ جا کر مرغی خریدنے کے خیال سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر ابا کو انکار نہ کیا جا سکتا تھا۔ ڈبل ڈیکر کی بالائی منزل پر بیٹھی آنسو بہاتے میں سوچتی رہی کہ میرا باپ کتنا ظالم ہے جو اکیلے ہی مجھے سوئے دار بھیج رہا ہے۔ خبر نہ تھی کہ مجھے زندگی میں آگے چلنے اور تنہا سارے کام کرنے کا سبق پڑھایا جا رہا ہے۔

میرے اندر دو بڑی خراب عادتیں تھیں جو اب تک ختم نہ ہو سکیں۔ ایک یہ کہ مجھے بات بے بات رونا آ جاتا۔ گھر والے باقاعدہ فرمائش کر کے چھیڑتے اور کہتے ''چل بھئی نیلم، رو کر دکھا'' اور میں رونا شروع کر دیتی۔ رونا دراصل مجھے اس بات پر آتا کہ میں اتنی کمزور کیوں ہوں کہ کسی کے کہنے پر جھٹ رونا شروع کر دیتی ہوں۔ اب بھی یہی حال ہے۔

دوسری بری عادت یہ تھی کہ مجھ سے برتن بہت ٹوٹتے، مگر امی ابا سے اس بات پر کبھی ڈانٹ نہ پڑی۔ ابا تو باقاعدہ تالیاں بجاتے یوں جیسے میں نے سرکس کا کوئی کرتب دکھایا ہو...... اس پر مجھے اور رونا آتا۔ شادی کے بعد پیا گھر سدھاری، تو شوہر نے میرے ابا سے شکایت کی ''آپ کی بیٹی برتن بہت توڑتی ہے۔''

ابا بولے ''ہاں یہ برتن توڑتی ہے...... مگر کسی کا دل نہیں توڑتی۔''

شوہر نے سوچا ''یہ بڑے پاگل لوگ ہیں...... عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں...... کیسے غلط خاندان میں شادی ہو گئی ہے میری!''

انھیں یقین آ گیا کہ نیلم کی تربیت غلط ہوئی ہے اور یہ اصلاح کے بھی قابل نہیں۔ چناں چہ کیس بگڑ گیا۔

میں نے بی اے پاس کرنے کے بعد نفسیات میں ایم اے کرنے کا ارادہ کیا۔ نیو کیمپس دیکھتے ہی جھٹ اس میں داخلہ لے بیٹھی۔ کیا خوبصورت خوابوں کی نگری جیسی جگہ تھی وہ! شہر سے دور، پُرسکون، خاموش، سرسبز

اور جدید طرزِ تعمیر والی عمارت۔ میں دل و جان سے اس پر مرمٹی۔

ہم جماعت لڑکے لڑکیاں اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے گپیں ہانکتے...... اپنے اپنے پابند گھروں سے نکل کر جنسِ مخالف کو ملنا، عام انسانوں کی طرح ان سے بات چیت کرنا اور ہوا نہ سمجھنا بہت اچھا لگتا۔ کبھی ہم کینٹین میں چائے پیتے، نہر کنارے بیٹھ کر گانے گاتے اور کبھی کشتیوں میں سیر کرتے۔ لڑکے چپو چلاتے، تو ہم لڑکیاں اپنے آپ کو کسی پاکستانی فلم کی ہیروئن سمجھنے لگتیں۔ وہ بھی کیا دن تھے!

مجھے یاد ہے، ایم اے کے زمانے میں، میں نے پہلی بار برگر اور چینی کھانے کھائے، تو بہت ہی مزا آیا۔ اس وقت پہلی بار یہ بھی پتا لگا کہ کھانے کے ساتھ پانی ہی نہیں بوتل بھی پی جاتی ہے۔ اس سے پہلے میں سمجھتی تھی، بوتل صرف مہمانوں کو پلائی جاتی ہے۔ میرے لیے وہ نئی، حیران کن اور خوشگوار دنیا تھی۔

ایک بار بس میں یونیورسٹی جا رہی تھی تو مال روڈ سے گزرتے ایک کار پر نظر پڑی۔ اس میں بھٹو صاحب سوار تھے۔ وہ ہمارے آئیڈیل تھے۔ میں نے شور مچا دیا ''بھٹو، بھٹو، بھٹو!'' بس میں بیٹھے سبھی طلبہ و طالبات انھیں دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگے۔ انھوں نے بھی مسکرا کر جواباً ہاتھ ہلایا...... میری رگوں میں خون دوڑ گیا۔ تب حکمران عام لوگوں کی طرح عام گاڑیوں میں سفر کر لیا کرتے تھے، مگر وہ دن بیت گئے۔

یونیورسٹی میں لڑکیاں فلیپر پہنتی تھیں اور لڑکے جینز ٹی شرٹ وغیرہ! بھٹو صاحب کا عوامی سوٹ شلوار قمیص بھی فیشن کے طور پر پہنا جاتا۔ لڑکے لڑکیوں کی منڈلیاں تتلیوں اور بھنوروں کی طرح ادھر سے ادھر اڑتی پھرتیں۔ رنگ باتیں کرتے تھے۔ ضیا محی الدین نے کھیس کا کوٹ پہن کر ٹی وی پر شو شروع کیا۔ جب وہ کہتے ''ذرا ٹھیکا تو لگاؤ۔'' تو طبلے بجنے کے ساتھ ساتھ ہمارے اندر بھی کھلبلی مچ جاتی۔

پچھلے سال جانے میرے جی میں کیا سمائی، چالیس سال بعد اچانک یونیورسٹی کے نیو کیمپس جا پہنچی جو اب اتنا نیو نہیں رہا۔ وہاں کا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ میری عمر اور وضع قطع کی کوئی عورت شاید اب وہاں نظر نہیں آتی، اس لیے سب نے مجھے عجب نظروں سے گھورا۔ ایک اجنبی سی سرزمین تھی اور میں۔ نقاب میں ملبوس لڑکیاں اور اونچی شلواروں والے لڑکے الگ الگ بینچوں اور گھاس کے قطعوں پر بیٹھے تھے۔ مگر اب گھاس کی جگہ وہاں ننگی زمین تھی۔ راہداری کے ایک مخصوص حصے میں کھڑی ہو کر میں نے اس طرف نگاہ دوڑائی جہاں ٹیبل ٹینس کھیلا جاتا تھا۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اب اس جگہ فوٹو کاپی کی مشین نصب تھی۔

کیمپس کے آغاز میں کھڑے بوڑھے برگد نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے پتے مجھے دیکھ کر دھیمے، دھیمے مسکرا دیے۔ لڑکے لڑکیاں کانوں سے سیل فون لگائے مصروف نظر آئے، میں نے سوچا، بیتے دنوں میں محبت سیل فون، انٹرنیٹ اور کار کے بغیر بھی ہو جاتی تھی۔

زندگی کی کہانی لمبی ہے...... ہمیں سارے بیتے دن خوبصورت لگتے ہیں۔ وقت کا پہیہ اپنا چکر کاٹتا اور سب میں قطرہ قطرہ جیون بانٹتا ہے۔ یہ دن بھی اچھے ہیں کیونکہ میں زندہ ہوں۔ زندگی ایک تحفہ ہے اور تحفہ ایک خوشی! جب تک جان سلامت ہے، سب اچھا ہے۔ میں وقت کی ہوں اور وقت میرا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ پہلے دل میں درد ہوتا تھا اور اب ہڈیوں میں!

◆◆◆

شہید ٹیچر اپنے شوہر کے ساتھ
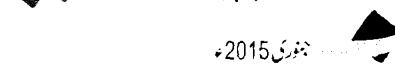
ہمت و دلیری کی تابندہ نشانی

مجھے اپنی بیگم پر فخر ہے

سانحے میں شہید ہونے والی ایک استانی کے شوہر
دل گداز انداز میں اپنے قلبی تاثرات بیان کرتے ہیں

بریگیڈیئر طارق سعید

ہماری قومی تاریخ میں "سقوطِ مشرقی پاکستان" کے باعث ۱۶؍دسمبر کا دن اداس و غمگین سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اب پاکستانی قوم خصوصاً بہت سے لوگ اسے سانحہ پشاور کے باعث بھی یاد رکھیں گے۔ ہمارے لیے سقوطِ مشرقی پاکستان کی طرح یہ بھی انتہائی دلدوز اور المناک واقعہ ہے۔ اس سانحے نے قوم کو بری طرح متاثر کیا جو عوام کے شدید ردعمل سے عیاں ہے۔

سانحہ پشاور میں میری بیگم، سیما نے بھی جامِ شہادت نوش کیا۔ انھوں نے صرف ایک ماہ قبل ۵؍نومبر کو آرمی پبلک اسکول میں شمولیت اختیار کی تھی۔ وہ ایک ماہرِ تعلیم تھیں۔ پچھلے سولہ برس سے آرمی اسکولوں میں طلبہ و طالبات کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہی تھیں۔

جب میری تعیناتی پشاور میں ہوئی، تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ بیگم وہاں اپنی ملازمت جاری نہیں رکھیں گی۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی توانائی پی ایچ ڈی ڈگری کے حصول میں صرف کریں۔

مگر سیما کو درس و تدریس کے عظیم کام سے عشق تھا۔ ان کی دیرینہ تمنا تھی کہ وہ نوجوان نسل کی تعلیم و

تربیت میں بھرپور حصہ تھیں۔ چناں چہ ان کے اصرار پر میں نے انھیں آرمی پبلک اسکول میں پڑھانے کی اجازت دے دی۔ وہ نرم لہجے میں گفتگو کرنے والی خاتون تھیں جن سے سبھی بچے محبت کرتے تھے۔ رحم دل تھیں اور اپنے کام سے مخلص!

جب ۱۶ دسمبر کو دہشت گردوں نے حملہ کیا، اسی دن سے خصوصاً سوشل میڈیا میں سانحے سے متعلق مختلف افواہیں اور کہانیاں گردش کرنے لگیں۔ سیما نے طلبہ کی زندگیاں بچانے کے لیے حملہ آوروں کا ہمت سے مقابلہ کیا، حتیٰ کہ اپنی جان قربان کر دی۔

شہادت کا یہ واقعہ جس شکل میں پیش آیا، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اس کا ذکر مجھے اذیت و درد سے دوچار کر دیتا ہے۔ مختصراً یہ کہ دہشت گردوں نے انھیں زندہ جلا دیا تھا۔

سوشل میڈیا میں اس بات کا بھی چرچا ہوا کہ پاک فوج کے جوان کچھ دیر بعد اسکول پہنچے۔ مزید برآں ہماری سکیورٹی فورسز پر ہمہ اقسام کی تنقید بھی ہوئی۔ اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ پشاور کے صرف کینٹ ایریا میں ''۸۴'' اسکول واقع ہیں۔ جبکہ شہر میں اسکولوں کی تعداد کئی سو تک جا پہنچتی ہے۔ چونکہ افرادی قوت محدود ہے۔ اس لیے تمام اسکولوں کو دہشت گردی سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔

سانحہ پشاور نے میری دنیا اندھیر اور میرا خاندان اُجاڑ دیا۔ تاہم حملے کے بعد سکیورٹی فورسز خصوصاً پاک فوج کے جوان جس پھرتی و مستعدی سے اسکول پہنچے، اس پر میں انھیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔

تنقید کرتے ہوئے ہم یہ سچائی فراموش کر بیٹھے کہ جب حملہ آور داخل ہوئے، اسکول میں ۱۱۰۰ بچے موجود تھے۔ ان میں سے ۹۵۰ کو بحفاظت نکال لیا گیا۔ اگر ہمارے جوان اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر مردانہ وار ''درندوں'' کا مقابلہ نہ کرتے، تو نجانے مزید کتنے ہی طلبہ جان کی بازی ہار جاتے۔

خاص طور پر ایس ایس جی (اسپیشل سروسز گروپ) کے جوانوں نے جس دلیری اور شجاعت کا ثبوت دیا، وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ انھوں نے کمال مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ہر حملہ آور کو ٹھکانے لگایا اور کوئی بھی ان کی زد سے بچ کر فرار نہیں ہو سکا۔

میں ان تمام جوانوں کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں جو دہشت گردوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئے۔ میری تمام ہم وطنوں سے اپیل ہے کہ سکیورٹی فورسز پر تنقید کے بجائے اُن کی بہادری اور فرض شناسی کو سراہا جائے۔

اگر تحریکِ طالبان پاکستان کا مقصد یہ تھا کہ وہ حملے سے پاکستانی قوم اور پاک افواج کو خوفزدہ کر دے گی، تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے غلط دشمن کا انتخاب کیا ہے۔

میں اپنی بیگم کی شہادت کے باعث دل گرفتہ ہوں۔ آخر انسان ہوں اور اپنی ایک قیمتی متاع کھو بیٹھا۔ مگر میں ہرگز خوفزدہ نہیں اور نہ ہی مجھے کسی قسم کی گھبراہٹ ہے۔ بلکہ دہشت گردوں سے مقابلہ کرنے کا میرا جوش و ولولہ کئی گنا زیادہ بڑھ گیا۔

مجھے فخر ہے کہ میری بیگم نے دلیری سے جامِ شہادت نوش کیا اور دہشت گردوں کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔ انھوں نے بے مثال ہمت کا مظاہرہ کر کے اپنے خاندان ہی نہیں پوری قوم کو سرخرو کر دیا۔ نیز وطنِ عزیز میں مثبت تبدیلی کی نقیب بن گئیں۔

آخر میں مع اہلِ خانہ میں ان تمام خواتین و حضرات کا شکرگزار ہوں جنھوں نے اس مشکل گھڑی ہمارا دکھ بانٹا اور ہمیں حوصلہ عطا کیا۔

سیما! تم نے دین و وطن کی خاطر اپنا لہو بہا دیا اور قرآن پاک کے مطابق تم ابدی زندگی پا چکیں۔ تم ہمیشہ ہماری یادوں میں بسی رہو گی اور ہم تاحیات تمھاری عدم موجودگی محسوس کرتے رہیں گے۔

وقت سے پہلے ہی جنم لیتی

سانحہ پشاور کی مہیب گونج

اُردو ڈائجسٹ میں شائع شدہ تحریروں سے ان چشم کشا اقتباسات کا انتخاب جن میں قومی المیے کی پیشین گوئی کر دی گئی تھی اور ایسے سانحات سے نمٹنے کے لیے قابل عمل تجاویز بھی بتائی گئی تھیں

سجاد قادر

نوبل انعام یافتہ ڈینش طبیعات دان، نیلز بوہر کا قول ہے: ''پیشین گوئی کرنا بہت کٹھن کام ہے، خصوصاً جب وہ مستقبل کے متعلق ہو۔'' تاہم صاحبان عقل و دانش اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے کر مستقبل کے اندر جھانکنے کی سعی ضرور کرتے ہیں۔ اس حقیقت کی ایک مثال اردو ڈائجسٹ کے سابقہ شماروں میں شائع ہونے والی تحریریں اور انٹرویوز ہیں۔

یہ تحریریں آشکارا کرتی ہیں کہ ہم مسلسل ارباب اقتدار کو خبردار کر رہے تھے کہ ''سانحہ پشاور'' جیسا انتہائی الم ناک واقعہ کسی بھی وقت ظہور پذیر ہوسکتا ہے۔ عوام و خواص کو تنبیہ دی گئی کہ اگر ہوش سے کام لے کر انتہا پسندی پر قابو نہ پایا گیا، تو یہ ہولناک صورت اختیار کر سکتی ہے۔ ذیل میں انہی انتباہی تحریروں کا آنکھیں کھول دینے والا انتخاب پیش خدمت ہے۔

واضح سمت کا فقدان

دہشت گردی اور فرقہ پرستی کے ڈانڈے آپس میں گڈمڈ ہو چکے ہیں جن کے سامنے حکومت بے بس دکھائی دیتی ہے اور قومی سلامتی کے ادارے بھی ہر لحظہ دباؤ میں ہیں۔ اس خون آشام صورت حال کے بارے میں معاشرے کے اندر گہری تشویش تو پائی جاتی ہے مگر ہماری قومی قیادت، ہماری عدلیہ اور ہماری فوج ایک واضح سمت اختیار کرنے سے گریزاں ہیں۔ ہمارے بعض سیاسی اور مذہبی قائدین اسی ہولناک دہشت گردی کو امریکی سازشوں کا شاخسانہ قرار دے رہے ہیں اور انھیں فرقہ وارانہ تشدد میں بھی سراسر غیرملکی طاقتوں کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے۔

ان کے خیال میں امریکا اور برطانیہ کی ظالمانہ پالیسیوں کے نتیجے میں حریت پسند لوگ اپنی آزادی کے لیے خودکش حملوں کا ہتھیار استعمال کرنے پر مجبور ہیں، جن کے جذبوں اور قربانیوں کا احترام کیا جانا چاہیے۔ انھیں اس امر کا بھی پورا یقین ہے کہ افغانستان میں قابض فوجوں کے انخلا سے دہشت گردی ختم ہو جائے گی اور فرقہ وارانہ تشدد بھی رک جائے گا، اسی لیے امریکا اور اس کے حواریوں کے خلاف جہادی سرگرمیاں تیز تر کر دینا ہمارے تمام تر مسائل کا حل ہے۔ (ہم کہاں کھڑے ہیں، مارچ ۱۳، صفحہ ۱۶)

طالبان کا مکمل صفایا

کچھ ایڈیٹروں، کالم نگاروں اور ٹی وی اینکرز نے خفیہ ایجنسیوں پر الزام لگایا ہے کہ وہ دہشت گردوں کی پشت پناہی کرتی اور انھیں اپنا اثاثہ سمجھتی آئی ہیں، اسی لیے ان کے خلاف نتیجہ خیز آپریشن کرنے سے اجتناب کیا جا رہا ہے۔ بعض دوستوں نے یہ بھی کہا کہ ریاست کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ آج ہم مذہبی شدت پسندی اور دہشت گردی کے جس الاؤ میں جل رہے ہیں، وہ اسی تعلق کے نتیجے میں سالہا سال سے دہک رہا ہے۔

ایک دانش ور صحافی نے یہ نکتہ اٹھایا کہ پاکستان طالبان کا موقف یہ ہے کہ پاکستان افغانستان میں غاصب فوجوں کی اعانت کر رہا ہے، اس لیے ہم اس سے لڑنے پر مجبور ہیں۔ اب غور طلب نکتہ یہ ہے کہ جب افغانستان میں برسرِ جنگ طالبان سے مذاکرات کیے جا سکتے ہیں، تو پاکستانی طالبان سے کیوں نہیں؟ ایک رائے یہ بھی تھی کہ طالبان کا مکمل صفایا ہونے تک پاکستان میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ (ہم کہاں کھڑے ہیں، مارچ ۱۳، صفحہ ۲۱)

غلط پالیسیاں

ہمارے مسائل بہت گہرے اور الجھے ہوئے ہیں۔ ساٹھ پینسٹھ برسوں کی نااہلیوں اور حماقتوں نے پاکستان میں انتہا پسندوں، دہشت گردوں اور علیحدگی پسندوں کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ہماری خود غرضیوں، ہولناکیوں اور عوام دشمنیوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اختصار کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری بیشتر قیادتیں جن میں سیاسی اور عسکری برابر کی شریک ہیں، معاشرے

کو اسلام کے بنیادی اصولوں اور تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھیں، کیونکہ انھیں اپنی اصل طاقت بنانے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ تعلیم، صحت اور ذرائع آمدورفت کی بنیادی ضرورتوں پر بجٹ کا بہت کم حصہ خرچ کیا گیا اور معیاری تعلیم کے ذریعے معیاری قوم کی تعمیر کبھی اولین قومی ترجیحات میں شامل نہ ہوسکی۔ ایسی اقتصادی پالیسیاں وضع کی گئیں جن سے امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتے گئے۔ ایوب خاں کی معاشی خوشحالی کا ماحصل یہ تھا کہ بائیس خاندان پورے ملکی وسائل کے مالک بن گئے۔ (ہم کہاں کھڑے ہیں، اکتوبر ۱۳، صفحہ ۲۵)

کچھ تجاویز

ہم ان خوں آشام حالات میں بہتری لانے کے لیے چند تجاویز پیش کرتے ہیں:

۱۔ کراچی ہو یا بلوچستان یا فاٹا، ان میں خونریزی اور قتل و غارت گری کی جو المناک صورت حال بن گئی ہے، وہ پچیس تیس برسوں کی غلط یا غیر متوازن پالیسیوں کا نتیجہ ہے، اس لیے ان کی اصلاح کے لیے ہمیں تمام اسٹیک ہولڈرز کی مشاورت سے ایک طویل المعیاد منصوبہ تیار کرنا اور پوری ثابت قدمی سے اسے عملی جامعہ پہنانا ہوگا۔ آج کی انتہائی دھماکا خیز صورت حال کے تجزیے کے لیے ایک قومی کمیشن تشکیل دینے کی ضرورت ہے جس میں جہاں دیدہ سیاست دانوں کے علاوہ عمرانی علوم کے ماہرین، جدید فکر کے حامل علمائے کرام، صحافی اور دانشور بھی شامل ہوں۔

اس کمیشن میں اچھی شہرت رکھنے والے ریٹائرڈ پولیس اور فوجی افسروں اور سفارت کاروں کی بھی خدمات حاصل کی جائیں۔ اس کمیشن کو سماجیات اور سیاسیات پر تحقیق کرنے والے اہل علم کی اعانت حاصل ہونی چاہیے۔ یہ کمیشن حکومت کو فوری اقدامات کی بھی سفارش کر سکے اور ان انتظامات کی بھی جن کے ذریعے امن کی قوتوں کو استحکام حاصل ہو اور مائنڈ سیٹ میں جوہری تبدیلی واقع ہو۔

۲۔ گزشتہ دس بارہ برسوں سے دہشت گردی کا مقابلہ، فوج، پولیس اور ایف سی کر رہے ہیں۔ انھوں نے کمال بہادری اور نظم و ضبط کا ثبوت دیا ہے اور ہماری تاریخ ان کی قربانیوں سے دمک رہی ہے۔ وہ فرنٹ لائن پر ہیں اور اے پی سی کے ذریعے انھیں زبردست سیاسی کمک پہنچی ہے۔ اگر پوری قوم کی حمایت سے مذاکرات کامیاب ہو جاتے ہیں، جن کے قوی امکانات پائے جاتے ہیں، تو اس کے غیر معمولی داخلی اور خارجی اثرات مرتب ہوں گے دہشت گردی کے خلاف جنگ ستمبر ۲۰۰۱ء سے جاری ہے جس کے نتیجے میں پاکستان پہلے سے زیادہ زخمی نظر آتا ہے۔

ہم اگر حکومت اور معاشرے کی سطح پر اسلامی شعائر کا احترام پوری طرح کر سکیں اور وی آئی پی کلچر کے مظاہر کم کرتے جائیں، تو مذاکرات کے لیے تیس میں سے بیس پچیس گروپ ضرور تیار ہو جائیں گے۔ سیاسی قیادت کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مذاکرات میں عسکری قیادت ہی کلیدی کردار ادا کرے گی اور عسکری قیادت کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ فوج اس وقت ''وارزون'' میں ہے۔

۳۔ سیاسی اور فوجی قیادتیں حساس پوائنٹس پر دباؤ بڑھا کر دہشت گرد تنظیموں کو اس معاہدے پر رضا مند کر سکتی ہیں کہ وہ عبادت گاہوں، ہسپتالوں، شہری، بستیوں، ریل گاڑیوں اور بسوں پر راکٹ برسائیں گے، نہ خودکش حملے کریں گے، نہ فرقے اور نسل کی بنیاد پر عورتوں اور بچوں

کوموت کے گھاٹ اتاریں گے۔ اس کے عوض حکومت کی طرف سے عام معافی کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ داخلی سکیورٹی کی بنیادی ذمے داری پولیس کی ہے جو اس وقت ایک سے زیادہ بحرانوں کا شکار ہے۔ سیاسی حکومتوں نے اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے ہزاروں کی تعداد میں سیاسی بنیادوں پر بھرتیاں کی ہیں جن سے اس فورس کی غیر جانب داری بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ دوسری طرف جب یہ دیانت دار فرض شناس افسر مجرموں پر ہاتھ ڈالتے ہیں، تو ممبران اسمبلی انھیں چھڑا کر لے جاتے ہیں۔ تیسرا طرف پولیس میں کرپشن عام ہے اور وہ پیسے بٹورنے کے لیے عام آدمی پر ظلم ڈھاتی ہے۔ چناں چہ پولیس اور عوام کے درمیان اعتماد کا رشتہ ٹوٹا ہوا ہے۔

چوتھی طرف اس کی ٹریننگ پرانی طرز کی ہے اور اس کے ہتھیار دہشت گردوں کے مقابلے میں نہایت فرسودہ اور غیر موثر ہیں۔ خطرناک حالات متقاضی ہیں کہ بتدریج ایک نئی پولیس فورس تیار کی جائے جس کی ٹریننگ اور ملازمت کے قواعد فوجی معیار کے ہوں۔

۵۔ سب سے ضروری بات یہ کہ میڈیا دہشت گردی میں آب وتاب پیدا کرنے سے اجتناب کرے۔ ایک ہی منظر بار بار دیکھنے سے عوام ذہنی مریض بن جانے کے ساتھ ساتھ دہشت زدہ نظر آتے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر ایسے پروگرام پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں اسلامی تعلیمات کی صحیح روح ناظرین تک پہنچائی جائے اور ایک ایسی فضا تیار کی جائے جس میں عوام اپنے اندر مزاحمت کی طاقت پیدا کریں اور مجرموں اور دہشت گردوں کے سامنے فوری طور پر سرنڈر نہ کریں۔ جرائم پیشہ عناصر اور انتہا پسند بنیادی طور پر بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ ہمیں نوجوانوں کے لیے صحت مند سرگرمیوں کا ایک جال بچھانا اور ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا رخ ایک عظیم اور مضبوط ریاست کی تعمیر کی طرف موڑ دینا ہوگا۔

وزیراعظم نواز شریف نے ان کے لیے چھے منصوبوں کا اعلان کیا ہے جو ہمارے وطنِ عزیز کی تقدیر بدل سکتے ہیں، مگر اس کے لیے بڑے خلوص، پوری شفافیت اور قومی وسائل کے نہایت عمدہ استعمال کا عملی ثبوت دینا ہوگا۔ محبت، عفو و درگزر اور حُسنِ تدبیر سے ایک دنیا فتح کی جا سکتی ہے۔ (پائنا کے زیراہتمام ایک سمینار، ہم کہاں کھڑے ہیں، اکتوبر ۱۳ء صفحہ ۴۵)

قابلِ عمل روڈ میپ

پنجاب کے سوا تینوں صوبے دہشت گردی اور سنگین مسائل کی لپیٹ میں ہیں۔ بلوچستان میں فرقہ وارانہ دہشت گردی کے علاوہ لاپتا افراد اور مسخ شدہ لاشوں کا معاملہ گھمبیر اور پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق جسٹس (ر) جاوید اقبال کی سربراہی میں لاپتا افراد پر جو کمیشن قائم ہوا تھا۔ اس نے ایف سی، خفیہ ایجنسیوں اور پولیس کے حاضر سروس حکام پر فوجداری کے مقدمات قائم کرنے کی سفارش کی ہے۔ سندھ میں کراچی کا زخم ناسور بنتا جا رہا ہے اور آئے دن لوگ قتل اور اغوا کیے جا رہے ہیں اور بدامنی تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے۔ خیبر پختونخواہ میں بھی حالات بڑے سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ ادھر وفاقی دارالحکومت اسلام آباد لینڈ مافیا کے نرغے میں ہے اور ایک انتظامی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ ان حالات میں جناب وزیراعظم پر لازم آتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر قیادت فراہم کریں اور صوبوں میں امن وامان قائم کرنے کے لیے مثبت قوتوں کو قومی پلیٹ فارم پر جمع کریں اور اپنی خوئے دلنوازی سے انھیں شیر وشکر کر دیں۔

پاکستانی طالبان سے مذاکرات کی بات بیشتر سیاسی قائدین کرتے آئے ہیں، مگر اس کا ایک قابل عمل روڈ میپ تیار کرنے میں بعض رکاوٹیں حائل ہوتی رہی۔ ایک بڑا سبب یہ ہے کہ عسکری قیادت کے علاوہ ملک میں ایک بڑا طبقہ ان عسکریت پسندوں سے مذاکرات کے حق میں نہیں جو دستور پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے، جمہوریت کو اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں اور ملک میں ایک ایسی شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں جسے عامۃ المسلمین قبول کرنے کو تیار نہیں۔ یہ بھی ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ دہشت گردوں نے ہمارے ہزاروں فوجی جوان اور افسر شہید کیے ہیں اور چالیس ہزار سے زائد شہری موت کی نیند سلا چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں مسجدیں محفوظ ہیں نہ امام بارگاہیں، نہ جنازے کی نماز ادا کرنے والے غم گسار۔

ایسے میں نکتہ آغاز کی تلاش جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، تاہم صورت حال میں جوہری تبدیلی یہ آئی ہے کہ امریکا افغان طالبان سے قطر میں باقاعدہ مذاکرات کا سلسلہ شروع کرنے والا ہے۔ اس بنیاد پر پاکستانی طالبان کو تشدد کی روش چھوڑنے پر تیار کیا جا سکتا ہے۔ فوج نے جنوبی وزیرستان میں ان کی طاقت پر کاری ضرب لگائی ہے اور اس امر کا امکان پیدا ہو چلا ہے کہ انھیں افغانستان سے کمک پہنچنا بند ہو جائے۔ پاکستانی طالبان چوں چوں کا مربہ ہیں اور ان کی باقاعدہ بائی کمان موجود نہیں۔ اس کا قوی امکان ہے کہ ان میں سے ایک خاصی بڑی تعداد علمائے کرام کے سمجھانے سے راہ راست پر آجائے اور ہارڈ کور تنہا رہ جائیں۔ انھیں یہ ضمانت دی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے دستور میں جو اسلامی اصول درج ہیں، ان کے مطابق معاشرے کی تعمیر کی جائے گی۔ (کچھ اپنی زبان میں، شمارہ جولائی ۱۳ء صفحہ ۱۹)

ہمیں ایک ایسی جارحانہ حکمت عملی درکار ہے جس پر وطن عزیز کی تمام سیاسی جماعتوں کا اتفاق اور جس کے قابل عمل ہونے کا افواج پاکستان کو یقین ہو، تیار کر کے قوم کو ذہنی و جسمانی تربیت کے ذریعے دشمن کے خلاف صف آرا کرنا ہوگا۔ عام شہریوں کی جسمانی تربیت کے لیے شہری دفاع کے محکموں کی ازسر نو تعمیر، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا کو فوجی تربیت جیسے NCC اور اسکاؤٹنگ وغیرہ کا احیاء اور وطن سے محبت کے جذبے کو قوم کے دلوں میں بیدار کرنے کے لیے میڈیا کے ذریعے ''نشانِ حیدر'' جیسے ڈراموں، ملی نغموں، 23 مارچ کے موقع پر مسلح افواج کی پریڈ اور دفاعی ساز و سامان کی نمائش جیسے پروگرامز وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ (مینجنگ ایڈیٹر نوٹ، شمارہ ستمبر ۱۳ء)

دشمن گلی کوچوں میں

''کھلی جنگ'' کے بارے میں یہ تلخ حقیقت پیش نگاہ رہنی چاہیے کہ یہ ایک انتہائی پیچیدہ معاملہ ہے کیونکہ داخلی دشمن ہمارے گھر کے اندر پہنچ گیا ہے اور وہ گلی کوچوں، شہروں اور قصبوں تک پھیل چکا ہے جسے بیرونی طاقتوں کی سرپرستی بھی حاصل ہے جو پاکستان کو شدید عدم استحکام سے دوچار کر دینا چاہتی ہیں، چنانچہ وہ ان دہشت گردوں کو فنڈز اور اسلحہ فراہم کرتی اور طرح طرح کے تعصبات اور تنازعات کو ہوا دیتی رہتی ہیں۔ ان عسکریت پسندوں نے مذہبی جنون پیدا کر کے نوجوانوں کو جنت میں داخل ہونے کے خواب دکھائے ہیں اور مسلمانوں پر کافروں کے لیبل چسپاں کر دیے ہیں۔

غربت، جہالت اور پس ماندگی بھی دہشت گردی میں اضافے کا باعث بنی ہوئی ہیں، جبکہ یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ اور طالبات بالائی طبقات کی غیر اسلامی

زندگی کے خلاف شدید نفرت رکھتے اور پورے نظام کو تلپٹ کر دینا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں "کھلی جنگ" میں یقینی کامیابی حاصل کرنے کے لیے عام شہریوں، ہماری پولیس، ہماری سول آرمڈ فورسز، ہماری مسلح افواج اور ہماری انٹیلی جنس ایجنسیوں کے درمیان مثالی کوآرڈینیشن اور ان کی جدید خطوط پر تربیت از حد ضروری ہے۔ اس وقت قومی سلامتی اور بقا معاشرے کے ہر طبقے سے ایثار اور غیر متزلزل عزم کا تقاضا کر رہی ہیں۔ (کچھ اپنی زبان میں، ستمبر شمارہ ۱۳، صفحہ ۱۶)

ہم آہنگی کی ضرورت

حالات ہمیں جس موڑ پر لے آئے ہیں، وہ قومی سلامتی کی ایک واضح پالیسی فوری طور پر تشکیل دینے کے متقاضی ہیں۔ سول اور فوجی قیادت کو آپس میں ہم آہنگی پیدا کر کے تمام ریاستی اداروں کو دہشت گردی، علیحدگی پسندی اور خونریزی پر قابو پانے کے لیے ایک نئے ویژن اور ایک نئے عزم کے ساتھ تیار کرنا ہوگا۔ ہمیں اس انتہائی سنگین حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ ہمیں جس جنگ کا سامنا ہے وہ غیر روایتی ہے اور ہماری فوج، ہمارے رینجرز، ہماری پولیس اور ہماری انٹیلی جنس ایجنسیاں اس ہولناک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح مسلح اور مستعد نہیں۔ (ہم کہاں کھڑے ہیں، شمارہ ستمبر ۱۳ء)

کھیل کی قیمت

پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے دانشوروں اور تجزیہ نگاروں نے میڈیا کے ذریعے عوام کو صحیح سمت کی طرف راہنمائی کے بجائے مزید الجھن میں ڈال دیا ہے۔ سیاستدان بھی مسئلہ کی گہرائی میں جائے بغیر جذباتی بیانات دے کر ملکی سلامتی سے کھیل رہے ہیں۔ اس خطے کی تاریخ اور یہاں بسنے والوں کی قدیم روایات کے گہرے ادراک کے بغیر دہشت گردی کی وجوہات کا سراغ لگانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوگا۔ تاریخ کے اوراق سازشوں، بغاوتوں اور جنگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بیٹے نے باپ سے اور بھائی نے بھائی سے تخت چھینا اور ان کو اندھا کر کے قید میں ڈال دیا۔ اقتدار کی جنگوں میں لاکھوں لوگ بے رحمی سے قتل کیے جاتے رہے۔

افغانستان اپنے منفرد محل وقوع کی وجہ سے عالمی طاقتوں اور مہم جوؤں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ قبائل کی باہمی دشمنی، اقتدار اور دولت کی ہوس نے ہمیشہ بیرونی جنگجوؤں کی حوصلہ افزائی کی۔ یہاں علاقائی بالادستی کے لیے ترکوں، ایرانیوں، انگریزوں، روسیوں اور امریکیوں سب نے زور آزمائی کی۔ افغانستان آج بھی عالمی طاقتوں کی چراگاہ بنا ہوا ہے۔ طاقت اور اقتدار کا کھیل جاری ہے اور پاکستان دہشت گردی اور بدامنی کی دلدل میں گھرا اس کھیل کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ (مینیجنگ ایڈیٹر نوٹ، مارچ ۱۴ء)

اشرافیہ کا اسلوب زندگی

ہمارے ملک میں حالات جس رخ پر جا رہے ہیں، اس کے باعث ہماری سوسائٹی بڑے پیمانے پر اتھل پتھل ہونے والی ہے جس کے نتیجے میں بلند، بے حد پست اور انتہائی پست، بہت بلند ہو جائیں گے۔ ہمارے حکمران طبقے اور اشرافیہ نے جو اسلوبِ زندگی اختیار کر رکھا ہے اور امیر اور غریب کے درمیان جو ہولناک فاصلے پیدا ہو چکے ہیں، ان کے بطن سے ایک خونریز انقلاب جنم لینے والا ہے۔ اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے لیے پوری قوم کو وہ پیمان وفا نبھانا ہوگا جس کا اعلان

قراردادِ مقاصد میں 13 مارچ 1949ء کو قائدِ ملت نوابزادہ لیاقت علی خاں کی قیادت میں ہوا تھا جو حضرت قائداعظم کے دستِ راست کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ عہد یہ تھا کہ اقتدار ایک مقدس امانت ہے جسے عوام کے چنے ہوئے نمائندے اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی حدود میں استعمال کرنے کے مجاز ہوں گے۔

اس امانت میں خیانت ہی کا جو سلسلہ شروع ہوا' وہ ریاست اور معاشرے میں تمام تر فساد کا ذمے دار ہے اور ایک مدت سے کرپشن' بددیانتی' بدانتظامی' اقرباپروری' دغابازی اور عیش پرستی سماجی قدروں کا مقام حاصل کر چکی ہیں۔ مغرب میں حکمران عام لوگوں کی طرح رہتے اور قانون اور میرٹ کی سختی سے پابندی کرتے اور عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کے لیے کمربستہ رہتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے شہریوں کے ساتھ وابستہ رہنے کا ایک پیمانِ وفا باندھ رکھا ہے جس کی وہ پابندی کرتے ہیں جبکہ ہم نے اپنے رب سے بارِامانت اُٹھانے کا جو عہد کیا تھا' اُسے نہایت بے خوفی اور ڈھٹائی سے پاؤں تلے روندتے چلے جارہے ہیں۔

ہم اگر حقیقی امن چاہتے ہیں تو غریب کو اُس کا حق دینا اور ظالم کا ہاتھ جھٹک دینا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سب کو برابر شریک رکھنا ہوگا۔ اسلام جو بنی نوعِ انسان کے لیے مکمل ضابطۂ ہدایت ہے' اُس کے شعائر کا احترام اور اُس کے اجتماعی عدل کا فروغ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔(کچھ اپنی زبان میں، مارچ ۱۴ء)

ایک غلط فیصلہ

اکثر اوقات عجلت میں ایسے ایسے فیصلے سرزد ہو جاتے ہیں جن کی سزا آنے والی نسلیں بھی بھگتتی رہتی ہیں جیسا کہ جنرل پرویز مشرف نے نائن الیون کے فوراً بعد پاکستان کے زیادہ تر فضائی اڈے اتحادی فوجوں کے حوالے کر دیے تھے جہاں سے افغانستان پر بمباری کرنے کے لیے پچاس ہزار سے زائد پروازیں کی گئیں تھیں اور افغانستان کو کھنڈرات میں تبدیل کرنے کا عمل مہینوں اور برسوں تک جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں پاکستان بین الاقوامی دہشت گردوں کے نرغے میں آ گیا۔

بارہ برسوں کے دوران مذہبی شدت پسندوں اور دہشت گردوں کے ہاتھوں پچاس ہزار شہری شہید ہو چکے ہیں، پانچ ہزار سے زائد وردی میں ملبوس جاں نثار جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں۔ ملکی معیشت کو اسی ارب ڈالروں کا نقصان ہوچکا ہے۔ اس غلط فیصلے نے اس خطے اور پورے عالمِ عرب کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے اور پاکستان کے مختلف حصوں میں خون کا دریا تھمنے کا نام نہیں لے رہا۔

جمہوریت میں اچھا نظم ونسق چلانے کے مسلمہ اصول ہیں جن پر جہاں جہاں عمل ہوتا ہے، بہت اچھے نتائج سامنے آتے ہیں۔ پہلا اصول یہ کہ فیصلے کابینہ میں کیے جائیں اور وزرائے کرام اپنے اپنے دائرے میں نظمِ حکومت چلانے کے ذمے دار ہوں۔ دوسرا یہ کہ اقتدار و اختیار نچلی سطح تک عوام کو تفویض کیا جائے۔ تیسرا یہ کہ سرکاری انتظامیہ کو سیاسی اثرات سے محفوظ رکھا جائے اہل، دیانت اور فرض شناس لوگوں کا میرٹ پر تقرر کیا جائے اور سینیئر افراد کو قیادت سونپی جائے۔ وزراء اپنی کارکردگی کے لیے منتخب اداروں کے سامنے جواب دہ ہوں اور ان کے احتساب کا ایک خود کار نظام بھی کام کر رہا ہو۔ جمہوری حکومتوں میں آزاد عدلیہ اور میڈیا کی بڑی اہمیت ہے کہ وہ آئین اور قانون کی حکمرانی کو یقینی بناتی اور رائے عامہ کی تشکیل کرتی ہے۔
(کچھ اپنی زبان میں، اپریل ۱۴ء)

سمجھو کچھ غلط ہے!

پرسون جوشی بھارت کے ممتاز شاعر و ادیب ہیں۔ مشہور فلم ''تارے زمین پر'' میں انتہائی جذبات انگیز گانے لکھ کر پاک و ہند میں شہرت پائی۔ المیہ پشاور سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک منفرد نظم لکھی جو پیش خدمت ہے:

جب بچپن تمہاری گود میں آنے سے کترانے لگے
جب ماں کی کوکھ سے جھانکتی زندگی
باہر آنے سے کترانے لگے
سمجھو کچھ غلط ہے

جب تلواریں پھولوں پر زور آزمانے لگیں
جب معصوم آنکھوں میں خوف نظر آنے لگے
سمجھو کچھ غلط ہے

جب کلکاریاں سہم جائیں
جب توتلی بولیاں خاموش ہو جائیں
سمجھو کچھ غلط ہے

کچھ نہیں بہت کچھ غلط ہے
کیونکہ زور سے بارش ہونی چاہیے تھی پوری دنیا میں
ہر جگہ ٹپکنے چاہئیں تھے آنسو
رونا چاہیے تھا اُوپر والے کو آسمان سے
پھوٹ پھوٹ کر
شرم سے جھکنی چاہیے تھیں انسانی گردنیں
یہ سوچ کا وقت ہے
ماتم نہیں سوالوں کا وقت ہے
اگر اس کے بعد بھی انسان
سر اُٹھا کر کھڑا ہو سکتا ہے
سمجھو کے کچھ غلط ہے

غم واندوہ تصاویر کے آئینے میں

وزیراعظم نواز شریف اور جنرل راحیل زخمی طالب علم کی ہمت بندھاتے ہوئے

ہمارے شاہین صفت کمانڈوز فوراً حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے

جہاں علم کی دولت تقسیم ہوتی ہے، وہاں ظالموں نے موت بانٹ دی

اے پاک باز روحو! وطن کی ہوائیں تمھیں سلام کہتی ہیں

کیپٹن گل شیر (کرنل قاسم) نے طلبہ کی عیادت کر کے انھیں مسکراہٹ کا تحفہ عطا کیا
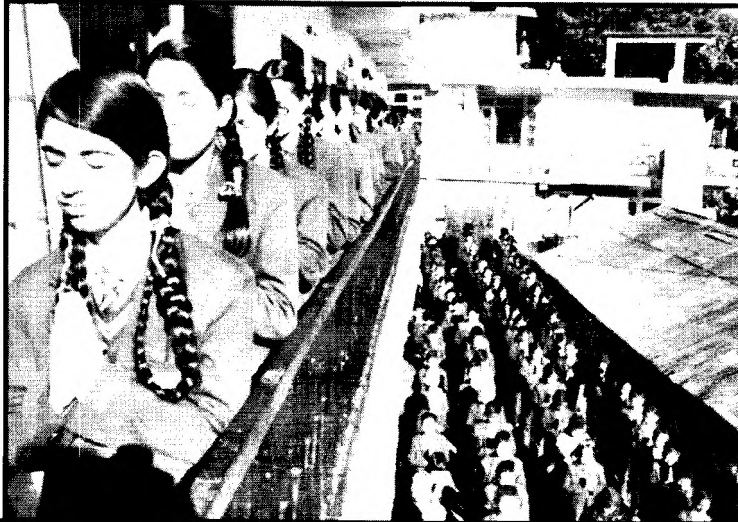
بھارتی اسکولوں میں شہید پاکستانی طلبہ کو خراج تحسین پیش کیا گیا

دکھ کا نیا پیغام

سیکڑوں معصوموں کے اندوہناک قتل عام سے کیا شدت پسندی کی آگ بجھ سکے گی؟

رافعیہ زکریا

۱۶/ دسمبر۲۰۱۴ء کی صبح آرمی پبلک اسکول پشاور میں امتحان کا وقت تھا اور زیادہ تر بچے امتحان ہال سے باہر کھڑے پرچہ شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

صرف ایک رات پہلے زبردست رٹے لگائے گئے ہوں گے، آخری منٹ میں کچھ سوال یاد کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی اور طلبہ سوچ رہے ہوں گے کہ وہ امتحان میں کیسی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔

ان کے ذہن صرف اور صرف ایک بات پر متوجہ ہوں گے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے دوستوں سے زیادہ نمبر حاصل کر لیے جائیں۔ انھوں نے مرنے کے بارے میں' تو بالکل بھی سوچا نہیں ہوگا۔

لیکن اسی وقت انھیں مارنے کے لیے ان کے قاتل قبرستان سے ملحق دیوار پھلانگ کر اندر آئے اور پہلے گراؤنڈ میں فائرنگ کی۔ اس کے بعد وہ امتحان ہال کی جانب پہنچے۔

خود کو بچانے کے لیے طلبہ زمین پر لیٹ گئے اور اپنے جسموں کو ان گولیوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگے، جو ان کی جان لینا چاہتی تھیں۔ لیکن سنگدل مارنے ہی کے لیے آئے تھے اور عینی شاہدین کے مطابق فائرنگ میں کسی قسم کی افراتفری اور جلد بازی نہیں کی گئی۔

قاتلوں نے ایک ایک کر کے قتل کیے، پہلے ایک بچے پر گن تانی' پھر دوسرے اور پھر تیسرے پر...... اور اس طرح تب تک یہ کھیل جاری رہا جب تک تعداد سو سے اوپر نہیں پہنچ گئی۔

اب یہ بچے خاموش ہیں اور اپنی اپنی قبروں میں جا چکے۔ ملک پھر حالتِ سوگ میں ہے' صدمے میں ہے اور بربریت کی اس بدترین مثال پر ایک بار پھر غصے میں ہے۔

پاکستان میں جذبات کے اظہار کا پھٹ پڑنا عام طریقہ ہے۔ پچھلی ایک دہائی سے اس طرح کے حملے معمول بن چکے ہیں' تو آنسو بھی کچھ عرصہ بہنے کے بعد سوکھ جاتے ہیں اور زیادہ کچھ تبدیل نہیں ہوتا۔

اگر اس طرح کے حملے کے امکان پر غور کیا گیا ہوتا' تیاری اور سیکیورٹی بڑھائی گئی ہوتی، تو شاید یہ ظلم جنم نہ لیتا، اس پر غصہ نہ آتا...... اور پھر بھول جانا بھی نہ پڑتا!

اعداد و شمار سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اس کے امکانات موجود تھے۔ عالمی اتحاد برائے تحفظ تعلیم (Global Coalition to Protect Education from Attack) کی رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۹ء سے لے کر ۲۰۱۲ء کے درمیان پاکستان بھر میں اسکولوں پر ۸۰۰ سے زائد حملے ہو چکے۔

گویا ایک دو نہیں بلکہ قتلِ عام کی ''۸۰۰'' دھمکیوں کو یا تو کچرے میں ڈال دیا گیا یا اخبارات کے پچھلے صفحوں پر۔

ہیروشیما پر ایٹم بم گرنے کے بعد جاپانیوں نے مرنے والوں کی یاد میں ایک یادگار تعمیر کی۔ بہت ہی مشکلوں سے انھوں نے مرنے والوں کے زیرِ استعمال رہنے والی مختلف چیزوں کے بچے کھچے آثار جمع کیے تاکہ وہ انھیں اس بات کی یاد دلاتے رہیں کہ انسان کس قدر گر سکتا ہے۔

ان یادگار اشیا میں سے جو سب سے زیادہ دل توڑ دینے والی چیزیں مرنے والے بچوں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں آدھا کھایا ہوا لنچ، نامکمل کا پیاں اور خون آلود یونیفارم شامل ہیں۔

وہ جاپانی بچے اب نہیں رہے، لیکن کم از کم ان کو یاد رکھا جائے گا، ان کی معصومیت...... لافانی معصومیت کئی دہائیوں سے انسانیت کی اس مجرمانہ بے حسی کا نوحہ پڑھ رہی ہے۔

لیکن پاکستان میں جہاں نوجوان، بچے، بوڑھے، سبھی دہشت گردوں کی وحشت کا نشانہ بنے ہیں، وہاں شاید اس طرح کی کوئی بھی ماضی کی یادگار تعمیر کرنے کی توقع نہیں ہوسکتی۔ ہر حملے کے ساتھ بڑھتی بربریت کے بعد اب دل و دماغ میں شاید اتنی جگہ موجود نہیں رہی کہ ہر کسی کی تفصیلات یاد رکھی جائیں۔

ہم ظلم ہوتا دیکھتے، ٹھنڈی سانس بھرتے، خیالات جھٹک دیتے اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔

اسی دوران حملے جاری رہتے ہیں اور اس ملک کے لیے دکھوں کا نیا پیغام لاتے ہیں...... جو اب قتلِ عام کا شکار ہوئے معصوم بچوں کے حوالے سے یاد رکھا جائے گا۔

کامیابی

ایک ذہین بے روزگار کی داستانِ عجب جس نے کمائی کا بڑا انوکھا ڈھنگ دریافت کرلیا

جاوید بسام

پروفیسر گورمن ایک کالج میں پڑھاتے تھے۔ وہ ایک روشن دماغ ادیب اور دانشور بھی تھے۔ کئی ظاہری و باطنی موضوعات پر ان کی گہری نظر تھی۔ نفسیات پڑھے ہوئے تھے اور صاحب کتاب بھی تھے۔ ان کی کتابیں شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ اکثر سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں ان کا شمار ہوتا۔

ایک دن انھیں قریبی شہر سے ایک خط موصول ہوا جسے پڑھ کر وہ غصے سے بھنا اٹھے۔ وہ خط راجر نامی ایک نوجوان کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان لیکن عرصے سے بے روزگار ہے۔ ملازمت ملتی نہیں اور اگر ملے ہے تو جلد چھوٹ جاتی ہے۔ نوبت اب فاقوں پر آ چکی۔ اگر گورمن صاحب مہربانی کرکے اسے دو سو ڈالر بھیج دیں، تو اس کے کچھ دن اچھے گزر جائیں گے۔

گورمن صاحب نے ایک دفعہ پھر خط پڑھا۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ اگر راجر ان کے سامنے ہوتا، تو اس کا بھی یہی حشر کر ڈالتے۔ وہ ایسے کام چور نوجوانوں سے خوب واقف تھے جو دل جمعی سے کوئی کام نہیں کرتے۔ روز ملازمتیں بدلتے اور تفریحات میں لگے رہتے ہیں۔ وہ خط پھاڑنے لگے تھے کہ اچانک انھیں خیال آیا، اسے جواب دیا جائے۔ چناں چہ وہ خط لکھنے بیٹھ گئے۔

پہلے تو پروفیسر صاحب نے اسے خوب سخت باتیں سنائیں اور

لتاڑا۔ جب غصہ کچھ کم ہوا، تو اُسے محنت کی عظمت پر طویل لیکچر دے ڈالا۔ چونکہ وہ غصے میں تھے اور بعض لوگوں کا دماغ ایسے وقت تیز چلتا ہے، لہٰذا انھوں نے لفظ محنت کی نئی زاویوں سے وضاحت کر ڈالی۔ آخر میں قلم کی روانی میں وہ اسے قناعت اور سادگی کا بھی درس دے بیٹھے۔

خط بہت لمبا ہو گیا، اچھا خاصا کسی مضمون کا مسودہ لگ رہا تھا۔ بہرحال انھوں نے وہ خط اسے ارسال کر دیا۔ جلد ہی اس کا جواب آ گیا۔ راجر نے ان سے معافی مانگی تھی۔ ساتھ ہی لکھا کہ آپ کا خط پڑھ کر میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگی ہے۔ میں جاہل مطلق تھا، آپ کے گراں قدر خیالات سے بہت کچھ سیکھا۔ اب عہد کیا ہے کہ آئندہ بھی آپ سے سیکھتا رہا ہوں گا۔

اس نے مزید لکھا کہ میں وقت کی اہمیت اور اصول پسندی جیسے موضوعات پر بھی راہنمائی چاہتا ہوں۔ میں ایک لاابالی نوجوان ہوں۔ وقت کیا ہوتا ہے مجھے پتا نہیں۔ اسی طرح میں اصولوں کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ آپ اگر ان باتوں پر کچھ روشنی ڈالیں گے، تو یقیناً یہ معلومات میری کردار سازی میں معاون ثابت ہوں گی۔ میں ساری زندگی آپ کا شکرگزار رہوں گا۔

گورمن صاحب کی پیشانی پر غصے سے بل پڑ گئے۔ وہ بڑبڑائے: ''پاگل، جاہل، مجھے فارغ سمجھتا ہے کہ میں اس کے خط کا جواب دوں۔'' انھوں نے خط ایک طرف ڈال دیا۔ لیکن یہ موضوعات ان کے پسندیدہ تھے، چناں چہ کچھ دن بعد وہ اسے دوبارہ خط لکھنے بیٹھ گئے۔ انھوں نے پہلے اسے حسبِ عادت ڈانٹا پھر وقت کی اہمیت اور اصول پسندی پر مفصل خط لکھ ڈالا۔

فوراً ہی راجر کا جواب بھی آ گیا۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ آپ کے فرمودات میرے لیے روشنی ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے، میں طویل عرصہ اندھیرے میں بھٹکتا رہا ہوں۔ آپ کی باتوں سے میری شخصیت تبدیل ہو رہی ہے۔ آخر میں اس نے یکسوئی اور کردار کی مضبوطی پر بھی ان سے کچھ لکھنے کو کہا۔ گورمن صاحب بڑبڑاتے ہوئے پھر ان موضوعات پر بھی خط لکھنے بیٹھ گئے۔ راجر کا جواب فوراً آ گیا۔ ان کی تحریروں کی تعریف کے ساتھ ہی اس نے کچھ نئے موضوعات پر رائے مانگی تھی۔ غرض راجر کے خط آتے رہے۔ گورمن صاحب جواب دیتے رہے۔

اس طرح انھوں نے سچ کی اہمیت، وعدے کی پاسداری، مساوات اور دیگر موضوعات پر مفصل خطوط لکھ ڈالے۔ آخر ایک دن راجر کا خط آیا۔ لکھا تھا، جناب آپ نے جس محنت اور جانفشانی سے میری ذہنی تربیت کا کام انجام دیا ہے، اس سے میرے تمام مسائل حل ہونے والے ہیں۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ اس کے بعد خط آنے بند ہو گئے۔

گورمن صاحب اپنے کاموں میں لگ کر جلد ہی اسے بھول گئے۔ دو مہینے بعد ایک دن وہ کچھ کتابیں خریدنے دکان پر گئے۔ مالک ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ اس کے مستقل گاہک تھے۔ اس نے پچھلے دنوں شائع ہونے والی کچھ کتابیں ان کی خدمت میں پیش کیں اور ایک کتاب اٹھا کر بولا ''گورمن صاحب! پچھلے ایک مہینے سے اس کتاب نے فروخت کے تمام پرانے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ ان دنوں یہ ''ہاٹ کیک'' بنی ہوئی ہے۔''

گورمن صاحب نے کتاب لے کر دیکھی۔ اس کا عنوان تھا ''کامیابی کے دس راہنما اصول۔'' انھوں نے

الٹ پلٹ کر دیکھا پھر بولے: ''کسی نئے ادیب کی لگتی ہے، خیر دے دو۔''

دفتر پہنچ کر انھوں نے نئے کتابوں کا بنڈل سامنے رکھ لیا۔ کچھ دیر دوسرے کام نمٹاتے رہے پھر بنڈل کھولا اور پہلے ''کامیابی کے دس راہنما اصول'' نامی کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگے۔ جوں جوں اس کے مندرجات پر نظر دوڑائی، ان کے چہرے کی رنگت بدلتی گئی۔ وہ تو وہی خطوط تھے جو انھوں نے راجر نامی بے روزگار نوجوان کو لکھے تھے۔ طیش میں آ کر انھوں نے پیش لفظ پڑھا، وہ راجر کی طرف سے ہی تھا۔

اس نے تمام باتیں صاف لکھی تھیں کہ کس طرح اس نے بے روزگاری سے تنگ آ کر پروفیسر گورمن کو خطوط لکھے۔ جواب میں انھوں نے کس طرح پند و نصائح سے اس کی راہنمائی کی۔ اس نے خطوط میں سے سوائے گورمن کی ڈانٹ ڈپٹ اور لتاڑنے کے اور کوئی چیز حذف نہیں کی تھی۔ آخر میں لکھا: ''مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب مارکیٹ میں آنے کے بعد ضرور میری زندگی تبدیل ہو جائے گی۔''

گورمن صاحب اپنی نرم و آرام کرسی پر اس طرح بیٹھے تھے جیسے انگاروں پر بیٹھے ہوں۔ وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے غرائے: ''بیٹا جی! زندگی تو میں تمھاری ایسی تبدیل کروں گا کہ تم ہمیشہ یاد رکھو گے۔ میں ابھی تمھیں اس کا مزا چکھاتا ہوں۔''

وہ فون اٹھا کر کسی کا نمبر ملانے لگے تھے کہ دروازہ کھلا اور ان کے دیرینہ دوست اور وکیل، مسٹر ولیم دفتر میں داخل ہوئے۔ وہ چہک کر بولے: ''آہا گورمن! میں نے سوچا آج کھانا تمھارے ساتھ کھایا جائے۔''

وہ کچھ رکے پھر حیرت سے بولے ''لیکن تم تو اس وقت کسی لال ٹماٹر کی طرح نظر آ رہے ہو۔ لگتا ہے کچھ دیر میں تمھارے کانوں سے دھواں نکلنے لگے گا۔ تمھاری چندیا کے چند بال بھی بالکل سیدھے کھڑے ہیں۔ میرے عزیز! تم بتاؤ گے کہ کیا حادثہ پیش آ گیا؟''

پروفیسر گورمن نے کتاب ان کے آگے پھینک دی اور بولے ''یہ دیکھو!''

وہ بولے ''بہت اچھی کتاب ہے۔ میں نے بھی پڑھی ہے بلکہ میں تو آج کل ملنے والوں کو اسے خریدنے کی تلقین کرتا ہوں۔''

گورمن غصے سے دہاڑے ''تم نے شاید اس کا پیش لفظ نہیں پڑھا۔''

''صحیح! مجھے پیش لفظ پڑھنے کی عادت نہیں۔'' وکیل صاحب نے کہا۔

''تو اب پڑھ لو۔'' گورمن گرجے۔

وکیل صاحب نے پیش لفظ پڑھا اور زوردار قہقہہ لگایا: ''ہاہاہاہا!'' یہ تو اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ ہو گیا۔''

''لطیفے کو بھاڑ میں ڈالو، میں تمھیں ابھی وقت اپنا وکیل کر رہا ہوں۔ ہم اس پر مقدمہ دائر کریں گے۔''

وکیل صاحب مسکرائے اور بولے ''پیارے گورمن! اس سے کیا ہوگا؟''

''میں اسے مزا چکھانا چاہتا ہوں۔ اس نے میرے ساتھ فراڈ کیا ہے۔ اسے میرا نام بطور ادیب دینا چاہیے تھا۔ اسے کتاب کی آمدن بھی مجھے دینی پڑے گی۔''

وکیل صاحب سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے ''راجر نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے یہ کتاب خود لکھی ہے۔ اس نے تو جوں کے توں تمھارے خطوط شائع کر دیے۔

پیش لفظ میں تمھارا نام بھی دیا ہے..... اس میں دھوکا کہاں ہے؟"

"دھوکا ہے۔ اس نے مجھے ایک منصوبے کے تحت یہ خطوط لکھنے پر اکسایا۔" وہ تلملا کر بولے۔

"ٹھیک، لیکن اگر تم چاہتے تو اسے جواب نہ دیتے۔ وہ تمھارا کیا کر لیتا؟ تم شاید اس بات سے واقف نہیں کہ خطوط قانوناً مکتوب الیہ کی ملکیت تصور کیے جاتے ہیں۔ وہ جو چاہے ان کا کر سکتا ہے۔ چاہے انھیں آتشدان میں جھونک دے یا سینے سے لگا کر رکھے یا شائع کرا دے۔ ہاں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو یا کسی کی عزت پر حرف نہ آئے۔ ہم یہ کیس پہلے دن ہی ہار جائیں گے۔" وکیل صاحب نے کہا۔

گورمن صاحب کسی ہارے گھوڑے کی طرح کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔ وکیل صاحب بولے "یار گورمن، دل بڑا رکھو، سمجھو یہ تمھاری ہی نئی کتاب مارکیٹ میں آئی ہے۔ بس اس کی آمدنی اور کوئی لے اڑا اور اس سے تمھیں کیا فرق پڑتا ہے؟ پہلے ہی تمھاری کئی کتابیں مقبول عام ہو چکیں اور ہر کتاب نے تمھارا بینک بیلنس اوپر ہی پہنچایا ہے۔ میرا تو خیال ہے، تم راجر کو مبارک باد کا ایک خط لکھ ڈالو۔"

گورمن صاحب آہستہ آہستہ معمول پر آ رہے تھے۔ بولے "خط تو میں نہیں لکھ رہا، ہاں جلد ہی اس واقعہ پر ایک کہانی لکھوں گا۔"

وکیل صاحب مسکرا کر بولے "یہ ہوئی نہ بات۔ چلو اب جلدی سے کھانا منگوا لو۔ بڑے زور کی بھوک لگی ہے اور ہاں یہ کھانا تمھاری طرف سے ہو گا۔" یہ سن کر پروفیسر گورمن مسکرانے لگے۔

گزارش

اس قوم کو ملے موقع تو حالات بدل سکتے ہیں
طور طریقے کیا انداز بدل سکتے ہیں

حالات کی سنگینی اتنی نہیں جتنا ہے شور برپا
آپ کوشش تو کریں، خبر کیا اخبار بدل سکتے ہیں

ہر بات میں قصور سابقہ حکومت کا ہی نہیں
اپنی بھی غلطی مانیں تو حالات بدل سکتے ہیں

ہر کام کے لیے نہ مانگیں جادو کی چھڑی
خدا سے مانگ کر تو دیکھیں حالات بدل سکتے ہیں

الہ دین کا چراغ تو ہیں پرانی باتیں جناب
آپ جلا دیں بجلی کا چراغ تو حالات بدل سکتے ہیں

یہ کیا کم ہے کہ عوام ہے آپ کے ساتھ
چھوڑ دیں امریکا کا پیچھا تو واقعی حالات بدل سکتے ہیں

جھوٹوں کے پلندے تو تھے جانے والوں کے بھی پاس
آپ سچ اپنا کے تو دیکھیں حالات بدل سکتے ہیں

ہم نے اپنا سمجھ کر دیا ہے موقع آپ کو
آپ ہمیں اپنا تو سمجھیں حالات بدل سکتے ہیں

ہم نہیں کہتے کہ بدلیں نظام ہی ضرور
اسی نظام کی اصلاح کر دیں تو حالات بدل سکتے ہیں

(محمد قاسم رضا، تلے عالی، گوجرانوالہ)

سچا واقعہ

پولیس نے بھی غریب پہ کر دیا

احسان

ایک احمق کا اداس ماجرا وہ قانون کے رکھوالوں کی بچھائی کمند میں جا پھنسا

رزاق شاہد کوہلر

باپ نے بڑے فخر اور مان کے ساتھ اس کا نام بہادر شاہ ظفر رکھا تھا مگر یار لوگوں نے اسے بہادر شاہ ڈفر بنا دیا۔ اس میں قصور کہنے والوں کا نہیں، وہ واقعی ڈفر تھا۔ اس نے کبھی کوئی کام سوچ سمجھ کر نہیں کیا۔ اس کے نزدیک سوچ بچار کرنا دنیا کا فضول ترین کام تھا۔ چناں چہ وہ جب بھی کوئی کام انجام دیتا تو سوچنے کی زحمت گوارا نہ کرتا۔ نتیجہ اس کی توقع کے برعکس نکلتا۔ مگر وہ بھی اپنی نوعیت کا واحد انسان تھا۔ ہمیشہ اپنی حماقت تقدیر کے سر تھوپ کر بری الذمہ ہو جاتا۔

بھلے وقتوں میں اس نے جیسے تیسے میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی تھی۔ چناں چہ اسے ایک سرکاری دفتر میں بطور نائب قاصد ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ باپ کی پھٹکار اور ماں کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ لیکن کچھ

بدخواہ اور حاسد قسم کے لوگ برملا کہتے، یہ نوکری اس کی خداداد حماقتوں کا نتیجہ ہے ورنہ وہ بھرتی تو کلرک ہوا تھا۔

وہ لوگوں کی باتوں کا قطعی برا نہ مناتا۔ جانتا تھا کہ لوگوں کا کام ہی باتیں بنانا ہے۔ اگر سماعتوں کو ایسی باتوں پر غور کرنے کی زحمت نہ دی جائے تو دل کو تکلیف نہیں ہوتی۔ سو وہ ایسی باتوں پر توجہ نہ دیا کرتا۔ نائب قاصد کی ملازمت اس کے لیے سودمند ثابت ہوئی۔ اس میں عقل استعمال کرنے کی قطعی ضرورت نہیں پڑتی اور یہی شے اس کے پاس نہیں تھی۔

اس کے ہاتھ پاؤں پہلوانوں کی طرح مضبوط تھے۔ اس میں بہترین پہلوان بننے کی تمام خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ لیکن ذفر کا اس طرف بھی دھیان ہی نہیں گیا۔ دفتر میں اس کی زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ بس ہفتے میں ایک دو بار بےعزتی ہو جایا کرتی جو اس کے نزدیک معیوب بات نہیں تھی۔ اس کے بقول بےعزتی صحت مند رہنے کے لیے بہت ضروری تھی۔ ہفتے میں کم از کم ہر شخص کو ایک بار ضرور بےعزتی کرانی چاہیے ورنہ آدمی کا معدہ خراب ہوجاتا ہے اور وہ الٹے سیدھے خواب دیکھنے لگتا ہے۔

ایک دن اس نے دفتر سے تنخواہ کے ۲۰ ہزار روپے وصول کیے۔ وہ پھر ایک شاپنگ پلازہ پہنچ گیا جہاں سے وہ جوتے خریدنا چاہتا تھا۔ پلازہ کے سامنے لوگوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ وہ سب سامنے پیادہ راہ کے کنارے کھڑی موٹر سائیکل کو یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی اُڑن طشتری ہو اور غلطی سے زمین پر اتر گئی۔ لوگوں کی آنکھوں میں حیرت اور چہروں پر خوف طاری تھا۔

قریب جا کر اس نے ایک نوجوان سے استفسار کیا تو وہ بولا ''یہ لاوارث موٹر سائیکل ہے، پتا نہیں کون کم بخت یہاں چھوڑ گیا۔ اس کا بٹوا بھی نشست پر پڑا ہے۔''

اس نے کہا ''تو اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے؟ بٹوے میں اس کا شناختی کارڈ موجود ہوگا۔ نکال کر دیکھ لو، سب معلوم ہو جائے گا۔''

''تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' نوجوان نے گھورا۔ ''یہ کیسی بات کر رہے ہو؟ آج کل تو کوئی پاگل کتا اور پولیس والا بھی لاوارث موٹر سائیکل کے قریب نہیں پھٹکتا تو ہم کیسے جائیں؟...... کیا پتا اس میں کسی نے ٹائم بم فٹ کر رکھا ہو۔ ہم میں سے کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا۔''

''اگر یہ بات ہے تو میں دیکھ لیتا ہوں۔'' وہ آگے بڑھا۔ ''ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ موٹر سائیکل کس کی ہے؟''

''رک جاؤ احمق!'' نوجوان نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ ''کیوں کتے کی موت مرنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا ''کتے کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں اور میری دو ہیں۔ میں کتے نہیں آدمی کی موت مروں گا۔ چھوڑ دو مجھے، میں ضرور معلوم کروں گا کہ یہ موٹر سائیکل کس کی ہے؟''

نوجوان اسے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے چلایا ''بھائیو! اس پاگل کو روکو، یہ موٹر سائیکل کی نشست پر پڑا بٹوا دیکھنا چاہتا ہے۔ مجھے یہ پاگل خانے سے بھاگا ہوا لگتا ہے۔ خدارا! میری مدد کرو۔''

لوگوں نے جب یہ سنا کہ ایک پاگل موٹر سائیکل کے قریب جا رہا تو وہ بدحواس ہو کر مختلف اطراف میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ نوجوان نے لوگوں کو بھاگتے دیکھا تو وہ بھی اسے چھوڑ کر یوں بھاگا جیسے سو میٹر کی دوڑ میں حصہ لینے والا کھلاڑی بھاگتا ہے۔ اب میدان صاف تھا۔ وہاں دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اطمینان سے چلتا موٹر سائیکل کے قریب پہنچا اور بٹوا اٹھا کر دیکھنے لگا۔

بٹوے میں چند مڑے تڑے کاغذ اور نصف درجن کے لگ بھگ ملاقاتی کارڈ بھرے ہوئے تھے۔ ابھی اس

نے تین عدد کارڈ ہی دیکھے تھے کہ اچانک ایک خطرناک صورت شخص اس کے سر پر پہنچ گیا۔

''اوئے چور کے بچے! تمھیں ہمت کیسے ہوئی میرا بٹوا اٹھانے کی؟'' وہ اسے گریبان سے پکڑتے ہوئے بولا ''چوری کرتے ہو اور وہ بھی دن دہاڑے، شرم نہیں آتی؟''

''نن...... نہیں...... جناب......مم...... میں چور نہیں۔'' اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

''بکواس مت کرو۔'' وہ گرجا۔ ''دلاور بھائی نام ہے میرا، مار مار کر حلیہ بگاڑ دوں گا۔''

''دلاور بھائی! خدا کی قسم......مم...... میں چوری نہیں کر رہا تھا۔'' وہ گڑگڑایا۔ ''میں تو آپ کا شناختی کارڈ تلاش کر رہا تھا۔ دراصل میں......''

''چپ۔'' دلاور بھائی نے قطع کلامی کی۔ ''میرے شناختی کارڈ کے ساتھ تمھارا کیا تعلق؟ بول...... جواب دے؟''

''وہ جی......مم...... میں...... میں......'' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن دلاور بھائی نے اس کے ہاتھ سے بٹوا جھپٹا اور کھول کر دیکھنے لگا۔

''اوئے چور!'' دلاور بھائی چلایا۔ ''اس میں پورے بیس ہزار روپے کی رقم تھی۔ وہ کہاں گئی؟''

''مم...... میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس میں ایک روپیا بھی نہیں تھا۔'' اس نے ہمت کا مظاہرہ کیا۔ ''آپ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں۔''

''نام کیا ہے تمھارا؟'' دلاور نے پولیس والوں کے انداز میں پوچھا۔

''بہادر شاہ ظفر۔''

''وہ جسے انگریزوں نے رنگون میں پھڑکا دیا تھا؟''

''نن......نہیں جی...... میں دوسرا ہوں۔''

''ہوں۔'' دلاور نے ذومعنی انداز میں سر ہلایا اور پھر ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''سنو بھئی بہادر شاہ ڈفر......''

''ڈفر نہیں جی ظفر۔'' اس نے تصحیح کی۔

''ایک ہی بات ہے۔'' دلاور بولا۔

''اب میری بات غور سے سنو۔ اگر تم نے میری رقم چرائی ہے تو چپ چاپ واپس کر دو۔ میں تجھے معاف کر دوں گا ورنہ بات تھانے تک جائے گی۔ پھر تمھیں وہ چوریاں بھی تسلیم کرنا پڑیں گی جو تمھارے باپ دادا نے کی ہوں گی۔''

''میں نے کوئی چوری نہیں کی، خدا کے لیے میرا اعتبار کریں۔ اس بٹوے میں یہی کچھ تھا جو تمھارے سامنے ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم سیدھی طرح نہیں مانو گے؟''

''مم...... میں کوئی بھی قسم کھانے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ گڑگڑایا۔

''ٹھیک ہے۔'' دلاور جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے بولا ''اگر تم خوشی سے تھانے کی سیر کرنا چاہتے ہو تو یونہی سہی۔''

☆☆

بہادر شاہ ڈفر گزشتہ تین گھنٹوں سے حوالات میں بند تھا۔ تھانہ انچارج خون خوار قسم کا انسپکٹر تھا۔ اس نے بہادر شاہ ڈفر کی تمام منتوں اور قسموں کو سر کی ایک ہی جنبش سے رد کر دیا۔ تلاشی لینے پر اس کی جیب سے واقعی بیس ہزار روپے کی رقم برآمد ہوئی۔ چناں چہ انسپکٹر نے اسے چوری کرنے کے جرم میں قید کر دیا۔ دن کے دو بجے اس کا باپ دو پڑوسیوں کی معیت میں تھانے پہنچا اور انسپکٹر کی منت سماجت کرنے لگا۔

انسپکٹر نے اس کی بات توجہ سے سنی۔ مگر جونہی وہ خاموش ہوا انسپکٹر اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا

"بزرگو! ایسے کیسے چھوڑ دیں جب کہ اس سے مال مسروقہ بھی برآمد ہو چکا۔ اس کے خلاف تو ایف آئی آر کٹ گئی ہے، کم سے کم دو سال اسے بڑے گھر میں رہنا پڑے گا۔"

"جناب! مہربانی فرمائیں۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"نا۔" انسپکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں قانون کو ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ اسے سزا ضرور ملے گی۔"

"اس کی نوکری چلی جائے گی جناب۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "خدا کے لیے اس پر نہ سہی مجھ غریب پر ہی رحم کریں۔ بیٹے کی آمدن ہی سے میرا گھر چلتا ہے۔ اس کی ملازمت چلی گئی تو میرا چولھا بجھ جائے گا۔ میں آپ کے پیروں پڑنے کو تیار ہوں۔ مجھ پر رحم کریں۔"

"میں مجبور ہوں بابا جی...... کاش کہ یہ میرے اختیار میں ہوتا۔"

بابا جی رونے لگے۔ ساتھ ساتھ انسپکٹر کی منت سماجت بھی جاری رکھی۔ غیر متوقع طور پر انسپکٹر کا دل پسیج گیا۔

"بس بابا جی بس۔" انسپکٹر نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور اپنی پلکیں صاف کرتے ہوئے بولا "آپ نے تو مجھے بھی رلا دیا۔ ٹھیک ہے، میں آپ کے بیٹے کو شخصی ضمانت پر چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اسے اچھی طرح سمجھا دیں کہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے۔"

"مم...... میں سمجھا دوں گا جی۔" بابا جی نے خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ انسپکٹر صاحب! میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

بابا جی ضمانتی ساتھ لے کر آئے تھے۔ پولیس والوں نے مچلکہ تیار کیا، ضابطے کی کارروائی مکمل کی اور پھر بہادر شاہ ذفر کو حوالات سے نکال انسپکٹر کے سامنے پیش کر دیا۔ انسپکٹر نے پولیس والوں کے روایتی انداز میں اسے لیکچر دیا اور آخر میں بولا "اب جاؤ آئندہ کبھی ایسا مت کرنا ورنہ سیدھے جیل جاؤ گے۔"

وہ باپ اور ضمانتیوں کے ساتھ باہر نکلا تو معاً اس کی نظر ایک سپاہی پر پڑی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

باپ نے کہا "کیا بات ہے، تم اس پولیس والے کو اتنی حیرانی سے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"یہ...... یہ وہی ہے، جس نے مجھے پولیس کے حوالے کیا تھا۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

"بکواس مت کرو۔" باپ نے اسے ایک تھپڑ جڑا اور پھر کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

☆☆

"کچھ دیر بعد وہ سپاہی مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اور جیب سے بیس ہزار روپے کی رقم نکال انسپکٹر کے سامنے میز پر رکھ دی۔ دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور پھر رقم تقسیم کرنے لگے۔

◆◆◆

گستاخ پروانہ

شاعر منور لکھنوی ایک مرتبہ چراغ کی روشنی میں رات کو کچھ لکھ رہے تھے کہ یکا یک ایک گستاخ پروانہ عالمِ وارفتگی میں شعلے سے آ ٹکرایا۔ پروانے کے ساتھ ساتھ چراغ بھی بجھ گیا۔ پہلے تو آپ اندھیرے میں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر ان کے منہ سے اچانک نکلا

الٰہی آگ ہی لگ جائے اس جذبِ محبت کو
جلے کوئی مرے کوئی، اندھیرا میری محفل میں

(سدیم رحمٰن، لاہور)

دورِ جدید کا حیرت انگیز سوال

دو ارب عیسائی کیسے ڈیڑھ کروڑ یہود کے چنگل میں پھنسے؟

اُمت مسلمہ کے خلاف یہود و نصاریٰ گٹھ جوڑ کی اصلیت آشکار ہوتی ہے

رضی الدین سید

یہودی قوم اپنے صحیفوں میں درج من گھڑت خدائی پیشین گوئیوں کی بنیاد پر دنیائے عیسائیت کو ہمیشہ مرعوب کیے رکھتی ہے۔
اس کے صحیفوں میں درج ہے کہ خدا تعالیٰ قوم بنی اسرائیل سے بہت خوش ہے اور وہ اسے اپنی چہیتی قوم قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کنعان فلسطین کا ملک اس نے انھیں ان کے چہیتے ہونے کی بنیاد ہی پر تحفے میں عطا کیا۔ اسی باعث یہودی مذہبی شخصیات عیسائیوں پر ہمیشہ زور دیتی ہیں کہ ان کے حقوق تسلیم کیے بغیر عیسائی ہرگز ترقی نہیں کر سکتے۔

حیرت کی بات یہ کہ ان دعووں کو عیسائی پیشوا بھی من و عن درست تسلیم کرنے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے، یہودیوں کے انسانیت دشمن ہر اقدام پر وہ اب ان کے ساتھ کامل تعاون کرتے ہیں۔ ایک سو سال پہلے تک جو قوم (عیسائی) یہودیوں کی جانی دشمن تھی، وہ اب ان کے من گھڑت خدائی دعوے آسانی سے تسلیم کرنے لگی ہے کیونکہ ان کی مقدس الہامی کتب اور تورات (عہد نامہ قدیم) کو یہودیوں کے مانند عیسائیوں کے ہاں بھی مستند خدائی کتب تسلیم کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی انجیل (گوسپل) کے مطالعے کا آغاز عیسائی انھی مذکورہ کتب

سے کرتے ہیں۔

چناں چہ قدرتی بات ہے کہ یہودیوں کے عقائد کا نفوذ لازمی طور پر ان کے دل و دماغ میں ہو جائے۔ اسی لیے یہودی، عیسائیوں کو جب خدا کا یہ فرمان سناتے ہیں ''بنی اسرائیل کو تنگ کرنا خود خدا کی ناراضی مول لینا ہے'' تو عیسائی پیشوا ان کی مخالفت کرنے سے از خود کتراتے ہیں۔ یہودیوں کا کمال ہے کہ اپنے صحیفوں کی بنیاد پر دو ارب کی بڑی قوت رکھنے والی عیسائی قوم کو انھوں نے اپنے شکنجے میں کس لیا۔

جنگوں کی آگ بھڑک اُٹھی

بنی اسرائیل کے اس قدیم دعویٰ نے کہ ''نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ فلسطین یہ سارا وسیع و عریض خطہ خدا نے انھیں اس کی چہیتی قوم ہونے کے سبب از راہِ عنایت عطیہ (ہبہ) کیا'' مشرق وسطیٰ میں تمام جنگوں کی آگ بھڑکائی۔ وہ کہتے ہیں' اس کا اعلان اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب تورات میں بار بار کیا ہے۔ مثلاً انجیلی کتاب، پیدائش' (Genesis) باب۱۵ آیت ۱۸۔۱۶ میں دوٹوک طریقے سے اعلان کیا گیا ہے:

''میں نے یہ ملک تیری نسل کو دریائے مصر سے لے کر اس بڑے دریائے (فرات) تک 'قینیوں، قنزیوں قدمونیوں، حتیوں، فرزیوں، فرائیمیوں، اموریوں، کنعانیوں، جرجاسیوں اور جبوسیوں (تمام قوموں) سمیت دے دیا۔'' ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے ایک امریکی مصنف' جان ایف ولوؤورڈ (Valwoodword) لکھتا ہے:

''اس خدائی وعدے سے مراد آج کے دور کا اسرائیل' دریائے اردن کا مغربی کنارہ اور عراق' سعودی عرب اور شام کے ممالک کے بڑے بڑے شہر مراد ہیں۔'' (کتاب، آرمیگاڈون، آئل، اینڈ دی مڈل ایسٹ کرائسس۔ ص۲۹۔۲۸)۔

یہ خدائی وعدہ کسی بھی قسم کی شرط سے وابستہ نہیں۔ یعنی اس کا بنی اسرائیل کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا نے یہ خطے انھیں بس یونہی دے دیے، خواہ وہ کچھ بھی کرتے رہیں! اسی طرح ایک اور جگہ خداوند فرماتا ہے:

''اے اسرائیل گھبرانہ جا، کیونکہ دیکھ میں تجھے اور تیری اولاد کو غلامی کی سر زمین سے چھڑاؤں گا۔ یعقوب (بنی اسرائیل) واپس آئیں گے اور راحت و آرام سے رہیں گے اور کوئی انھیں نہ ڈرا سکے گا کیونکہ میں تیرے ساتھ ہوں۔'' (یرمیاہ۳۰، آیات ۱۱۔۸)

برطانیہ کی سرپرستی

صیہونیوں نے قیامِ اسرائیل کے لیے جب عالمی ہمہ گیر مہم شروع کی' تو برطانیہ انہی مذکورہ دعووں اور کچھ دیگر سیاسی حالات کی بنا پر ان کے بہت زیادہ دباؤ میں آگیا۔ اتفاق سے تب برطانیہ سپرپاور تھا۔ بہت کچھ تو اس سیاسی دباؤ کی وجہ سے اور کچھ جنگِ عظیم اوّل (۱۹۱۷ء) میں یہودی قوم کی ہمدردی پانے کے لیے برطانوی وزیر خارجہ لارڈ بالفور نے قیامِ اسرائیل کے لیے۱۹۱۷ء کو اعلانِ بالفور کا اجرا کر دیا۔ تاہم عرب دنیا نے اس اعلان کو یکسر مسترد کر ڈالا۔

لہٰذا عربوں کی جانب سے بڑھتے ہنگاموں اور سیاسی دباؤ کے باعث برطانیہ، قیامِ اسرائیل کی اس دستاویز پر طویل عرصے تک عمل درآمد کرنے سے قاصر رہا۔ مصلحت

یہ تھی کہ اتنی بڑی عرب برادری سے وہ اپنے تعلقات برقرار رکھے۔ چناں چہ اعلان بالفور کے باوجود برطانیہ نے یہودیوں کے فلسطین میں مزید داخلے پر پابندی عائد کردی۔ اس کے باوجود ۱۹۳۹ء تک چار لاکھ یہودی حیرت انگیز طور پر کسی نہ کسی طور فلسطین میں داخل ہو گئے۔ یہی وہ سال تھا جب دوسری عظیم جنگ کا بھی آغاز ہوا۔ ''انجمن اقوام'' کی جانب سے برطانیہ اس وقت فلسطین کا نگران اعلیٰ تھا۔

جنگ عظیم دوم کے اختتام پر اقوام متحدہ نے طے کیا کہ امریکا اور روس، دونوں ممالک کی آشیرباد سے فلسطین کو دو حصوں...... ''یہودی فلسطین'' اور ''عربی فلسطین'' میں تقسیم کردیا جائے۔ تاہم یہودیوں کو اپنی آزاد ریاست کے جلد از جلد قیام سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ اسی لیے فلسطین سے برطانویوں کو نکال باہر کرنے کی خاطر صیہونی دہشت گردوں نے یروشلم کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل کو دھماکوں سے اڑا دیا جہاں نگران برطانوی افواج قیام پذیر تھیں۔ بعدازاں ۱۴ رمئی ۱۹۴۸ء کو صیہونیوں نے ازخود قیام اسرائیل کا اعلان کردیا۔ حیرت انگیز امر یہ کہ یہودی بڑوں کے غیر قانونی اقدام کی مذمت کسی ایک مہذب گوری قوم نے نہ کی اور اسرائیل کو تسلیم کرلیا۔
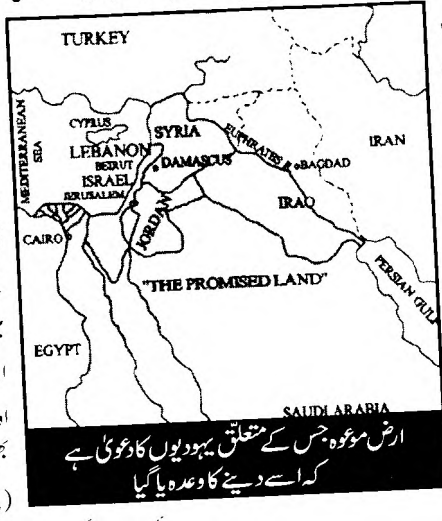
بائبل کی پیش گوئیاں

کتاب ''یرمیاہ'' باب ۲۳ یوں پیشین گوئی کرتی ہے'' پر میں انھیں ان تمام ممالک سے جہاں جہاں میں نے انھیں ہانک دیا تھا، جمع کرلوں گا اور انھیں ان کے گلے خانوں میں لاؤں گا اور وہ چلیں گے اور بڑھیں گے...... خداوند فرماتا ہے دیکھ وہاں دن آئے ہیں کہ میں داؤد کے لیے ایک سچی نسل پیدا کروں گا اور اس کی بادشاہی، ملک میں اقبال مندی اور عدالت وصداقت کے ساتھ ہوگی۔ یہوواہ (یروشلم) اس کے عہد میں نجات پاجائے گا اور اسرائیل (یہودی) سلامتی سے سکونت کرسکے گا۔''

(آیات: ۶۔۳)

کتاب ایزاخیل بیان کرتی ہے کہ: '' تب وہ جانیں گے کہ میں خداوند ان کا خدا ہوں۔ میں نے ہی انھیں غلامی میں قوموں کے اندر روانہ کیا تھا اور میں نے ہی انھیں ان کے اپنے ملک میں جمع کیا تھا اور ان میں سے کسی ایک کو بھی پیچھے نہ چھوڑا تھا۔''

(باب ۳۹، آیت ۲۸)

TURKEY
MEDITERRANEAN SEA
CYPRUS
SYRIA
LEBANON
BEIRUT
DAMASCUS
ISRAEL
JERUSALEM
JORDAN
EUPHRATES
BAGDAD
IRAN
IRAQ
CAIRO
"THE PROMISED LAND"
PERSIAN GULF
EGYPT
SAUDI ARABIA

ارض موعوہ جس کے متعلق یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ اسے دینے کا وعدہ کیا گیا

قارئین سے گزارش ہے کہ بائبل کی یہ پیشین گوئیاں پڑھ کر دل چھوٹا نہ کریں کیونکہ اس میں شامل تمام کتابیں جعلی اور تحریف شدہ ہیں۔ ان کے ربیوں نے کتب سے اصل نکال کر من پسند آیات درج کردیں۔ خدا نے اگر اس قوم سے کوئی وعدہ کیا بھی تھا، جیسا کہ قرآن مجید بھی وہ تصدیق کرتا ہے تو یہ وعدہ ان کی وفاداری اور تقویٰ کے ساتھ مشروط تھا۔ یعنی اگر وہ اللہ

کے ساتھ وفاداری کا رویہ اختیار کریں گے تو وہ بھی ان کے ساتھ عمدہ سلوک کا مظاہرہ کرے گا۔ افسوس یہودیوں نے اپنی سازشی ذہنیت کے باعث ان تمام وعدوں سے خدائی شرائط کو نکال باہر کیا اور محض اس بات کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں کہ خدا نے یہ سارا خطہ انھیں از خود ہبہ کر دیا۔ اب اس چہیتی قوم کی جو بھی مخالفت کرے گا، دنیا میں وہ لازماً بربادی کے انجام سے دوچار ہو گا۔

یہود پہ حضرت عیسیٰ کی پھٹکار

اُدھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان سرکش یہودیوں کو ذانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اے یروشلم، اے یروشلم (بنی اسرائیل)، تو جو نبیوں کو قتل کرتا اور رسولوں کو سنگسار کرتا ہے۔ کتنی بار میں نے چاہا ہے کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو جمع کر لیتی ہے، میں بھی تیرے لڑکوں (قوم) کو جمع کر لوں مگر تو نے ایسا نہ چاہا۔ دیکھو تمہارا گھر تمہارے لیے ویران کیا جاتا ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب مجھے ہرگز نہ دیکھو گے جب تک کہ نہ کہو گے کہ'' مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آیا ہے۔'' (متی ۲۳، آیات ۳۹۔۳۷)

قرون وسطیٰ میں یورپ میں یہود کو معمولی جرائم پر جلانا معمول تھا

ان آیات میں ذانٹ ڈپٹ کرنے کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہود کو یہ بھی ہدایت کرتے ہیں کہ آنے والے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وہ خوش دلی کے ساتھ استقبال کریں۔ دوسری طرف یہودی مکاروں کو طنز کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

''اے سانپو، اے افعی کے بچو، تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے؟'' (متی ۲۳، آیت: ۳۳) اور'' اے احمقو اور اندھو'' (متی ۲۳ آیت: ۱۷)

قابل غور بات یہ کہ پھلنے پھولنے کی ایسی ہی پیشین گوئی اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں بھی فرمائی ہے۔ وہ کہتا ہے:

''اسماعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے پھلدار کروں گا اور بہت بڑھاؤں گا...... اور میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔'' (پیدائش ۱۷، آیت: ۲۰)

حضرت اسماعیلؑ کے حق میں انجیلی کتابوں میں درج مذکورہ پیشین گوئیاں کئی مقامات پر مزید ملتی ہیں جو تمام پوری بھی ہوئیں۔

دوسری طرف بنی اسرائیل سے متعلق خدائی خوشخبریاں تکمیل کی تا حال منتظر ہیں۔ چار ہزار سال بعد بھی بنی اسرائیل موعودہ وسیع وعریض خدائی خطے سے محروم ہیں۔ جو کچھ بھی زور زبردستی نہ کہ بطور خدائی انعام اسے حاصل ہوا یعنی (اسرائیل) وہ بھی بس چھوٹا سا اراضی گوشہ ہے۔ یہودیوں کو کنعان (فلسطین) بھی اب تک مکمل طور پر حاصل نہیں ہو سکا۔ اسی طرح عالمی طور پر بکھری منتشر شدہ یہودی بھی قیام اسرائیل کے باوجود موعودہ وطن

واپس نہیں لوٹ سکے۔ حالانکہ بائبل میں بیان کیا گیا تھا: ''میں ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی پیچھے نہ چھوڑوں گا۔''

تمام تر کشش اور مراعات کے باوجود یورپ، امریکا اور دیگر ممالک کے بے شمار یہودی آج بھی اسرائیل آنے کو تیار نہیں، بے شک ربیوں کے نزدیک یہ ان یہودیوں کا گناہ کبیرہ ہی ٹھہرے! حیرت انگیز طور پر قرآن پاک بھی یہی بات بیان کرتا ہے'' قیامت سے پہلے ہم یہودیوں کو ایک جگہ اکٹھا کرکے لے آئیں گے۔'' (بنی اسرائیل:۱۰۴) اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان

جرمنی کے نظر بندی کیمپ میں قید یہود

کے بارے میں ایک پیشین گوئی فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے مدینہ اجاڑ اور یروشلم آباد ہو رہا ہوگا۔

(ابوداؤد و بخاری)

خدا کا ہاتھ

بعض عیسائی اور تمام صیہونی مصنفین اس بات کا علانیہ اظہار کرتے ہیں کہ عرب دنیا اور تمام مسلم ممالک کی بدترین مخالفت، عربوں کی لگاتار و مسلسل عسکری مزاحمت، صدر ناصر کی اسرائیل پر تھوپی گئی جنگ رمضان ۱۹۷۳ء کے باوجود اسرائیل کی موجودگی کا واضح مطلب یہی ہے کہ (۱) اسرائیل پر خدا کا ہاتھ ہے۔ (۲) بنی اسرائیل خدا کی چہیتی اور محبوب امت ہے اور (۳) یہ وسیع و عریض خطہ یہودیوں کے ساتھ ایک سچا خدائی وعدہ ہے۔

یہ لوگ دلیل دیتے ہیں کہ گزشتہ چار ہزار برس میں جن اقوام نے بھی اسرائیلیوں (خدا کی چہیتی قوم) پر ذلت، غلامی، تشدد اور جنگ مسلط کی تھی، قرب قیامت پر ان سب کو آخر کار ایک خدائی قہر و غضب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا صحیفہ ''جرمیاہ'' دوٹوک طریقے پر اعلان کرتا ہے'' وہ سب جو تجھے نگلتے ہیں، خود نگلے جائیں گے اور تیرے سب دشمن قیدی بنالیے جائیں گے اور جو تجھے غارت کرتے ہیں خود غارت ہوجائیں گے اور ان سب کو جو تجھے لوٹتے ہیں میں خود ان دوں گا۔ (باب ۳۰ آیت:۱۶)

ان کا دعویٰ ہے، روسی سلطنت جس نے یہودیوں کو سدا عذاب میں مبتلا رکھا تھا، آخرکار تباہی سے دوچار ہوئی۔ (یہ حقیقت بہر حال وہ دنیا پر آشکار نہیں کرتے کہ مذکورہ روسی سلطنت کو یہودیوں کے محسن مسلمانوں نے تباہ کیا تھا۔ یہ فاتح محمد عثمانی تھے جن کے حملوں سے روسی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوئی)۔ مذکورہ دانشوران مزید دلیل دیتے ہیں کہ روسی شاہی زار خاندان جو ساری زندگی یہودیوں کا درپے آزار رہا، کمیونسٹ انقلاب کے نتیجے میں بہیمیت اور درندگی کا نشانہ بنا اور ہٹلر بھی جو یہودیوں کا نسلی اور خونی دشمن تھا، بالآخر خودکشی کے انجام سے دوچار ہوا۔

عذاب نازل ہوا

یہ سارے حقائق درست ہو سکتے ہیں، لیکن بڑی عیاری کے ساتھ وہ اس موقع پر اپنے سابق بدترین دشمن، یورپی اقوام کا ذکر گول کر جاتے ہیں۔ یہ وہ قومیں ہیں جنھوں نے یہودیوں کو تقریباً دو ہزار سال تک پورے یورپ میں بری طرح رگیدا، قتل کیا، جلایا اور زمین وجائداد سے محروم کیا۔ ان کی پیشین گوئیوں کی بنیاد پر تو یورپ کی ان عیسائی اقوام کو بھی اصولاً خدا کی ''چہیتی قوم'' کو عذابوں میں مبتلا کرنے کی وجہ سے فنا و برباد ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن ان پر اللہ کا غضب نازل ہونا تو کجا یہ یورپی اقوام پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو چکی ہیں۔

اسپین، بلجیم، جرمنی، فرانس، ڈنمارک، اٹلی اور برطانیہ وغیرہ کئی لحاظ سے عالمی قیادت کے منصب پر بھی فائز ہیں۔ لہٰذا اس موقع پر یہودی اگر ان عیسائیوں کا ذکر کرتے، تو خدا کی پیشین گوئی دنیا کو یقیناً غلط نظر آنے لگتی۔ اسی لیے انھوں نے سلسلۂ حقائق میں ان اقوام کا ذکر ہی گول کردیا۔ بات یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی تمام رائج الوقت کتب مقدسہ، جعلی، من گھڑت اور انسانی کلام ہیں۔ اصل عبرانی انجیلیں تو یروشلم اور ہیکل کی بار بار تباہیوں اور آتش زدگیوں کے باعث آج سے کئی ہزار سال پہلے ہی دنیا سے مٹ چکیں۔ اس لیے ان کی پیشین گوئیوں پر انسان کیسے اعتبار کر سکتا ہے؟

مسلمان بہ لحاظ تعداد ایک صدی کی نسبت آج بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں جبکہ خدا کی چہیتی قوم، بنی اسرائیل محض ڈیڑھ کروڑ کی آبادی ہی پر اٹک گئی۔ ایک طرف ان کی دشمن قوتیں مسلسل پھیل رہی ہیں اور دوسری طرف یہودی سکڑتے چلے جارہے ہیں! یہ کیسی الہامی پیشین گوئی ہے؟

۱۹۶۷ء کی مصر اسرائیل جنگ کے بعد یہود نے یروشلم اور دریائے اردن کا مغربی کنارہ چھین لیا۔ ان کے نزدیک یہ قبضہ سو فیصد درست تھا کیونکہ یہ بھی موعودہ خدائی خطے کا ایک حصہ ہی ہے۔ سابق وزیراعظم موشے دایان نے بھی دوٹوک طور پر کہا تھا: ''تمام مقدس شہروں کے مقدس شہر (Holy of the Holies) میں یہودی اب کبھی واپس نہ جانے کے لیے لوٹے ہیں۔'' جبکہ دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: ''یروشلم غیر قوموں سے اس وقت تک پامال ہوتا رہے گا جب تک کہ غیر قوموں کی معیادِ اقتدار پوری نہ ہو جائے۔'' (انجیل لوقا: ۲۱، آیت: ۲۴)۔ دوسرے الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیش گوئی کررہے ہیں کہ یروشلم کو تو ایک دن بالآخر اجاڑ ہونا ہی ہے۔

صحیفوں کی بنیاد پر یہودی دعوے تو ضرور بڑے بڑے کرتے ہیں، لیکن جان بوجھ کر یہ حقیقت نہیں بتاتے کہ ان کا یہ تمام سیاسی کروفر اور ان کے ملک کا تمام استحکام محض امریکی و مغربی حمایت کے بل بوتے پر ہے۔ سات ارب کی عالمی آبادی میں ان کی حیثیت آٹے میں نمک برابر ہے۔ جس دن بھی امریکی عوام پر اصل صورت حال واضح ہوئی کہ کس طرح ان کا پیسہ یہودیوں کے استحکام میں استعمال ہو رہا ہے اور کس طرح ان کی حکومتیں اسرائیل کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر ناچ رہی ہیں، اسی دن سے یہودی پھر بدترین بربریت اور تشدد کا نشانہ بننے لگیں گے۔ ایک بار پھر انھیں اسی ذلت و رسوائی سے گزرنا پڑے گا۔ اسرائیل تو ان کا محض عارضی ٹھکانا ہے! دنیا بھر کو وہ اپنے جھوٹے خدائی وعدوں کی بنیاد پر بے شک مسلسل بے وقوف بناتے رہیں، لیکن ان کی یہ تمام زیرکی اور چالاکی ایک دن خود خدائی وعدوں کی بنیاد ہی پر انھیں لے ڈوبے گی۔

وقت انسان کو سکھا دیتا ہے۔ عجب عجب چیزیں
پھر کیا نصیب، کیا مقدر اور کیا ہاتھ کی لکیریں

نصیب

ایک بے آسرا بیوہ نے اپنوں سے آس
لگائی تھی مگر وہ بھی نراس میں بدل گئی

احمد ندیم قاسمی

رضیہ کی جوانی تو جیسے اپنے ابا کی موت کے انتظار میں تھی۔ کم سے کم اس کی ماں کو تو ایسا ہی محسوس ہوا۔ ماتم سے فارغ ہونے کے بعد جب ماں بیٹی نے بڑے کمرے کی دری پیٹی اور اس کے حاشیے کے ساتھ ساتھ چاروں طرف بیبیوں کی تھوکوں کے داغ دھونے بیٹھیں، تو یکایک رضیہ بیگم اپنی بیٹی کو دیکھتی رہ گئیں۔

اس وقت رضیہ نے ہفتے بھر کے چیکٹ کپڑے پہن رکھے تھے۔ لٹھے کی شلوار کے پائنچے بالکل سیاہ ہو رہے تھے۔ جمپر کا دامن صافی کی طرح

میلا تھا اور بالوں نے اُجڑ کر مانگ کو غائب کر دیا تھا۔ وہ ایک دھجی بھگو بھگو کر دری کے حاشیے پر رگڑ رہی تھی۔ ہر رگڑ کے ساتھ اس کی آستین کہنی تک ہٹ جاتی۔ میلے ہاتھوں کے پیچھے اس کی کلائی کا صندل چمک چمک جاتا۔

رئیسہ بیگم کو سب سے پہلے انہی سڈول بازوؤں نے رضیہ کی طرف متوجہ کیا۔ وہ بھی پرلے کونے میں بھیگی ہوئی دھجی لیے بیٹھی تھی۔ جب پہلی بار رضیہ کے بازو کا کوندا لپکا، وہ ذرا سی چونکی اور پھر رضیہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اسے نئے سرے سے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔

"اچھا تو رضیہ بیٹی یہ تم ہو!...... یہ ہو تم...... تمھاری جھکی ہوئی لانبی آنکھوں کے گوشوں میں سے یہ جگنو سے کیسے جھانک رہے ہیں! تمھارے بال ایک دم اتنے کیوں بڑھ آئے کہ فرش کو چھو رہے ہیں! یہ کیسے ننھے ننھے بھنور ہیں جو تمھارے گالوں میں بن بن کر ٹوٹ رہے ہیں۔ تمھارا جسم یوں بھرا بھرا سا کیوں لگتا ہے جیسے تم نے جمپر پہننے کے بجائے مڑھ رکھا ہے۔

"ٹھیک ہے، اب تم سترہ سال کی ہو رہی ہو اور پڑوس میں سترہ سال کی عروسہ تین بچوں کی ماں بن چکی۔ مگر بیٹی! ابھی کل تک تو تم گڑیاں کھیل رہی تھیں! ہم تمھارے رشتے کے بارے میں یوں رواداری میں سوچتے تھے، جیسے ابھی تو چار برس پڑے ہیں۔ کوئی ڈھنگ کا رشتہ اس سے پہلے مل گیا، تو ٹھیک ورنہ ایسی جلدی کیا ہے! پر بیٹی، اب تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اگر مہینے دو مہینے کے اندر تمھارے ہاتھ پیلے نہ ہوئے، تو اپنی ہی آگ میں جھلس جائیں گے، یہ ایکا ایکی تمھیں کیا ہو گیا رضیہ بیٹی!...... لیکن جب باپ کی موت بیٹی کی جوانی کا انتظار نہیں کرتی، تو وہ باپ کی موت کیوں روکے؟"

"میرے نصیب!" رئیسہ بیگم ماتھے پر چٹاخ سے ہاتھ مار کر رونے لگی۔

رضیہ دھجی کو پھینک کر ماں کی طرف لپکی۔ بیٹی نے روتی ماں کو اپنے بازوؤں میں لیا اور پکار پکار کر کہنے لگی "مت روئیے امی! اس طرح تو آپ کی بینائی بھی آنسوؤں میں بہ جائے گی امی۔"

روتی ہوئی ماں جیسے سوچ میں پڑ گئی، بیٹی کے بازو کتنے لمبے تھے کہ انھوں نے پوری ماں کا احاطہ کر لیا۔ بیٹی کے جسم میں کتنی گرمی تھی اور اس کی سانسوں میں کیسی شعلے کی سی لپٹ تھی۔ ماں نے بیٹی کو ذرا دیر کے لیے یوں غور سے دیکھا، جیسے پوچھ رہی ہے۔ "بیٹی، تم اب تک کہاں تھیں؟"

مانا کہ بیٹی پیدا ہوتے ہی ماں کے ذہن میں رشتوں کی گرہیں بندھنے کھلنے لگتی ہیں۔ رئیسہ بیگم نے بھی رضیہ کے لیے رشتوں کا پورا دستہ تیار کر رکھا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اب تک وہ تہج تہج چل رہی تھی۔ شوہر کے بازو کا سہارا لے کر تہج تہج چلنے ہی میں مزا آتا ہے۔ وہ سوچتی تھی، حامد برا نہیں مگر چار سو بھی کوئی تنخواہ ہے؟ چار سو میں تو رضیہ کا ایک جوڑا بھی نہیں آئے گا۔ شکور بڑا وجیہہ جوان ہے مگر صرف وجاہت کوئی کہاں تک بیٹھا چاٹے؟ اور پھر رضیہ کیا کم وجیہہ ہے! دنیا بھر میں اس کی سی آنکھیں کوئی دکھا دے تو اللہ قسم! اپنی آنکھیں نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دوں۔

رضیہ کے ابا کہا کرتے تھے۔ "یہ تمھاری بیٹی اپنی آنکھیں کہاں سے لائی ہے؟ میری آنکھیں تو ماشاء اللہ ہیں، تمھاری آنکھوں کو زیادہ سے زیادہ الا ماشاء اللہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ رضو کی آنکھیں!" اور پھر رضیہ نے تو ابھی ایف۔اے پاس ہی کیا تھا۔ بی اے تک پہنچے گی، تو رشتے آپی آپ، زخمی کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑا کر اس کے

قدموں میں ڈھیر ہونے لگیں گے۔

اور اب رئیسہ بیگم شہر کے سبھی لڑکوں کی ماؤں کے قدموں میں زخمی کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا کر ڈھیر ہونے لگیں جو رضیہ کے ابا کی زندگی میں ان کے ذہن میں بھرتی کے امیدواروں کی طرح صف باندھے کھڑے رہتے تھے۔ مگر کسی نے یہ بھی تو نہ پوچھا کہ رضیہ کی طبیعت کیسی ہے؟ سب نے رئیسہ بیگم کو بیوہ کی حیثیت سے دیکھا۔ یہ کسی نے نہ دیکھا کہ بیوائیں مائیں بھی ہوتی ہیں اور وہ اپنی بیٹیوں کے رشتوں کی ڈالیاں سجا کر نہیں پھرا کرتیں۔ یہ کام تو بیٹوں کی ماؤں کا ہوتا ہے۔ یہاں تو بیٹوں والیوں کا طرزِ عمل کچھ ایسا ہو رہا تھا جیسے رئیسہ بیگم کے شوہر کے ساتھ اس کی بیٹی بھی مر گئی۔

''ہا! بہن رئیسہ بیگم۔'' سب کہتیں ''اسی لیے تو بڑی بوڑھیاں ہر نماز کے بعد دعا مانگتی تھیں کہ اے اللہ میاں، ہمیں اس جہان سے سرتاج سے پہلے اٹھا لیجو۔ ہمیں وہ پھول نہ بننے دیجو، جس کے گرد بلبلیں نہیں منڈلاتیں بلکہ جن پر چڑیاں بیٹیں کر جاتی ہیں۔''

ہر گھر سے وہ یہ کہتی ہوئی اٹھی ''اب چلوں بہناں! بھائیں بھائیں کرتے ہوئے گھر میں رضیہ بیٹی گھبرا رہی ہوگی۔''

صرف ایک گھر میں اس کی یہ ترکیب کامیاب رہی۔

''ارے بیٹھو بھی رئیسہ بیگم، کہاں چلیں؟ ایسی بھی کیا جلدی جیسے یہ بتانے آئی ہو کہ ہم جا رہے ہیں۔''

رئیسہ بیگم نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے کہا۔ ''بس چلوں بہناں۔ وہاں اس ویرانے میں جسے کبھی ''فرحت کدہ'' کہتے تھے، میری رضیہ بیٹی گھبرا رہی ہوگی۔''

''اری ہاں وہ رضیہ بیٹی۔'' بانو بولی ''اللہ رکھے وہ تو

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

بے شک بلندیوں پہ ہے فہم و شعور کی
جس دل میں جاگزیں ہے محبت حضورؐ کی

حُسن و جمالِ گنبدِ خضرا ہے دیدنی
''چادر تنی ہوئی ہے مدینے پہ نور کی''

دل باغ باغ ہوتا ہے اس سرزمین میں
چلتی ہیں ہر طرف ہی ہوائیں سرور کی

میں اُمتی ہوں ان کا شفاعت کی ہے اُمید
فہرست یوں طویل ہے جرم و قصور کی

جو شخص ان کے سایۂ رحمت میں آ گیا
اس پر عنایتیں ہوئیں ربِ غفور کی

باقی رہیں گے تا بہ قیامت بفضلِ رب
قرآنِ پاک اور شریعت حضورؐ کی

عالم نہیں تھے غیب کے فیضانِ رب تھا یہ
رکھتے تھے سوجھ بوجھ وہ سارے امور کی

جاتے تھے حال پوچھنے دشمن کے گھر بھی وہ
بیمار کی نبیؐ نے عیادت ضرور کی

خود جنت البقیع میں جاتے رسولِ پاکؐ
کرتے دعائے مغفرت اہلِ قبور کی

میں خوش نصیب مجھ پہ گہر مہرباں ہیں وہ
لکھتا ہوں صدقِ دل سے میں نعتیں حضورؐ کی

(گہر اعظمی، کراچی)

اب پوری سیانی ہو گی۔ میں نے تو سال بھر پہلے اسے شرف النسا کے گھر دیکھا تھا، اس کی بیٹی کی شادی پر۔ سب لوگ مایوں بیٹھی ہوئی عطیہ کو چھیڑ رہے تھے۔ جب رضیہ بیٹی دروازے پر نمودار ہوئی، اور اللہ قسم رئیسہ بیگم، خوشامد کی بات نہیں، سارا کمرا یوں سنسنا کر رہ گیا کہ بس، تکتے رہ گئے سب کے سب۔ رضیہ بھی گھبرائی کہ یہ ایکا ایکی سب کو کیا ہو گیا۔ اس معصومہ کو کیا خبر کہ ہم سب اللہ کی قدرت دیکھتے حیران ہو رہے ہیں کہ اچھا تو ایسی صورتیں بھی ہوتی ہیں کہ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ پلک تک نہ جھپک سکو۔ جھپکو تو سمجھو کوئی گناہ کیا ہے۔ خدا نصیب کرے، کیسی ہے وہ؟ ابا کی موت نے تو اسے نچوڑ لیا ہوگا!''

گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اٹھتی ہوئی رئیسہ بیگم اب آہستہ آہستہ بیٹھ چکی تھی۔ بولی ''موم کی مریم ہو رہی ہے میری جان۔''

''اب تو اس کی ساری فکریں تمھی کو کرنا ہوں گی۔'' بانو بولی۔

''ہاں بہناں، اور کون ہے اس کا؟'' رئیسہ بیگم اب پھسکڑا مار کر بیٹھ چکی تھی۔ ''بس صرف اتنا سا کام باقی ہے کہ بات کہیں طے پا جائے۔ جہیز تو اس کا دو برس پہلے سے تیار رکھا ہے۔ آدھی درجن نیکلیسوں سے لے کر افشاں اور سیندور تک۔ بس اتنا سا ہے کہ کہیں نصیب جاگیں۔''

''نصیبوں نے تو اس زمانے میں بھنگ پی رکھی ہے بہن۔'' بانو بولی ''یہ ہمارے پڑوس میں عاطفہ کو دیکھو، باپ کی اتنی بڑی دکان ہے کہ چاہو تو تانگے سمیت اندر چلی جاؤ۔ پر پانچ سال تک ماں باپ کان دھرے بیٹھے رہے کہ دروازے پر کوئی دستک دے، تو اٹھیں۔ جب کوئی راستہ بھول کر بھی نہ آیا، تو بیٹی کو اٹھا کر ایک اسکول ماسٹر کے پلے باندھ دیا۔ اب اس کے گھروندے میں پڑی جڑواں بچے پیدا کر رہی ہے۔''

''وہ لڑکی تو صورت کی بھی اچھی تھی۔'' رئیسہ بیگم ڈر کے مارے بول دی کہ کہیں بات ختم نہ ہو جائے۔

''صرف اچھی؟'' بانو نے کہا۔ ''اچھی خاصی تھی۔''

''تو پھر تم نے اپنے انور کے لیے کیوں نہ پوچھا؟'' رئیسہ بیگم نے ٹوہ لگانا چاہی۔

الٹا بانو اس کی بات کی ٹوہ تک پہنچ گئی اور ادھیڑ پنے کے باوجود مٹک کر بولی۔

''اس نے تو درجن لڑکیوں میں سے ایک کو چُن بھی لیا۔ اس کے ابا حج سے واپس آ جائیں، تو شاید اگلے چاند کی چودھویں تک......''

''مبارک ہو۔'' کے الفاظ رئیسہ بیگم نے ''تف ہو'' کے لہجے میں ادا کیے اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اللہ کا شکر ہے۔ اللہ پھولے پھلے۔''

''آمین۔'' بانو بولی ''بس چلیں؟''

''ہاں بہنا چلوں۔''

''خدا حافظ۔''

''خدا حافظ!'' رئیسہ بیگم نے کہا اور راستے بھر سوچتی آئی کہ ٹھیک ہی تو کہا ہے بانو نے، سچ مچ اب ہمارا خدا ہی حافظ ہے۔

برآمدے میں رضیہ پرانا البم کھولے بیٹھی تھی۔

''امی'' اس نے کہا ''یہ جو لاہور والی خالہ زلیخا ہیں، جو آپ سے لپٹی کھڑی ہیں۔ یہ اچھی سہیلی ہیں آپ کی کہ ہمارے ابا کا انتقال ہو گیا اور انھوں نے ہمدردی کا ایک کارڈ بھی نہ لکھا۔''

''تو ہم نے کہاں لکھا تھا اسے۔'' رئیسہ بیگم بولی، اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ''اسے پتا چلتا تو خط کیا لکھتی خود

پہنچتی۔ خود نہ آسکتی تو اپنے سلیم کو بھیج دیتی۔ پر اسے کوئی بتاتا بھی تو۔"

"اکبر ماموں نے لاہور میں سب کو تو بتایا تھا۔" رضیہ بولی۔ "اس روز کہہ نہیں رہے تھے کہ ادھر انھیں تار ملا، ادھر وہ کار لے کر سب جاننے والوں کے ہاں اطلاع دے آئے۔"

"زلیخا کا نام نہیں لیا تھا اس نے۔" رئیسہ بیگم بولی۔ "میں نے سب کے نام پوچھے تھے، مگر زلیخا کا نام نہیں آیا۔"

"آپ نے بھی تو یاد نہ دلایا۔" رضیہ نے کہا۔

"ہاں میرے اجڑے ذہن سے بھی اتر گیا۔ برسوں ہو گئے دیکھے ہوئے۔ اس وقت سلیم کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ ایف اے میں پڑھتا تھا۔ اب ایم اے میں تو ضرور ہو گا...." ذرا سا رک کر بولی "بیٹی ذرا کاغذ قلم تو اٹھا لاؤ۔ اکبر کو لکھ دوں کہ وہ زلیخا کو جا کر بتائے۔ میں تو اس کا پتا ہی بھول گئی ہوں۔"

خط لکھ کر اس نے برقع اوڑھا اور گلی کے نکڑ پر لیٹر بکس میں ڈال آئی۔

تیسرے روز دستک ہوئی، رضیہ نے دروازہ کھولا، تو وہیں سے چلائی...."اے امی، یہ تو اکبر ماموں ہیں۔" پھر وہ ماموں کو پیچھے چھوڑ بھاگتی ہوئی آئی اور کمرے میں جھانک کر بولی "اکبر ماموں آئے ہیں امی۔"

مگر رئیسہ بیگم نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ بڑے سکون سے بولی "ہاں ہاں، آئے ہیں، تو ٹھیک ہے۔ میں نے ہی تو بلایا تھا۔"

"کیوں بلایا تھا؟" اکبر کمرے میں آ کر بولا "بلایا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی تو لکھ دیتیں کہ کیوں بلا رہی ہو۔ اب تم دونوں کو جیتا جاگتا دیکھ کر جان میں جان آئی ہے۔ ورنہ جانے کیسے کیسے بھیانک نقشے آنکھوں کے سامنے آتے رہے۔ یہ "فوراً پہنچو" کے الفاظ لگتے تو الفاظ ہیں، مگر اصل میں پستول کی گولیاں ہیں، لے کے کلیجہ ہلا دیا گھر بھر کا، توبہ ہے۔" وہ سر دونوں ہاتھوں میں دبا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"یونہی تو نہیں بلایا۔" رئیسہ بیگم بولی۔ "کوئی بات ہے جو بلایا۔"

"کیا بات ہے؟"

"اب تمھیں نہیں بلاؤں گی، تو اور کیسے بلاؤں گی؟"

"ٹھیک ہے، میں یہ کب کہتا ہوں، پر باجی، یہ بھی بتاؤ کہ خیریت تو ہے نا۔"

"ہاں ہاں ویسے سب خیریت ہے۔"

"تو پھر ادھر آؤ۔ دونوں یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں تو تم لوگوں سے ملا ہی نہیں۔" ذرا دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اکبر نے پوچھا "بھئی باجی۔ یہ بھی تو بتاؤ کہ مجھے بلایا کیوں تھا۔ تم نے تو سولی پر لٹکا رکھا ہے مجھے۔"

"بتاتی ہوں، بتاتی ہوں۔" رئیسہ بیگم نے رضیہ کی طرف کچھ اس طرح دیکھتے ہوئے کہا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی جیسے امی نے اسے کمرے سے باہر جانے کا حکم دیا ہو۔

"تم کہاں چلیں رضو؟" اکبر نے پوچھا۔

"ماموں جان، میں ذرا اُدھر...."

"جانے دو۔" رئیسہ بیگم فوراً بول اٹھی۔ "جاؤ بیٹی تم ماموں کے لیے چائے تیار کرو۔"

رضیہ چلی گئی، تو اس نے اکبر سے کہا "دیکھو اکبر! رضیہ کے ابا کے مرنے کے بعد مجھے دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو رضیہ کے لیے بیاہ کا انتظام اور دوسرے اپنی موت کا انتظار کرنا ہے۔"

"باجی...."

"سنو تو! مجھ ایسی نگوڑی بیوائیں جن کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہوتی، یہی تو کیا کرتی ہیں اور کر ہی کیا سکتی ہیں؟ تو بات یہ ہے کہ رضیہ کے رشتے کا انتظام کرنا ہے جلدی سے۔ اتنی دیر نہ لگے کہ بیٹی ماں سے اس کی طبیعت کا حال بھی پوچھے، تو ایسا لگے جیسے اپنے بیاہ کی یاد دہانی کرا رہی ہو۔"

"یہ تم مجھے بتا رہی ہو باجی؟" اکبر نے بہن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں بھی تو رخسار اور دردانہ کا باپ ہوں، اور وہ تو رضیہ سے پانچ پانچ سات سات سال بڑی ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ بڑا مشکل ہے، مجھے دیکھو، لاہور میں رہتا ہوں۔ اتنا بڑا کاروبار ہے۔ بنگلہ ہے، موٹر ہے۔ سب کچھ ہے مگر داماد نہیں ملتا۔ سب کہتے ہیں لڑکیاں زیادہ پڑھی لکھی نہیں۔"

"پر رضیہ نے تو ایف اے پاس کر لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر وہ سیالکوٹ میں رہتی ہے نا۔ لاہور، کراچی میں ہوتی تو ایک دن بھی نہ لگتا۔"

"تو میں لاہور میں اٹھ آؤں؟ میں تو اس کام کے لیے دنیا کے آخری کنارے تک جانے کو تیار ہوں۔"

"آجاؤ۔" اکبر نے کہا۔

"سنو!" رئیسہ بیگم کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ "ایک رشتہ ہے۔"

"کہاں؟" اکبر دم بخود سا رہ گیا۔

"لاہور میں!"

"لاہور میں؟" اکبر نے یوں پوچھا، جیسے لاہور میں رشتے کی موجودگی ناممکنات میں شامل ہے۔

"ہاں ہاں۔ میری وہ سہیلی ہے، تم تو اسے جانتے ہو، زلیخا۔"

مزاحیہ غزل

پہلی خطا ہی اس کی اگر در گزر نہ ہو
پھر عاشقی کا شوق اسے عمر بھی نہ ہو

اکثر میں سوچتا ہوں فریب نظر نہ ہو
برقعے میں دیکھنا کہیں اس کی "مدر" نہ ہو

بیوی کے سامنے تمھیں آپا جو کہہ دیا
اتنی سی بات پر خفا مائی ڈیئر نہ ہو

آنکھوں میں لے کے لڑکیاں پھرتی ہیں بجلیاں
شاید وزیر بجلی کو اس کی خبر نہ ہو

اے شاد، تھانیدار سے تم مُک مُکا کرو
ورنہ یہ رات تھانے میں اپنی بسر نہ ہو

فخر اللہ شاد

"ہاں جانتا ہوں۔"

"اس کا بیٹا سلیم۔" رئیسہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"ارے ہاں..... ہاں۔" اکبر بھی ذرا سا مسکرایا۔

اب رئیسہ بیگم اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ بولنے لگی۔ "پچھ اتنے امیر بھی نہیں کہ نخرے کرنے لگیں۔ سیدھا سادہ، درمیانہ گھرانا ہے۔ پھر زلیخا کے ساتھ میرا اتنا پرانا تعلق ہے کہ مجال ہے جو وہ انکار کر جائے۔ تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ میں کہاں اس بڑھاپے میں ماری ماری پھروں گی۔ اگر تمھارے ساتھ چلی بھی جاؤں، تو رضیہ کو اکیلے کیسے چھوڑوں؟ اسے بھی لے جاؤں، تو یہ باتیں کیسے سنوں کہ رشتے کی خاطر بیٹی کو ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے، نمائش کے لیے۔ سو تم یوں کرو کہ واپس جا کر اسٹیشن سے سیدھے زلیخا کے گھر پہنچو اور اس سے سیدھی بات کر دو۔ کہہ دو رئیسہ نے یونہی کہا تھا۔"

''یہی بات، باجی، تم خط میں بھی تو لکھ سکتی تھیں۔'' اکبر نے شکایت کی۔

''نہیں، اکبر پیارے! ایسی باتیں خطوط میں لکھنے کے زمانے گزر گئے۔ آج کل ڈاک کا کیا اعتبار۔ غلطی سے یہ خط اڑوس پڑوس والوں کے ہاتھ لگ جائے، تو اشتہار بنا پھرے۔''

لمحہ بھر خاموشی رہی۔ پھر رئیسہ بیگم بولی ''پھر اب کیا ارادہ ہے؟''

اکبر بولا ''ٹھیک ہے۔ جاتا ہوں۔ بڑی اچھی بات ہے۔ بڑی مناسب بات ہے۔''

چائے پی کر اکبر واپس چلا گیا۔ اور ادھر رات گئے تک ماں بیٹی ایک دوسرے سے یوں جھینپی جھینپی پھرتی رہیں جیسے کوئی بات کریں گی، تو کچھ ٹوٹ ٹاٹ جائے گا۔

''جاگ رہی ہو میری رضو۔'' آخر رئیسہ بیگم نے اس تکلیف دہ خاموشی کو توڑا۔

''ہاں امی!'' رضیہ بولی ''پڑھ رہی ہوں۔''

''میں آج بہت خوش ہوں۔'' رئیسہ بیگم نے راز فاش کیا۔

''شکر ہے۔'' رضیہ بولی۔

پھر خاموشی چھا گئی، کیونکہ رئیسہ بیگم کو بات آگے بڑھانے کے لیے کوئی نئی بات نہ سوجھی اور رضیہ بات آگے بڑھانا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اسی کیفیت میں ایک دن گزرا۔ ایک ہفتہ گزرا۔ ایک مہینا گزرا۔ آخر ایک روز رئیسہ بیگم نے اکبر کے نام ایک لمبا خط لکھا۔ برقع اوڑھا اور گلی کے نکڑ پر لیٹر بکس میں ڈال آئی۔

تین چار دن بعد ڈاکیے نے دستک دی۔ رضیہ دروازے کی طرف لپکی، اور خط لا کر ماں کے حوالے کر دیا۔

''اکبر کا معلوم ہوتا ہے۔'' رئیسہ بیگم نے کہا۔

''ہاں!'' رضیہ بولی۔ ''انہی کا لگتا ہے۔''

رئیسہ بیگم کچھ دیر تک لفافے کو الٹتی پلٹتی رہی، جیسے سوچ رہی ہے کہ کس طرف سے چاک کروں۔ اگر چاک کرلوں تو کہیں خط اپنی عبارت بولنے نہ لگے۔

رضیہ چپکے سے کمرے میں سے نکل آئی۔

رئیسہ بیگم اسے جاتا دیکھ کر مسکرائی۔ لفافہ چاک کیا۔ آدھا خط پڑھنے تک یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چمٹی رہی۔ پھر یکا یک چراغ کی طرح بجھ گئی۔ پھر وہ ایک غیر انسانی چیخ مار کر وحشیوں کی طرح کمرے سے باہر نکلی۔ رضیہ دوڑی آئی۔ رئیسہ بیگم نے خط اس کے ہاتھ میں ٹھونس کر پوری قوت سے کہا ''اسے پڑھو۔ اونچا اونچا پڑھ کر سناؤ۔ سارے محلے کو سناؤ، ساری دنیا کو سناؤ۔''

''امی!'' رضیہ نے اس سے لپٹتے ہوئے کہا۔

مگر رئیسہ بیگم نے رضیہ کو اپنے آپ سے جیسے نوچ کر الگ کر دیا اور اسے ڈپٹ کر بولی۔ ''پڑھو۔''

رضیہ ہولے ہولے پڑھنے لگی۔ اس کے اکبر ماموں نے اپنی ''پیاری باجی'' کو اطلاع دی تھی کہ ایک عجیب اتفاق ہو گیا:

''میں تمھیں خط لکھتا تو کیسے لکھتا۔ ہوا یہ کہ میں زلیخا بہن سے ابھی ادھر ادھر کی باتیں کر ہی رہا تھا کہ اس نے جھٹ سے اپنے سلیم کے لیے میری رخسانہ کا رشتہ پوچھ لیا۔ اب میں حیران کہ کیا کروں؟ پھر سوچا کہ رخسانہ بھی تو تمھاری بیٹی اور رضیہ سے سات سال بڑی ہے۔ آج رخسانہ کے نصیب جاگے ہیں، تو کل رضیہ کے بھی ضرور جاگیں گے۔ سو بات وہیں طے پا گئی۔ ۱۵ رجب نکاح کی تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ تم ہفتہ عشرہ پہلے پہنچ جانا۔ رضیہ کو بھی ساتھ لیتی آنا۔ یہاں دو تین لڑکے میری نظر میں ہیں......
دعا کا طالب اکبر!''

ترقی و خوشحالی کی نوید

نئے صوبے بننے چاہییں؟

صوبوں کی قلت کے باعث دور دراز علاقوں میں مقیم لاکھوں پاکستانی انتظامی و قانونی مسائل سے دوچار ہیں

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

مغربی مفکر رابن جیفرے اپنی کتاب ''بھارت میں کیا ہو رہا ہے؟'' (What is happening in India) میں لکھتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت میں کئی صوبے تشکیل دیے گئے۔ مثلاً کرناٹک، یوپی، تامل ناڈو، کیرالہ وغیرہ۔ آج بھارت میں ۲۹ ریاستیں اور ۷ علاقہ جات مرکز کے ماتحت ہیں۔ اس لحاظ سے بھارت کی کل ۳۶ اکائیاں ہوئیں۔

بھارت جیسی ابھرتی قوت کے مقابل ایک دور میں پاکستان کے صرف دو صوبے تھے: مغربی اور مشرقی پاکستان۔ اب صوبوں کی قلت کے باعث ہماری ناگفتہ بہ صورت حال سب کے سامنے ہے۔ بھارت زیادہ صوبے بنا کر گھاٹے میں رہا یا فائدے میں؟ بھارتیوں نے سیاسی بصیرت کی بنا پر سکھوں کی خالصتان تحریک پر قابو بھی پا لیا۔ ادھر پاکستان میں بار بار مارشل لا کے نفاذ اور کمزور جمہوریت نے عوام میں عدم اعتمادی پیدا کر دی۔ اسلام ہمارے اتحاد کی بنیاد ہے۔ اور اردو قومی زبان

جس سے تمام قوم اتحاد میں پروئی جاتی ہے۔ لیکن کئی وجوہ کی بنا پر ہم عدم اتحاد کا شکار ہیں۔ ایک اہم وجہ صوبے کم ہونا بھی ہے۔ اگر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی مثالیں سامنے رکھی جائیں تو یہ حقیقت آشکار ہوگی کہ صوبوں کو خودمختاری دی جائے تو ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوکر مضبوط تر بن کے اُبھرتا ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل ممالک کی مثالیں پیش ہیں:

نام ملک	کل صوبے
جرمنی	۱۶ صوبے
کینیڈا	۱۲ صوبے اور ۲ علاقے
چین	۲۲ صوبے اور ۸ خودمختار علاقے
نائیجیریا	۳۱ صوبے
افغانستان	۳۴ صوبے
ملائیشیا	۲۷ صوبے
فرانس	۲۲ صوبے
چلی	۱۲ صوبے اور ایک شہری علاقہ
ایران	۲۴ صوبے
ترکی	۸۱ صوبے
انڈونیشیا	۲۷ صوبے
جاپان	۴۷ صوبے
سعودی عرب	۱۳ صوبے
امریکا	۵۰ ریاستیں
سنگاپور	۵ صوبے
الجیریا	۴۸ صوبے

سنگاپور کا رقبہ ۶۲۲ مربع کلومیٹر ہے اور اس کے پانچ صوبے ہیں۔ جبکہ پاکستان کا رقبہ ۷۹۶۰۹۶ مربع کلومیٹر ہے اور اس کے صرف چار صوبے ہیں۔ اسی طرح جغرافیائی طور پر پاکستان سے چھوٹے کئی ممالک کہیں زیادہ صوبے یا ریاستیں رکھتے ہیں۔ وجہ یہی کہ انتظامی، سیاسی اور معاشی امور بہتر طور پر چلانے کے لیے زیادہ صوبوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ورنہ بہترین انتظام حاصل نہیں ہوسکتا۔

پنجاب کی آبادی ساڑھے آٹھ کروڑ ہے۔ یہ آبادی جرمنی کے برابر ہے جہاں انتظامی صوبے ۱۶ ہیں۔ جرمنی زبردست معاشی اور عسکری قوت ہے۔ سری لنکا جیسے چھوٹے ملک میں بھی انتظامی اکائیاں ۷۶ ہیں یعنی ۸ صوبائی کونسلیں اور ۶۸ ضلعی کونسلیں۔

دنیا کے مختلف ممالک کی مثالوں سے عیاں ہے کہ پاکستان میں نئے صوبے تشکیل پانے چاہئیں۔ مثال کے طور پر سرائیکی صوبہ (مرکز ملتان) اور صوبہ بہاولپور وقت کی ضرورت ہیں۔ پوٹھوہار کا بھی علیحدہ صوبہ بننا چاہیے جس میں راولپنڈی، چکوال، جہلم اور اٹک کے اضلاع شامل ہوں۔

انتظامی لحاظ سے پنجاب کی تقسیم لازمی ہے۔ صادق آباد سے لاہور کا فاصلہ قریباً ۵۰۰ کلومیٹر بنتا ہے۔ انتظامی سہولت کے تحت اگر بہاولپور صوبہ بن جائے تو عدالتی، انتظامی اور دفتری معاملات نمٹاتے ہوئے عوام کے لیے فاصلے سمٹ جائیں گے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وہ علاقے جو لاہور سے انتظامی و تجارتی طور پر منسلک اور بہاولپور سے دور ہیں، وہ جنوبی پنجاب میں نہ شامل کیے جائیں مثلاً میانوالی اور بھکر وغیرہ۔

اسی طرح سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں بھی مزید صوبوں کی ضرورت ہے۔ فاٹا اور پوٹھوہار کو بھی علیحدہ صوبہ بنانا چاہیے۔ پوٹھوہار کے اضلاع کی آبادی نا روے۔

سویڈن، مالدیپ، سری لنکا، سوئٹزرلینڈ، ملائیشیا جیسے ممالک سے بھی زیادہ ہے۔ بہاولپور ڈویژن کا رقبہ ۸۸۷۸مربع کلومیٹر اور آبادی ۲۰۶۱۴۴۷ ہے جو دنیا کے کئی ممالک کی آبادی سے زیادہ ہے۔ مثلاً سری لنکا، مالدیپ وغیرہ۔

جب سنگاپور ۱۹۶۵ء میں آزاد ہوا تو اس وقت کے سربراہ مملکت نے سیاسی اکابرین کو بلا کر کہا ''اب ہم آزاد ہو چکے۔ بتاؤ کہ ملک لوٹنا ہے یا مستحکم کرنا ہے؟'' سب نے استحکام کے حق میں جواب دیا۔ آج ۵۷ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل یہ ملک معاشی اور سیاسی لحاظ سے انتہائی مستحکم ہو چکا۔ اس ملک پر ایک ڈالر بھی قرض نہیں۔ دوسری طرف پاکستان میں سیاست کے فرعونوں اور دیگر بااثر طبقے نے اسے تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا۔

اب ملکی مفاد کے پیش نظر مزید صوبوں کا قیام لازم ہے۔ نئے صوبے اپنے اخراجات خود برداشت کریں گے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ یہ صوبے معاشی بوجھ ثابت ہوں گے۔ نئے صوبے بنانے سے غدار پیدا نہیں ہوتے بلکہ محب وطن لیڈر ملک کو مزید مستحکم کریں گے۔ مشرقی پاکستان جغرافیائی لحاظ سے ہم طور پر بالکل علیحدہ تھا۔ اب افواج پاکستان وطن کی بطرز احسن حفاظت کر سکتی ہیں کیونکہ تمام صوبے جغرافیائی لحاظ سے ملحق ہیں۔

پاکستان میں زیادہ صوبوں کی بدولت سیاست ، معیشت میں بہتری آئے گی۔ جرائم بھی کم ہوں گے۔ ہر صوبے کی سطح پر عدلیہ کا ادارہ بہتر طور پر کام کر سکے گا۔ سستا اور فوری انصاف ملے گا۔ اس سلسلے میں انگریز آقا لارڈ میکالے کا فوجداری قانون بدل کر شرعی نظام تفتیش نافذ کرنا ہوگا۔ فرعون پولیس کی غنڈہ گردی اور رشوت خوری بھی ختم ہوگی۔

اس وقت نئی سوچ، ذہنی انقلاب اور ایسی نوجوان قیادت کی ضرورت ہے جو عوام کی خادم بنے نہ کہ حاکم۔ بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ اور لیاقت علی خان نے کتنے پلاٹ اور دولت چھوڑی تھی؟ ہمیں عوام و وطن دشمن حاکموں اور سیاست دانوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ سرکار دو عالمﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ظالم بادشاہ اور فرعون قیامت کے دن باری تعالیٰ کے سامنے چیونٹی بن کر نمودار ہوں گے۔ پھر ان خبیثوں کو کوڑے مار کر جہنم رسید کر دیا جائے گا۔ قیامت کے دن پاکستان کے فرعون اور کرپٹ سیاست دان خدا کو کیا جواب دیں گے؟ ◆◆◆

سنہری باتیں

☆ عمل میں اخلاص عمل سے زیادہ سخت ہے۔ (عبداللہ خلیق)
☆ جس شخص کی لوگ عزت اور تکریم کریں اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو حقیر اور کمتر خیال کرے۔ (عبداللہ منزلیؒ)
☆ جسے گمان ہو کہ وہ حقیقت سے قریب ہے وہ دراصل حقیقت سے دور ہوتا ہے۔ (علی سہل اصفہانی)
☆ حقیقی راحت نفسانی خواہشات سے چھٹکارا حاصل کرنے ہی میں ہے۔ (یوسف اسباط)
☆ دوزخ سے نجات چاہتے ہو، تو خلق خدا کی خدمت کرنے کو اپنا شعار بناؤ۔ (شمس تبریزی)
☆ تواضع یہ ہے کہ تو جسے بھی دیکھے اپنے آپ سے بہتر سمجھے۔ (عثمانی ہارونیؒ)

(تحریم رمضان، عارف والا)

انداز تحریر سنوارنے کو

ہم نے پاکستانی فلم دیکھی

اسّی سالہ ہیرو اور پچاس سالہ ہیروئن کی غیر معمولی اداکاری نے مصنف کو نئے ذائقوں سے آشنا کر دیا

طیب امین قیصرانی

پچھلے دنوں ایک خیرخواہ سے ملاقات ہوئی۔ بولے:

''واہ، واہ! ماشا اللہ! خوب مزاح لکھتے ہیں! ابھی کل ہی کے اخبار میں آپ کی تحریر دیکھی۔''

تعریف سن کر اچھا تو بہت لگا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی کسرِ نفسی سے کام لینا پڑا: ''جی بس یہ آپ کی مہربانی ہے کہ پڑھ لیتے ہیں، ورنہ ہم کچھ ایسا خاص بھی نہیں لکھتے۔''

یہ عاجزی ہمیں بہت مہنگی پڑی۔ گویا ہوئے: ''جی واقعی، آپ کا مضمون زیادہ خاص تو نہیں تھا۔ بس آپ کا دل رکھنے کو کہہ دیا۔''

بعدازاں انھوں نے ہمیں ایک عدد مشورے سے

بھی نواز دیا: "آپ اپنے مزاح میں نکھار لانا چاہتے ہیں تو مزاحیہ کتابیں زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔ خاص طور پہ وقت ملے تو پاکستانی فلمیں ضرور دیکھیں۔"

ان کے مشورے کا ایک حصہ تو سمجھ میں آیا کہ چلو ٹھیک ہے، مزاح لکھنے کے لیے مزاحیہ تحریریں پڑھنا ضروری ہے۔ مگر مشورے کا دوسرا حصہ سر کے اوپر سے گزر گیا۔

"پاکستانی فلموں سے آپ کی مراد شاید مزاحیہ فلمیں ہیں؟" ہم نے تصدیق چاہی۔

"ضروری نہیں...... کوئی بھی فلم دیکھ لیں۔"

بات پلے تو نہ پڑی تاہم تجسس ضرور ہوا کہ پاکستانی فلم میں آخر ایسا کیا جادو ہے کہ کسی قلم کار کے مزاح میں نکھار لے آئے۔

☆☆

ڈی وی ڈی لینے کسی دکان پر جانا ہماری روایت پسند نظر میں معیوب حرکت تھی کہ کسی شناسا سے سامنا ہوا تو خوامخواہ منہ چھپاتے پھریں گے۔ تاہم تجسس اپنی جگہ رہا۔ بالآخر ایک دن خود کو تہ در تہ چادر میں چھپا کر بازار نکلے۔ ایک صاحب جو شکل وصورت سے کافی معقول نظر آتے تھے، ان کی دکان میں داخل ہوئے اور کہا: "کچھ معیاری پاکستانی فلمیں دکھائیے۔"

انھوں نے ہمیں ایک نظر سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر زیرِلب دہرایا: "پاکستانی معیاری فلمیں۔"

پھر دکان کے عقبی حصے کی طرف آواز لگائی: "شیدے! صاحب کو پاکستانی معیاری فلمیں دکھاؤ۔"

یہ کہہ کر انھوں نے ایک بار پھر ہمیں سر سے پاؤں تک گھورا۔ چند لمحوں بعد شیدا فلموں کا ڈھیر لے آیا اور پوچھا: "کون سی فلم کی ڈی وی ڈی چاہیے آپ کو؟"

ہمارے خیرخواہ نے ہمیں کوئی نام نہیں بتایا تھا، سو ہم بولے "کوئی سی بھی دے دیجیے۔"

اب انھوں نے نام گنوانا شروع کیے:

"شریف گجر، بدمعاش گجر، بدتمیز گجر، لڑاکا گجر......"

بڑی مشکل سے آگے بند باندھا کہ صاحب اس طرح کی فلمیں نہیں چاہئیں اور کہا: "آپ کے پاس رومانی فلمیں ہوں گی؟"

وہ پھر سے شروع ہو گئے:

"کلین شیو گجر، اکلوتا گجر، لوئی گجر......"

مزید بحث وتمحیص کا حوصلہ نہ رہا تھا، سو گویا ہوئے: "بس کوئی سی بھی دے دیں اور براہ مہربانی مجھے فلم کا نام مت بتائیے گا۔"

☆☆

ڈی وی ڈی لیے گھر پہنچے۔ پھر اپنے ایک دوست کو بلا لیا۔ دراصل ہم فلمیں بہت کم دیکھتے ہیں اور فلم اسی وقت سمجھ آتی ہے جب کوئی ساتھ بیٹھ کر ہمیں بتاتا رہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ ننھے کی حد درجے منت سماجت کے بعد لیپ ٹاپ ملا۔ ڈی وی ڈی لگاتے ہوئے اس پہ بڑا سا "گجر" لکھا ہوا ہم نے دیکھ لیا۔ اور پھر فلم شروع ہوئی۔

ایک "ساٹھ سالہ" باپ اپنی اپنی "پچاس سالہ" بیٹی کے ہمراہ کسی ظالم وڈیرے کے ظلم سے تنگ آ کر بھاگ رہا تھا۔ پولیس کی دو گاڑیاں ان کے تعاقب میں تھیں۔ باپ بیٹی ویرانے میں بنے ایک گھر میں جا چھپے۔ دوست نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا کہ یہ گھر خالی ہو

گا۔ گھر خالی ہی تھا، تاہم منظر میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کونے سے اچانک ایک بھینس سامنے آئی، ''صدائے چارہ'' بلند کی، ادا سے دم ہلائی اور یوں منظر مکمل ہو گیا۔

گھر پہنچ کر باپ بیٹی کے ساتھ ڈائریکٹر کی غیبی امداد ایک عدد کلاشنکوف کی صورت شامل ہو گئی جس کا پہلے سارے فسانے میں کہیں ذکر نہیں تھا۔

اور پھر پولیس کی صرف دو گاڑیوں سے کم و بیش ستر اہلکار اترے اور انھوں نے علاقے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بیٹی نے کلاشنکوف کا بٹ دیوار کی اینٹ اکھاڑنے کے لیے مارا تاہم وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بیٹی نے زیرلب کچھ پڑھا۔ ہمیں شک ہے کہ وہ واقعتاً دعائیں پڑھ رہی تھیں یا اس مشکل سین پر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کو گالیاں دیتی رہی۔

بہرحال اگلے ہی پل نہ صرف اینٹ ہٹی بلکہ وہاں بنے سوراخ سے پولیس اہلکاروں پر گولیاں بھی برسنے لگیں۔ نشانہ ایسے غضب کا اور ڈائریکٹر کی غیبی امداد اس کمال درجے کی تھی کہ ادھر تین فائر ہوئے اور ادھر تیرہ پولیس والے لڑھک جاتے۔ یوں صرف سات آٹھ گولیوں نے ستر سپاہیوں کا کام تمام کر دیا۔

گو اس کرشماتی سین کے بعد ہمارے مزاج میں خاطر خواہ نکھار آ گیا تب بھی ہم کسی طور دوسرا منظر دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ ہمارا دوست ایک ہاتھ سے ہنسی کے مارے پیٹ پکڑے ہوئے تو دوسرے سے ہمیں کھینچ کر بٹھانے کی سعی میں تھا۔ سو اس کے اصرار پر مجبوراً ہمیں بیٹھنا پڑا۔

اگلے منظر میں انسانی طاقت کا زبردست مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ ایک بڑا ٹرک سڑک پہ گامزن تھا۔ جب پل کے نیچے سے گزر رہا تھا تو اچانک جھٹکے سے رک گیا۔ ڈرائیور باوجود کوشش کے ٹرک اپنی جگہ سے ہلانے پر بھی قادر نہ ہوا۔ تب کیمرا رفتہ رفتہ اوپر کی جانب اُٹھا اور ہم ایک بار پھر ڈائریکٹر کی پیشہ ورانہ خوبیوں اور فراست کے قائل ہو گئے۔

دور پہاڑی پر کھڑے گھنگریالے بالوں والے ایک ''اسی سالہ'' نوجوان نے ایک رسا وہاں سے پھینکا تھا۔ نوجوان کو پھر غیبی مدد کی ضرورت تھی جو اسے میسر رہی۔ پل کے اوپر سے پھینکا گیا یہ رسا ٹائر جکڑنے میں کامیاب رہا۔ پھر ہماری گنہگار آنکھوں نے اس ولی کے ہاتھوں کا کمال دیکھا۔ وہ رسا سیکڑوں ٹن وزنی ٹرک فضا میں بلند کرنے لگا۔

واللہ! ہمیں ان سورما کی خوراک پر چنداں شک نہیں کہ دیگیں آرڈر پر بنواتے اور پھر ہاضمے کا سیرپ ساتھ رکھ کر تناول فرماتے ہوں گے۔ رہی بے چاری بدہضمی تو وہ سرہانے بیٹھی ٹکٹکی باندھے انھیں تکتی ہوگی۔ خود ہمارے محلے میں ایسے ایسے سورما رہتے ہیں کہ کھانے کے لیے بیٹھیں، تو گھر والے رضاکارانہ طور پر اپنے حصے کا کھانا بھی ان کے آگے رکھ خالی خولی چنے چبا رہے ہوتے ہیں۔

اگر کوئی ہم سے کہہ دے کہ یہ فلم پاکستان کی فلمی صنعت کا شاہکار ہے۔ کوئی دعویٰ کرے کہ یہ فلم اپنے حصے میں بیسیوں قومی ایوارڈ رکھتی ہے، تب بھی ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا۔ بلاشبہ اس فلم میں جو کچھ مزاح دیکھنے کو ملا، وہ دیگر ممالک کی بیشتر فلموں میں عنقا ہوتا ہے۔

◆◆◆

جسے اللہ رکھے، اُسے کون چکھے

مجھے اللہ نے بچا لیا

بہلا پھسلا کر معصوم لوگوں کو لوٹنے والے ایک خطرناک گروہ کا سنسنی خیز قصہ

مہ جبیں

میں نے لیڈی میکلیگن کالج، لاہور میں نیا نیا داخلہ لیا تھا۔ لڑکیوں سے زیادہ واقفیت بھی نہیں ہوئی تھی۔ زیادہ وقت لیکچر سننے، نوٹ بنانے اور برآمدے میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے رہنے میں گزرتا۔ پیریڈ ختم ہونے پر میں سڑک سے رکشا پکڑتی اور گھر چلی آتی۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ لمحات میرے لیے یہی ہوتے کیونکہ ہمارے کالج کے ساتھ ہی ہیلی کالج اور دوسرے بے شمار تعلیمی ادارے واقع ہیں۔ چھٹی کے وقت

کسی سواری کا ملنا جوئے شیر لانا ہوتا۔ بسیں عموماً کھچا کھچ بھری ہوتیں۔ ویسے بھی مجھے دو بسیں بدلنا پڑتی تھیں۔ اس لیے عموماً رکشا پکڑ کر جاتی۔ چاہے اس کے لیے مجھے دو گھنٹے کھڑے رہنا کیوں نہ پڑتا۔

ایک بار جماعت میں میری طبیعت بھاری سی ہو گئی۔ سر میں شدید درد ہونے لگا۔ لگتا تھا ابھی بخار چڑھ جائے گا۔ میں نے پیریڈ چھوڑ کر گھر کی راہ لی۔ اتفاق ایسا ہوا جونہی میں کالج کے دروازے سے نکلی، سامنے سے ایک رکشا آتا نظر آیا۔ میرے ہاتھ دینے سے پہلے ہی وہ رک گیا۔ بن سوچے سمجھے میں بھی اس میں جا بیٹھی جیسا کہ عموماً میں کرتی ہوں۔

میں نے رکشے والے کو گھر کا راستہ بتایا اور بے فکر ہو کر بیٹھ گئی۔ رکشے والا مضبوط جسم کا کم عمر لڑکا تھا۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد بڑی شستگی سے بولا ''باجی مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ آپ اجازت دیں تو عرض کروں۔''

میں سمجھی، شاید راستے کے متعلق کچھ کہے گا۔ میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ میرے جواب پر کہنے لگا ''باجی دراصل میں کل سے بہت پریشان ہوں۔ آپ پہلی سواری ہیں جسے میں قابل اعتماد سمجھ کر اپنی پریشانی بتا رہا ہوں۔ آپ مجھے پہلی نظر میں اپنی بہن سی لگی ہیں۔ میری بہن سوات میں رہتی ہے۔''

میں ان پُر خلوص الفاظ سے پگھل گئی اور اس کی حوصلہ افزائی کی کہ مجھے بتائیے کیا بات ہے؟

وہ بولا ''باجی کل دوپہر میرے رکشے میں ایک غیر ملکی عورت چڑھی تھی۔ وہ مجھے انارکلی لے گئی۔ مجھے ٹھہرا کر خریداری کی پھر مجھے اسٹیشن چلنے کا کہا۔ میں اسے اسٹیشن چھوڑ آیا۔ باجی میں اسے چھوڑ کر ہوٹل کھانا کھانے اترا تو تین بنڈل اپنے رکشے میں پڑے دیکھے۔ وہ میم صاحبہ انھیں چھوڑ گئی تھیں۔ میں فوراً ہی اسٹیشن پہنچا۔ مجھے وہ نہیں ملی، نجانے کون سی گاڑی میں چلی گئی تھی۔ پہلے سوچا، یہ بنڈل تھانے دے آؤں۔ لیکن باجی میں تھانے جانے والی چیزوں کا حشر جانتا ہوں۔

''ایک بار میں نے ایک مسافر کا بٹوہ تھانے جا کر دیا۔ آپ یقین کریں، تھانے دار نے میرے سامنے بٹوہ کھول کر پیسے تقسیم کر لیے اور پچاس روپے مجھے پکڑا کر کہا کہ جا بچہ عیش کر۔ باجی! میں نے بنڈل کھولے۔ ایک میں تین ساڑھیاں ہیں اور دوسرے میں سفید موتیوں کا قیمتی ہار۔ تیسرے میں سرمئی رنگ کی شال ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ اکیلا آدمی ہوں، کوئی بھی چیز میرے کام کی نہیں۔''

بات کچھ ایسی تھی کہ میرے دل کو جا لگی۔ میں بن سوچے بول پڑی ''مجھے دکھاؤ، اگر قیمت کم لو گے تو میں خرید لوں گی۔ تم پیسے رکھ لینا۔''

اس نے رکشا روکا اور آگے جھک کر کچھ دیکھنے لگا۔ پھر بولا ''باجی مجھے کسی رقم کی ضرورت نہیں۔ ایک بہن میری پردیس میں ہے، دوسری آپ کو کہا ہے۔ یہ چیزیں آپ رکھ لیں۔ مجھے لگے گا، اپنی بہن کو دے دیں۔''

اس کی آواز خلوص و محبت سے کانپ رہی تھی۔ میں دل ہی میں سوچ رہی تھی کہ کم قیمت پر یہ چیزیں ضرور خرید لوں گی۔ اس نے پھر رکشا اسٹارٹ کر دیا اور کہنے لگا ''باجی اس کے بدلے آپ مجھے اچھی جگہ ملازمت دلا دینا۔ یہی میری خوش بختی ہوگی۔''

میں حیران تھی کہ جن چیزوں کا ذکر ہو رہا ہے، وہ تو مجھ تک پہنچی بھی نہیں۔ پھر میں نے ایک دم محسوس کیا کہ

رکشا غلط راستے پر جا رہا ہے۔ میں نے کہا ''بھائی! میرا گھر تو مزنگ کی طرف ہے، یہ راستہ غلط ہے۔''

میرا منہ بولا بھائی ہنسا اور کہنے لگا ''باجی میں آپ کو وہ تحفے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں۔ دراصل صبح جلدی میں تھا، اپنی کوٹھڑی میں ہی بھول آیا۔ آپ رکشے ہی میں رہیے، میں چٹکی بجاتے ہی لے آؤں گا۔''

میں بیوقوف بنی اس کی باتیں سنتی رہی۔ سمن آباد سے بھی کچھ دور آگے آ گئے تو مجھے پہلی دفعہ کچھ شبہ سا ہوا کہ یہ شخص کہیں مجھے چکر تو نہیں دے رہا؟ میں نے محسوس کیا کہ اب اس کا رویہ بھی بدلتا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کہیں تحفوں کے لالچ میں اپنی جان نہ گنوا بیٹھوں۔ اسی وقت میرے ذہن میں اپنے بہنوئی کا خیال آیا جو تھانے دار ہیں۔ وہ گھر آ کر اکثر فریب دہی کی ایسی باتیں سناتے ہیں۔

یہ خیال آتے ہی میں نے اپنا بیگ باہر پھینک دیا اور چلا اٹھی ''بھیا! ذرا ایک منٹ رکنا، میرا بیگ گر گیا۔''

''بھیا'' اپنی ''بہن'' کی چال میں آ گیا۔ اس نے رکشا روکا۔ میں چھلانگ لگا کر بیگ لینے لپکی۔ سڑک پر ہلکی ٹریفک چل رہی تھی۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا۔ رکشے والا واپس پلٹا اور بولا ''چلو باجی دیر ہو جائے گی۔''

میں نے بیگ کھول کر نوٹ بک نکالی اور رکشے کا نمبر نوٹ کرنے کی غرض سے پیچھے ہٹی۔ آپ یقین کریں اس کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے بجلی کی تیزی سے رکشا اسٹارٹ کیا اور یہ جا وہ جا۔ لیکن میرے ذہن پر رکشے کا نمبر اچھی طرح جم چکا تھا۔

نمبر نوٹ کر کے میں نے دوسرا رکشا پکڑا اور گھر آ گئی۔ میں نے بہنوئی کو سارا قصہ سنا کر رکشے کا نمبر دیا۔

بچارہ جلد ہی پکڑا گیا۔ اس کی جو درگت بنی سو بنی لیکن اس انکشاف نے مجھے حیرت زدہ کر دیا کہ یہ ایسے گروہ کا ایک فرد تھا جو صرف تنہا مرد و زن کو لوٹنے کی خاطر رکشا ڈرائیوری کرتے ہیں۔ اللہ نے مجھے بروقت بچا لیا۔ اگر ذرا سی بیوقوفی کر جاتی تو نجانے کیا ہو جاتا۔ ◆◆◆

بھکاری

گھر کے دروازے پہ کر کے چاند ماری بے دھڑک
آ گیا ہے مانگنے کوئی بھکاری بے دھڑک
واسطہ دیتا ہے اپنی بھوک کا افلاس کا
کر کے شامل اس میں اپنی گریہ زاری بے دھڑک
دس روپے کے نوٹ سے کم بھیک وہ لیتا نہیں
منہ بناتا ہے اگر دیں ریز گاری بے دھڑک
ہاتھ خالی لے کے گھر سے یہ نکلتا ہے غریب
لوٹتا ہے کر کے اپنی جیب بھاری بے دھڑک
صبح دم رکھتا نہیں کیسہ میں اک پائی مگر
شام کو ہوتا ہے وہ اٹھارہ ہزاری بے دھڑک
جانتا ہے مانگنے کا اک سے اک اعلیٰ ہنر
نت نئے ناٹک رچائے یہ مداری بے دھڑک
بینک کا عملہ اسے جو دیکھ لے آتے ہوئے
دوڑتا ہے تھامنے اس کی پٹاری بے دھڑک
لال بتی پہ کھڑے سائل کو جب آواز دی
درجنوں آئے نکل اس کے حواری بے دھڑک
دیکھتا ہوں جب کسی کشکول والے کو ضیاءؔ
دل پہ لگ جاتا ہے کوئی زخم کاری بے دھڑک

(شرافت ضیاءؔ، اسلام آباد)

معصوم پاکستانی بیوی پر

لندن میں کیا گزری!

حیرتوں اور مصیبتوں کے ملاپ سے جنم لینے والے جذباتی لمحات کی دلچسپ سرگزشت جن سے ایک دیسی خاتون کو ولایت پہنچ کر نمٹنا پڑا

راشدہ علوی

ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیراعظم ہوئے، تو قوم جمہوریت کے جشن منانے لگی۔ انھوں نے ۱۹۷۲ء میں بیمہ زندگی قومیانے کا اعلان کر دیا۔ بینک اس کے دو سال بعد قومیائے گئے۔ بیمہ قومیانے کا اعلان اچانک تھا۔ قومی اسمبلی میں بحث ہوئی، نہ کسی سے مشورہ مانگا یا لیا گیا۔ اگلے قدم میں صنعت وحرفت جس میں ملوں اور فیکٹریوں کے ساتھ گاؤں میں آٹا پیسنے کی چکی بھی شامل تھی، قومیالی گئی۔ آخر میں پرائیویٹ اسکولوں کی باری آئی۔ بہت سی چھوٹی صنعتیں یعنی چکیاں اور اسکول دو تین سال کے اندر اندر اپنی موت آپ مر گئے۔ اگلے بیس سال بمشکل کوئی اسکول کھلا اور صنعتیں ابھی تک ضعف کا شکار ہیں۔

نج کاری یا نیشنلائزیشن کی باد مخالف نے ہماری زندگی کا دھارا بھی بدل دیا۔ میرے شوہر، محمد حسین علوی کا تعلق بیمہ زندگی کے شعبے سے تھا۔ عمر کا بیشتر حصہ اسی صنعت سے وابستہ رہے۔ انھیں اس ابھرتی صنعت کے تابناک مستقبل پر یقین تھا۔ عام آدمی جو فوائد بیمہ سے اپنی زندگی

محترمہ راشدہ علوی پٹیالہ (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد والدین کے ہمراہ راولپنڈی چلی آئیں۔ گریجوایشن کے بعد کچھ عرصہ اسکول میں بچوں کو تعلیم دی۔ شادی کے بعد برطانیہ چلی گئیں اور وہیں آباد ہیں۔ لکھنے لکھانے سے دلچسپی تھی، اس لیے اپنی یادداشتیں لکھنے لگیں۔ آپ کی پہلی کتاب ''بستے بستے بستی'' ہے جو ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ اسلام آباد میں بیتے وقت پہ لکھی گئی۔ دوسری کتاب ''ہرا دھنیا'' ۲۰۱۳ء میں طبع ہوئی۔ اس میں مصنفہ نے لندن میں گزرے لمحات کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ زیرِ نظر مضمون اسی آپ بیتی سے بصد شکریہ لیا گیا ہے۔ اس منفرد آپ بیتی کے چیدہ حصوں سے آئندہ بھی قارئین لطف اندوز ہوسکیں۔

میں یا اس کے بعد حاصل کر رہا تھا، وہ ان کے مشاہدے میں تھے۔ جب وہ ضائع ہوتے دیکھے تو کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔

کرنا کیا تھا، بس مضامین لکھ کر اخباروں کو بھیجنے لگے۔ پڑھے لکھے لوگ یہی کیا کرتے ہیں۔ بیمہ زندگی کے فائدے اور قومیانے کے نقصانات پر لکھا۔ کئی آوازوں نے لبیک کہا اور شاباش دی۔ میڈیا نے ساتھ دیا۔ لیکن جمہوری حکومت کو یہ مشورہ دخل در معقولات لگا اور سخت ناپسند آیا۔ خیر حکومت کا حق ہے کہ جس چیز کو نامناسب سمجھے، ناپسند کر دے۔ ویسے بھی یہ کوئی قومی اسمبلی کا فیصلہ تھوڑی تھا، فردِ واحد کی آواز تھی۔ نظرانداز کرنا مشکل نہ تھا، لیکن حکومت نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا۔

محمد حسین علوی کو مضامین لکھنے کی پاداش میں اب سرکاری بیمہ کمپنی سے معطل کر دیا گیا۔ ساتھ میں ذاتی سیاست چمکانے اور سیٹھوں کا آلۂ کار بننے کا الزام لگا۔ ان میں سے کوئی بھی الزام قابلِ دست درازیٔ پولیس نہ تھا۔ پھر بھی تفتیش کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ سال بھر کی چھان بین کے بعد پولیس تھک ہار کر بیٹھ گئی، کوئی جرم ثابت نہ ہو سکا۔ تین سال گزر گئے، معطلی ختم نہ ہوئی۔

آخر ایک دوست نے جو بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے، بتایا کہ آپ کی فائل پر وزیراعظم بھٹو نے خود اپنے قلم سے لکھا ہے ''یہ آدمی فلاں کا رشتے دار ہے۔ اسے کبھی اپنے عہدے پر واپس نہ بھیجا جائے۔'' چلو چھٹی ہوئی۔ اب رشتے داری سے کیسے انکار کیا جاتا؟ اگرچہ ہمارے تعلقات اس رشتے دار سے ایسے تھے کہ صحیح صورتِ حال کا علم ہوتا، تو جناب وزیراعظم ہمیں اپنی آنکھ کا تارہ بنا لیتے۔ غرض رشتے داری ہمارا جرم ٹھہری، اس کے زیرِ عتاب آئے۔ ایسے میں دادرسی کی کیا امید تھی؟

لندن کو روانگی

ایسٹرن فیڈرل یونین میں شوہر کی ملازمت ہماری زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ کمپنی میں کام کرتے دس سال گزر گئے تھے۔ ملک بھر میں اس کے دو سو سے زیادہ دفتر تھے۔ دس ہزار لوگوں کا روزگار کمپنی سے وابستہ ہے۔ ایسٹرن فیڈرل کے پاس ملک کا ۴۵ فیصد انشورنس تھا۔ باقی کا پچپن فیصد سینتیس کمپنیوں میں بٹا ہوا تھا۔ میرے شوہر کمپنی کے کامیاب ترین افسروں میں شمار ہوتے۔

انشورنس کے قومیاتے ہی ایسٹرن فیڈرل کے سربراہ، روشن علی بھیم جی پر ملک چھوڑنے کی پابندی لگ گئی۔ شوہر معطل ہو چکے تھے۔ صدمہ کے ساتھ یہ فکر بھی لگ گئی کہ روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر! تین برس پابندی ختم ہونے میں لگے۔ پابندی ختم ہوتے ہی بھیم جی لندن جانے کو تیار ہو گئے تاکہ آغا حسن عابدی سے لندن میں انشورنس کمپنی کھولنے کے لیے سرمائے کی بات چیت کر سکیں۔ ہاں کا اشارہ ملتے ہی اپریل ۱۹۷۴ء میں میرے شوہر بھی لندن پہنچے اور دونوں نئی کمپنی کی تشکیل میں جت گئے۔

مارک لین میں دفتر کھولنے سے پہلے بی۔ ڈی ہاؤس، یوسٹن میں دو بیڈ روم کا فلیٹ کرائے پر لیا گیا۔ اس کی صفائی ستھرائی، برتن بستروں کی جھاڑ پونچھ کے لیے ایک عورت روزانہ آ جاتی۔ کھانا پکانا البتہ ایک محاذ تھا جسے سر کرنا پڑا۔ بھیم جی قیمہ بنا لیتے تھے۔ لیکن بقول خود ان کے ہفتہ بھر یہ کھانا کھانے کے بعد لفظ ''قیمہ'' ہی بھوت اڑانے کو کافی ہوتا۔ شوہر نامدار انڈا ابالنے کے بھی قابل نہ تھے۔ پردیس جانے سے پہلے میں نے کچھ ہدایات دینے کی کوشش کی تھیں جنھیں ''اللہ مالک ہے'' کہہ کر ٹال دیا گیا۔ بیٹھنے کا کمرا دفتر کا کام دینے لگا۔

ہاتھ بٹانے کو تحسین شیروانی اور احمد رشید دفتر آنے لگے۔ دونوں لندن اور اس کی انشورنس کمپنیوں کے بارے میں اچھی خاصی سدھ بدھ رکھتے تھے۔ کھانے کے غیر تسلی بخش حالات دیکھ کر احمد رشید نے ہفتہ وار کھانا پکانے کی ذمے داری سنبھال لی۔ برخوردار خورشید ہاشمی جو ان دنوں بیرسٹری کرنے کے بعد حالت تذبذب میں تھے کہ پاکستان جائیں یا نہ جائیں، وہ بڑے کام آئے۔ وہ ہفتے بھر کا راشن خریدنے اور کپڑے ڈرائی کلین کرانے کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

آسٹریائی لڑکی کی فرمائش

دفتری خط کتابت کے لیے ایک بھارتی لڑکی امینہ کو سیکرٹری رکھا گیا۔ لیکن وہ جلد بیاہ رچا کر بھارت جا بسی۔ اس کے بعد بریجڈ آئی، چوبیس سالہ حسین و جمیل آسٹریائی لڑکی، کام میں ماہر، وقت کی پابند اور چست و چالاک تھی۔ تین ہفتے مشین کی طرح کام کرنے کے بعد اس نے بھیم جی اور علوی صاحب سے بات کرنے کا وقت لیا۔ خیال تھا کہ وہ تنخواہ بڑھانے کی بات کرے گی۔ اور دونوں اس کے لیے تیار تھے۔ لیکن بات شروع ہوئی تو چکرا گئے۔ گفتگو کچھ یوں تھی:

بریجڈ: کیا میں بدشکل ہوں؟

دونوں: بالکل نہیں۔

بریجڈ: مجھ میں کوئی جسمانی کمی ہے؟

دونوں: نہیں، بالکل نہیں۔

بریجڈ: پھر کیا وجہ ہے کہ آپ دونوں میں سے کسی نے مجھے آج تک چائے پانی یا سنیما تھیٹر کی دعوت تو در

کنار، میری تعریف میں ایک حرف تک نہیں کہا۔
دونوں یک زبان بولے: ''تم ہمیں اپنی بہن بیٹی کی طرح قابلِ احترام لگتی ہو......
وہ آگ بگولا ہوگئی، بولی: ''ماں بہن بنائیں اپنی بہن بیٹی کو، میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں۔ میں ایک عورت ہوں اور ویسا ہی سلوک چاہتی ہوں، نا کہ ایک مشین کا سا، جو آئی، کام کیا اور چلی گئی۔'' اب دونوں کا جواب تھا کہ اصل میں ہم شادی شدہ ہیں اور......
وہ ترت بولی: ''کیا میں نکاح پڑھانے کا کہہ رہی ہوں؟ بس کبھی کبھی کھانا کھلانے یا سینما دیکھنے کی بات کرتی ہوں، اس میں کیا حرج ہے؟ ویسے بھی تمھاری بیویوں کو کیا پتا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔''
اس پر وہ شریف آدمی بولے ''ساری بات بھروسے کی ہے۔''
اب وہ کچھ شکست خوردہ سی ہوگئی اور بولی ''مجھے ان عورتوں سے ضرور ملوانا جن کی عدم موجودگی میں بھی تم کوئی نامناسب حرکت کرنے کو تیار نہیں۔''
اس کے بعد بات ہنسی خوشی طے ہوگئی اور دونوں اسے کھانے پر لے گئے۔ ہوسکتا ہے، یہ جنت کا دروازہ نہ ہو لیکن دو پاکستانی حضرات کے لیے ولایتی کھڑکی سے تازہ ہوا کے جھونکے ضرور آنے لگے۔

ہم تو چلے پردیس

منزلِ شوق و ارمان کو میری روانگی اگست ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ لندن ان دنوں بھی خوابوں کی دنیا تھی جہاں جانے کی تمنا ہر دوسرے دل میں تڑپتی رہتی۔ خود میرے دل میں لندن دیکھنے کی دبی دبی خواہش سلگتی۔ اسکول کالج کے زمانے سے اس کے بام و در کا تصور دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ انگریزی ادب کی ہر کتاب لندن کے قصوں سے بھری ہوتی۔ اس کے شاعر اور موسم کب سے ہمیں لبھا رہے تھے۔ زیادہ تر ان کتابوں میں سبزہ ہی سبزہ لکھا ہوتا۔ اگر کسی دھول دھپے کا ذکر آیا بھی، تو ہم نے اسے قابلِ دراعتناء نہ سمجھا۔
یہ حالات تھے جب ہمیں لندن کا بلاوا آیا۔ وطن چھوڑتے، ماں باپ رشتے داروں اور دوستوں کو خدا حافظ کہتے اور دسترخوان سمیٹتے ہوئے ملال اپنی جگہ، لیکن نئی دنیا دیکھنے کا شوق ہر غم پر حاوی ہوگیا۔ اللہ پر بھروسا کر فکر و تردد کو پس پشت ڈال سفر کے لیے تیار ہوئے۔ پاسبانِ عقل بھی کہیں ادھر اُدھر کھسکا دیے گئے۔ یوں سفر کو وسیلہ ظفر بنا ہم لندن روانہ ہوئے۔ ہر مہاجر کی طرح خیال تھا کہ حالات سدھرتے ہی واپس لوٹ آئیں گے۔
ہوائی جہاز کے روانہ ہوتے ہی پاؤں کے نیچے سے حقیقتاً زمین سرک گئی۔ بچوں کا ساتھ تھا، ورنہ رو رو کر نئی تاریخ مرتب کر دیتے۔ اب کیا لکھیں، رات گئی بات گئی۔ سفر کا حال اپنی بے خبری اور بے علمی کا اعتراف ہے۔ کس منہ سے کہیں کہ سفر ائیر فرانس سے ہوا اور ہاتھ میں ایک فرانک نہ تھا۔ کس طرح اقرار کریں کہ پانچ سالہ احمد رات کا کھانا کھائے بغیر سوگیا اور صبح چار بجے پیرس سے ناشتا خریدنے کی کوششیں ناکام رہیں۔ کیونکہ دس ڈالر کی رقم اتنی بڑی تھی کہ بینک کے علاوہ اس کی ریزگاری کہیں سے دستیاب نہ ہوئی۔
اس بات سے بھی بے خبری تھی کہ جہاز میں چائے کے ساتھ ''یورک'' کے سینڈوچ آئیں، تو دوسرا منگوایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ کم علمی کی داستان یہیں بس ہو جاتی، تو کیا حرج تھا لیکن قصہ طویل ہے۔ ہیتھرو ہوائی اڈے پر جہاز سے نکلنے کے بعد کوسوں پیدل چلنا پڑے گا، علم نہ تھا اور کسی نے ذکر بھی نہیں کیا۔ لندن گھومنے والے کسی

ادیب، سفیر اور سفرنامہ نگار کو توفیق نہ ہوئی کہ ان برآمدوں کی لمبائی کا ذکر کر دیتا کہ مجھ ایسی کئی عورتوں کا بھلا ہو جاتا۔ وہ بچوں کے ساتھ کندھوں پر بیسیوں پونڈ وزنی تھیلے لادنے کی حماقت تو نہ کرتیں۔

ارے اتنی بھیڑ

یہ امر بھی لندن آنے کے بعد منکشف ہوا کہ جس شعبے کو ہمارے ہاں ایک آدمی چلاتا ہے، ہیتھرو ہوائی اڈے پر اسے تین ہزار آدمی دیکھتے ہیں۔ اب ہماری حیرانی اور پریشانی کا اندازہ کریں۔ بڑا تو ہمیں ہزار بار بتایا گیا تھا لیکن کتنا بڑا؟ دو گنا؟ دس گنا؟ سو گنا؟ جس ہوائی اڈے سے ہماری اڑان ہوئی وہاں دن میں تین جہاز اتر جاتے تو خبر اخبار کی زینت بنتی تھی۔ یہاں ہر تین منٹ بعد ایک جہاز اتر رہا تھا۔ تین سو سات سو مسافر ہر تین منٹ بعد ان ناقابل ذکر برآمدوں میں داخل ہو رہے تھے۔ مسافر بھی ہر رنگ، نسل، عمر اور جنس کا۔ پھر خدا جانے کیا تاثیر تھی اس ملک کی ہوا میں کہ سب خاموش تھے۔ منہ بند، چپ چاپ، گونگے! اپنے آپ میں مگن، سر جھکائے پا اٹھائے منزل کی طرف رواں تھے۔ کوٹ پتلون، شلوار قمیص، چغے، ساڑھیاں، جلبابے، سکرٹ، سائے حرکت میں مگر بے آواز!

ویزہ ہال آتے آتے ہم نڈھال ہو گئے۔ دل دہلانے کو لوگوں کی بل کھاتی ہوئی میلوں لمبی قطاریں سامنے تھیں۔ خیال آیا کہ رات یہیں بسر ہو گی۔ انتظار میں کھڑے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ ہال کی وسعت چار پانچ فٹ بال میدانوں کے برابر تو ہو گی۔ سر پر چکا چوند روشنیاں اور پاؤں کے نیچے قالینی فرش تھے۔ اللہ چاہتا تو دنیا کے سارے عجائبات کھڑے کھڑے وہیں دکھا دیتا۔ اس کے لیے سب ممکن ہے، ہال کی تو اوقات ہی کیا! اختتام قطار پر تین امیگریشن افسر کرسی میز لگائے بیٹھے تھے۔ اپنی باری پر سامنے جا کھڑے ہوئے۔ پاکستانی پاسپورٹ پیش کیا۔ تسلی کے بعد دو منٹ میں آگے بڑھنے کا عندیہ مل گیا۔

اگلا مرحلہ سامان کی وصولی تھا۔ ہال کی لمبائی چوڑائی اور روشنیوں کی بہتات کے باوجود ہوش و حواس قائم رہے۔ سامان کے لیے ٹرالی کا ہونا ہمارے علم میں اضافہ تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی ٹرالی سنبھالی۔ شکر ہے ہدایات اتنی بار لکھی ہوئی تھیں کہ اندھوں کے سوا سب پڑھ لیں۔ یہ بھی شکر ہے کہ انگریزی پڑھنی آتی تھی۔ اتنی ساری نئی چیزیں ایک ساتھ دیکھنا آسان نہیں، دماغ کچھ بے قابو سا ہو رہا تھا۔ بچے الگ ساتھ چپک رہے تھے۔ رہی سہی کسر حبس نے پوری کر دی۔ دوسرا صندوق نظر ہی نہ آ کر دیا، وہ پیرس رہ گیا تھا یا میری طرح کا کوئی بدحواس اٹھا کر چلتا بنا۔ بہرحال صندوق غائب تھا۔ ابھی تلاش جاری تھی کہ ایک پورٹر نے قریب آ کر پوچھا ''مسز علوی ہو؟'' حیرت سے ہاں کہا۔ اس نے بتایا کہ

تمھارے شوہر پریشان ہیں کہ اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے؟ پتا سنتے ہی وہ دفتر شکایات لے گیا۔ یوں ہوائی اڈے سے گلوخلاصی ہوئی۔

سورج چمک رہا ہے

امتحانوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اصل صدمہ تو باہر آ کر ہوا۔ لندن گرمی سے دہک رہا تھا۔ لندن کو لپیٹ کر رکھنے اور ہزاروں افسانے جنم دینے والی دھند ہمارے آمد پر جل بھن کر بھاپ ہو گئی تھی۔ چلچلاتی دھوپ بدن جھلسا رہی تھی۔ لے لو لندن کے مزے اور منا لو خوشیاں... لندن کو تو برصغیر کی دھوپ نے لپیٹ رکھا تھا۔

لندن تاکتے جھانکتے مجھے وہ گانا سنائی ہی نہ دیا جو میرے شوہر پورے زور شور سے بجا رہے تھے۔ اس کی تلاش میں انھوں نے شہر کنگھال ڈالا تھا۔ آخر توجہ دلوائی تو اسے سنا۔ گانے کے بول تھے:

"بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے......" خیال اچھا تھا مگر اگست کے گرم مہینے میں پھول کہاں؟ یہاں تو آگ برس رہی تھی۔

انگریز مرد و زن کو آتے ہی نیم برہنہ دیکھنے کا موقع ملا۔ کچھ لوگ اس موقع کو "سنہرا" کہہ رہے تھے۔ اس میں کیا چیز سنہری تھی بالوں کے سوا؟ پوری قوم گلیوں، سڑکوں اور پیدل راہوں پر لیٹی گرما گرم دھوپ کے مزے لے رہی تھی۔ سڑکوں اور گلیوں میں لیٹنے کے پیچھے فلسفہ یہ بتایا گیا کہ موسم کا یہاں اعتبار نہیں۔ گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ ہے۔ ہوسکتا ہے گھر جاتے جاتے سورج بادلوں میں چھپ جائے، یہ ہوسکتا ہے اتنی دیر میں چھما چھم مینہ برس پڑے۔ چناں چہ جلدی سے جہاں جگہ ملے، دھوپ میں بے لباس ہو اور وقت سے فائدہ اٹھا کر دھوپ تاپ لو۔ شاید چمکتے سورج میں گھاس اکٹھی کرنے کا محاورہ اسی ملک میں بنا۔

گریوی سے کری تک

گھر یعنی اس فلیٹ میں پہنچے جس کا ایک کمرا دفتر تھا۔ نہا دھو کر طبیعت بحال ہوئی۔ صندوق گم ہو جانے کی پاداش میں شلوار قمیص سے محرومی شامل تھی۔ میاں کا سلیپنگ سوٹ پہن کر غسل خانے سے نکلی، تو لندن کی سنائی مہمان نوازی کا پہلا خوشگوار تجربہ ہوا۔ کھانے کی میز پرتکلف پاکستانی کھانوں سے بھری ہوئی تھی۔ میرے رشتے دار احمد رشید جو گزشتہ دس برس سے لندن میں مقیم اور بقول شخصے دیسی کھانا پکانے کے ماہر بن چکے تھے، قورمہ، آلو قیمہ اور مرغ کا سالن اپنے ہاتھ سے پکا کر لائے۔

دسترخوان کا جائزہ لیا، کھانوں کی شکل کچھ کچھ پہچان میں آ رہی تھی، لیکن خوشبو اجنبی محسوس ہوئی۔ پوچھنے پر رشید بھائی نے مدراس کری، کشمیری کری اور ونڈالو جیسے نامانوس نام بتائے۔ ہماری معصومی پر "کری" کی تعریف بیان ہوئی۔ کچھ سالن کے بجائے کری بنانے کا تیار بہ ہدف نسخہ بوتلوں کی شکل میں بکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ لفظ "گریوی" انگریز ہندوستان ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ دیسی کھانا یہاں کری کہلاتا ہے۔

کھانے کے بعد پتا چلا کہ یہ کھانا گرم اور کری زیادہ ہے۔ اور اتنی زیادہ کہ مرغ، قیمہ اور گوشت سب اس میں غرق ہو کر اپنی خوبی کھو چکے۔ نہ مرغ مرغ رہا نہ گوشت، گوشت ہے۔ خوشبو نامانوس اور ذائقہ بے کار۔ مستقبل میں ہمارے کھانوں کا ذائقہ ایسا ہوگا؟ یہ ذوق

ذہن پر کاری ضرب تھی۔ لندن آنے کی خوشی ماند پڑ گئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ نہ مجھے کھانا پکانا آتا تھا نہ میں پکانے کی شوقین تھی۔ مگر بری کا ذائقہ مستقبل کے دودھ میں مینگنیں ڈال رہا تھا۔

ایک ہی دن میں ناشتے سے رات کے کھانے تک انڈے کھا کھا طبیعت اوب گئی، تو اعلان کرنا پڑا۔ ''کھانا خود بناؤں گی۔''

میری ''صلاحیتیں'' جاننے کے باعث میرے شوہر ڈر گئے۔ پوچھا ''تمھیں کھانا بنانا آتا ہے؟''

قبولنا پڑا کہ اس میدان میں طفل مکتب ہوں۔ کھانے کا چسکا البتہ ہے، شاید اس سے کچھ مدد ملے۔ اختتام ہفتہ والی سبزی اور ان کے لوازمات خریدنے قریب کی ایک دکان پر پہنچے، جس پر دیسی بنگالی کام کرتے تھے۔ دکان کیا تھی عمرو عیار کی زنبیل تھی جس میں برصغیر کی ہر سبزی، پھل، پان، دال اور مسالوں کے ساتھ حلال گوشت اور مرغیاں بھی بک رہی تھیں۔

قیمتیں ہیں ہوش ربا

دھنیے کی گٹھی اٹھاتے ہوئے اس کی قیمت پر نظر پڑ گئی۔ وہ ہاتھ سے چھٹتے چھٹتے بچی۔ پاکستان میں اس قیمت سے ایک ہفتے کی سبزی آسکتی تھی۔ ہرا دھنیا اور ہری مرچیں سبزی کے ساتھ مفت تھما دی جاتیں۔ قیمت تو سبزی کی بھی سونے کے بھاؤ تھی، لیکن دھنیے کو کیوں آگ لگ گئی یہاں آن کر؟ میاں سے شکایت کی تو بولے ''جب تک پونڈوں کو روپے میں تبدیل کرتی رہو گی جان اسی عذاب میں رہو گی۔ آج سے روپیہ بھول جاؤ اور یہاں کی کرنسی کو قبول کرلو۔''

بھگاری دال میں دھنیے کی سوندھی سوندھی خوشبو نے وطن، میکا، سسرال اور باورچی سب یاد دلا دیے۔ خوشبو کے چکر میں نمک مرچ کا پتا ہی نہ چلا۔ دھنیے کی قیمت نے جو گھاؤ لگائے تھے، خوشبو نے بھر دیے۔ کھانے کے مسائل سے پہلے مجھے جس مسئلے کو حل کرنا پڑا، وہ پہننے کو کپڑے تھے۔ چناں چہ لندن اترنے کے اگلے ہی روز سفری کپڑے دھو، پہن کر آکسفورڈ اسٹریٹ کا چکر لگانے کو تیار ہو گئی۔ یہ چکر مجھ پر فرض تھا۔

میں مستقل ایک جوڑے میں رہ سکتی تھی نہ میاں کے سلیپنگ سوٹ میں۔ دوسرے آکسفورڈ اسٹریٹ کی شہرت مجھ تک پہنچ چکی تھی۔ وہاں جانے کا شوق لندن کے شوق سے دو قدم آگے تھا۔ اس بازار کی دکانوں کے شان و شوکت کے چرچے کئی کئی برس کان پک چکے تھے۔ وقت آگیا تھا کہ یورپ کی طویل ترین بازاری اسٹریٹ میں جا کر بنفس نفیس خریداری کی جائے۔ پتا چلے کہ دنیا کے سب سے بڑے اسٹور مارکس اینڈ سپنسر کا طول و عرض کیا ہے!

لندن کے ہوائی اڈے اور اس کی لمبائی چوڑائی سے طبیعت میں جو گھبراہٹ اور خفقان پیدا ہوا، اس کا اثر ابھی زائل نہیں ہوا تھا کہ آکسفورڈ اسٹریٹ کا ہجوم اور دکانیں سامنے آ گئیں۔ اس کی تاریخ اور جغرافیہ بھول کر ہونقوں کی طرح دائیں بائیں دیکھتے ہوئے طلسم ہوش ربا میں داخل ہوئی۔

ایک اسٹور میں

بڑی مشکل سے سامنے لٹکے کپڑوں پر نگاہ گئی، تو ہینگروں کی تعداد نے پریشان کر دیا۔ اپنے تو پورے ملک میں اتنے ہینگر نہ ہوں گے جتنے دکان کے اس حصے میں تھے۔ ہینگروں پر ٹنگے کپڑے اس کے علاوہ تھے۔ جان بڑی مشکل میں تھی، کیا دیکھیں کیا نہ دیکھیں، کہاں دیکھیں کہاں آنکھ موند لیں۔ ویسے تو آنکھوں کے ساتھ منہ بھی کھلا تھا، اسے بند کرنے کی زیادہ ضرورت تھی۔ قیمتیں پڑھ کر ہوش الگ اڑ گئے۔ الٹی سیدھی خریداری ہوئی۔ آخر کوٹ پتلون میں ملبوس، لندن کے مٹیالے اور بے رنگ جم غفیر میں ایک اور انسان کا اضافہ ہو گیا۔

تنہائی کا عذاب

لندن میں رہنے سہنے کے اپنے انداز و اطوار ہیں۔ پہنچتے ہی ان پر قابو پانے کی تگ و دو شروع ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ کھانے پکانے سے کہیں زیادہ اہم مسائل بھی اس ملک میں موجود ہیں۔ ان میں سرِدست بچوں کا اسکول میں داخلہ تھا۔ پانچ سال کی عمر کا ہر بچہ اسکول میں ہونا چاہیے۔ پہلے دن انھیں اسکول چھوڑ کر آئی تو میاں دفتر جا چکے تھے۔ خاموش گھر میں رہنا دل دہلانے والا تجربہ تھا۔ سمندر کی تیز اٹھتی لہروں کی طرح تنہائی سر سے پاؤں تک وجود کو بھگوتی گزر گئی۔ شاید جیل میں قید تنہائی ایسی ہوتی ہو۔ کوئی آواز، آہٹ اور سرسراہٹ نہ تھی۔

وہ آوازیں غائب ہوئیں جن کی میں عادی تھی۔ گم ہوئی بچوں کو پکارتی ماؤں کی پکار اور گلی میں کھیلتے بچوں کی چہکار! یہاں تو چہکار کے ساتھ بچے بھی غائب تھے۔ پوچھنا پڑا کہ کہاں ہیں اس قوم کے بچے؟ جواب ملا، اسکول، کھیل کے میدان میں یا ٹیلی ویژن کے سامنے۔ ان کے گلی کوچوں میں کھیلنے کے دن ہوا ہو چکے۔ اس کے علاوہ بھی ہر ہانکتی پکارتی آواز غائب تھی۔ پیتل، تانبہ، قلعی کرنے، ردی اخبار خریدنے اور سبزی ترکاری بیچنے والے کی آوازیں افسانہ ہوئیں۔ ایشیا کے بارونق شہروں کا بے ہنگم بکھرا بکھرا شور داستان پارینہ ہوا۔ اب تو دیارِ مغرب کی کم کم سنائی دیتی محتاط آوازیں تھیں۔ یہ ہوتی ہے بے وطنی کہ آوازیں تک اجنبی ہو جاتی ہیں۔

پرندوں کی چہچہاہٹ تک سنائی نہ دیتی۔ ویسے بھی ہمارے علاقے میں درخت بہت کم تھے۔ پرندے بیچارے کیا فلیٹ کی کھڑکیوں سے لٹک کر چہکتے؟ فلیٹ کا ماحول بے گانہ تھا۔ چھتیں نیچی، دیواریں پھولدار اور پاؤں تلے قالین، سب غیر تھے۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے کو کچھ نہ تھا، تھا تو دلچسپی سے خالی۔ سرخ آڑی ترچھی چھتوں کے بیچ جھانکتے ہوئے دھندلے سرمئی آسمان کو قابلِ دید کہنا عام انسان کے بس کی بات نہیں اور ہر کوئی پکا سو نہیں ہوتا۔

"رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو" اچھا شعر ہے۔ لیکن جب پالا پڑا تو پتا چلا کہ کیسا ہوتا ہے ایسی جگہ جا کر رہنا جہاں کوئی نہ ہو! نہ واقف، نہ ہمدم! ہو سکتا ہے کسی خاص کیفیت میں یہ تنہائی قبول ہو سکے جیسے محبت میں مبتلا ہو کر خدا کی بندگی میں دل اٹک جائے۔ ہماری

تنہائی تو بن بلائی مہمان تھی، اس کا کیا کرتے سوائے سینہ کوبی کے؟

بچپن اور جوانی بھرے گھر میں گزری تھی۔ چچا، تایا، خالہ پھوپیوں کے خاندان آتے جاتے رہتے۔ ویسی ہی لمبی چوڑی سسرال ملی۔ شوہر دریا دل، ہجوم دوستاں میں گھرے ہوئے۔ گھر کے دروازے کھلے عزیز و اقارب، دوست احباب، ہمسائے اور محلے دار آتے جاتے۔ کوئی گھومتے پھرتے محلے کی نئی لیلیٰ کا قصہ سنا جاتا۔ رات کا اختتام کسی شادی، کسی شبینے پر ہوتا۔ عادت یہ تھی کہ کوئی ہمیں ملنے آئے یا ہم کسی کو ملنے جائیں تو باتیں ہوں۔ چٹکلے اور افسانے سنے جائیں۔ کہانیاں، قصیدے دہرائے جائیں۔ خاندانی جھگڑوں کا ذکر ہو۔ حالات حاضرہ اور سیاست پر تبصرہ ہو اور کچھ نہ ہو تو دو تین خواتین مل کر دوپٹوں اور شلواروں کے رنگ ملانے چل پڑیں۔ بس کوئی لمحہ تنہائی کا نہ ملے، ہر وقت دوسرا ہٹ کی ضرورت، ہر وقت بولنے کی عادت۔
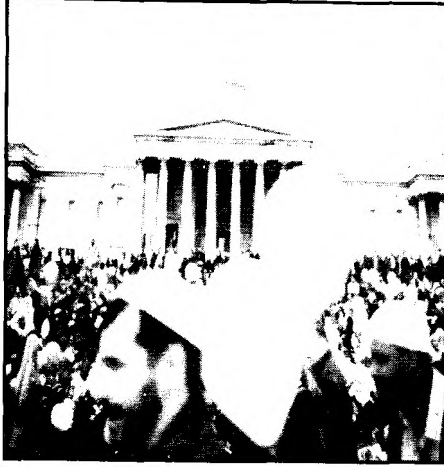
یہ عادت بھی عجیب چیز ہے، ایک دفعہ چمٹ جائے تو مشکل سے چھوٹتی ہے۔ خاص طور پر بری عادت۔ چھٹتی بھی اس طرح ہے کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پان سگریٹ کی عادت کو لے لیں، چھڑائے نہیں چھوٹتی۔ ایسا لگتا ہے، لوگوں سے ملنے جلنے اور گپ شپ لگانے کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں بری عادتوں سے ملتے ہیں۔ جبھی تو یہ بھلائے نہیں بھول رہی تھیں۔ رہ رہ کر یاد آتیں۔

زبانِ یارِ من ترکی

ہمیں بلانے والے لندن میں گم تھے۔ جو تھے وہ اللہ میاں کے پچھواڑے رہتے۔ کوئی دس میل دور جنوب میں، کوئی سات میل شمال میں۔ یونہی ٹہلتے ٹہلتے ملنے جانا ممکن ہی نہ تھا۔ دعائیں مانگتے کہ کوئی آجائے اور کچھ نہیں تو دروازے کی گھنٹی بج اٹھے۔ یہاں تو دودھ والا بھی بغیر دروازہ کھٹکھٹائے، چپکے سے دودھ کی بوتلیں رکھ کر کھسک جاتا ورنہ اسی کو روک لیتے۔ اس کے بیوی بچوں کی خیر خیریت پوچھتے۔ ڈاکیے کا حال اس سے بھی برا تھا، خط وہ نچلی منزل پر بنے لیٹر بکس میں ڈال کر چلتا بنتا۔ شکل سے بھی آشنائی نہ تھی۔ دودھ والا مہینے کے بعد کم از کم پیسے تو لینے آ جاتا۔ رہ گئے ہمسائے تو وہ اکثر عرب تھے۔ گونگوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے، عربی لہجے میں گھونٹ کر السلام علیکم کہہ لیتے اور بات ختم۔ زبانِ یارِ من ترکی ہو تو کوئی بات کیسے کرے؟

ایک روز بڑے بیٹے، جاوید کو بخار آ گیا۔ ڈاکٹر نے ہر دو گھنٹے بعد دو گولی اسپرو کھانے کا مشورہ دیا۔ ساتھ میں یہ بھی کہا اگر کل تک بخار نہ اترا تو فون کر دیجیے گا۔ شام سے پہلے ہی حالت سرسامی ہو گئی۔ ڈاکٹر کو پھر فون کیا، وہ

آدھے گھنٹے میں پہنچ گئے۔ بیٹے کو دیکھتے ہی ایمبولینس کو فون کر دیا۔ دس منٹ میں پوں پاں کرتی ایمبولینس آ گئی اور بیٹا ہسپتال پہنچ گیا۔ اسے گل پھڑے ہو گئے تھے۔

دنیا بھول کر پورا ہفتہ ہسپتال کے چکر لگتے رہے۔ ہسپتال لندن کے دوسرے سرے پر تھا۔ ہم یوسٹن میں اور ہسپتال ٹوٹینگ میں تھا۔ ریل سے جانے میں پینتالیس منٹ لگتے۔ دوسرے بچوں کو اسکول سے لینا، چھوڑنا، کھانا پکانا اور بازاروں کے چکر بھی ساتھ تھے۔ مصروفیت نے چکرا کر رکھ دیا۔ جس دن بچہ گھر آیا، تھکا ہارا خاندان سرِ شام بستروں میں گھس گیا اور چند منٹوں میں نیند کی آغوش میں جا پہنچا۔

دیارِ غیر کی عید

مسلسل بجتے فون کی گھنٹی نے نیند سے بیدار کیا۔ بڑی مشکل سے ہیلو کی آواز نکلی۔ ادھر سے آواز آئی ''عید مبارک۔''

ادھر سے بھی ''عید مبارک'' کہا گیا لیکن نیند اور حیرت میں ڈوبا ہوا، پوچھا ''کون سی عید؟''

''بھئی آج عید قربان تھی، آپ کو نہیں پتا؟''

ہمیں بالکل پتا نہیں چلا۔ بیٹا بیمار تھا اسی کے چکر میں رہے۔ بات سچی تھی، بہانہ نہ تھا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی، ساڑھے دس بجے تھے۔ سوئے ہوئے گھنٹہ بھر ہی ہوا ہو گا۔ ان حضرت کا شکریہ ادا کیا اور حال احوال پوچھ کر فون بند کر دیا۔ طبیعت مقدر سی ہو گئی۔

حد ہو گئی، ہمارا اتنا بڑا تہوار گزر گیا اور پتا ہی نہیں چلا۔ یہاں عیدیں اس طرح ہوتی ہیں! نہ بکرے بھیڑیں آئیں، نہ گلیوں میں ڈھیر پڑے، نہ کوئی بحث ہوئی نہ مباحثہ۔ کیا ہماری عیدیں اس طرح دبے پاؤں گزریں گی؟ چلو ہم تو بچے کی بیماری میں گم تھے، باقی لوگوں کو کیا ہوا؟ دیارِ غیر کی عیدیں اس طرح ہوتی ہیں؟ یا یہ غیر اسلامی ملک میں رہنے کا شاخسانہ ہے۔ اپنے کھو جانے کا خوف ہوا۔ اپنی پہچان مٹ جانے کا ڈر لگا۔ پھر سوال اٹھا، ہم ہیں کون؟ اس زمین میں ہمارا کیا مقام ہے؟ کیا انفرادیت اور پہچان ہے؟

ابھی تک زندگی پر تنقیدی نگاہ ہم نے ڈالی ہی نہ تھی۔ اب خیال آیا، یہ عیدیں ہم کیوں مناتے ہیں؟ عقیدے اور آئین کا ہماری زندگی سے کیا تعلق ہے؟ کیا یہ صرف ہماری تہذیب و ثقافت ہے اور بس؟ تو پھر یہ دل کیوں ڈوب رہا ہے؟ شعور کس چیز کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟ اس طرح کے بے شمار فلسفیانہ خیالات دماغ میں آ رہے تھے۔ ابھی تک خیال تھا کہ ایسی باتیں افسانوی کرداروں کے لیے گھڑی جاتی ہیں، زندہ انسانوں کا ان سے کیا تعلق؟ اب یہ بھیانک حقیقت ہماری نیندیں اڑانے کو ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ فیصلہ کل پر ٹال کر ہم پھر بستر پر دراز ہو گئے۔ عید تو گزر ہی چکی تھی!

ہفتے بعد پاکستان سے خط آیا: ''ارے بھئی آپ نے تو عید پر کارڈ تک نہ ڈالا، ہمیں بالکل ہی بھلا دیا۔ لندن کے عیش میں گم ہی ہو گئیں، ایسی بھی کیا بے اعتنائی؟ امید ہے عید اچھی گزری ہو گی۔ ہم نے تو آپ کے بغیر تنہا تنہا، بور سی عید گزاری۔''

انھیں کیا معلوم لندن میں ایک خاندان کے نو افراد، مع ڈیڑھ سو رشتے داروں اور بارہ کروڑ مسلمانوں کے عید قربان تنہا گزار رہے تھے۔ اس پر لطف آپ بیتی کا اگلا حصہ شمارہ فروری میں ملاحظہ فرمائیے۔

ذہن میں مچلتا اہم سوال

مچھلی کون سی بہتر ہے؟

غذا سے وابستہ معاشرے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کی حقیقت افشا ہو گئی

ڈاکٹر سلطان محمود

ہمارے معاشرے میں ادھورے سچ کی بہت اہمیت ہو چکی۔ نیز ہم خود کو تکلیف سے نہیں گزارتے کہ پورا سچ معلوم کر سکیں۔ مثال کے طور پر جونہی امریکی و یورپی میڈیا نے مچھلی کے فوائد بتانا شروع کیے، ہم نے بھی دکانوں کا رخ کر لیا۔ دل کے مریضوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ مچھلی دل کے لیے بہترین غذا ہے۔ اب بھلا کون اپنے دماغ کو غلطاں کرتا پھرے کہ سائنس دانوں نے جس مچھلی کی تعریف کی ہے کیا یہ وہی ہے؟ اور جس طریقے سے پکانے کا کہا ہے، کیا یہ اسی طرح پکائی گئی؟

مچھلی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اومیگا ۳ کا ذکر

ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس طرز کی چکنائی دل کی شریانوں میں لوتھڑے نہیں بننے دیتی اور خون پتلا رکھتی ہے۔ پہلے سے بنے لوتھڑے یا تھکے نرم کر کے توڑ دیتی ہے۔ ہر مہینے محض دو بار مچھلی کھانے سے اچانک ہارٹ فیل ہونے کے امکانات ۵۰ فیصد کم ہو جاتے ہیں۔ دل کے علاوہ اومیگا تھری دماغ، آنکھوں، جلد اور معدے و آنتوں کے لیے بھی نعمت ہے۔ یہ چکنائی خون میں کولیسٹرول کم کرتی، ذیابیطس قسم ۲ کو روکتی اور زندگی کا صحت مند دورانیہ لمبا کرتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام باتیں درست ہیں۔ لیکن کبھی آپ نے غور کیا، ذکر تو مچھلی کا ہو رہا ہوتا ہے مگر ترغیب اومیگا تھری ۵۰۰ ملی گرام روزانہ لینے کی دی جا رہی ہے؟ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ چکنائی صرف سالمن، کاڈ، سارڈین جیسی سمندری مچھلیوں کی چربی میں ملتی ہے۔ اب جونہی ہم ان خصوصی مچھلیوں کی طرف نگاہ دوڑائیں تو پتا چلتا ہے، یہ تو پاکستان میں دستیاب ہی نہیں۔ اب کیا کریں؟ پس وہی کریں جو مغربی ملٹی نیشنل کمپنیاں چاہتی ہیں یعنی کہ ان کے بنائے مہنگے فوڈ سپلی منٹ استعمال کریں جن میں مندرجہ بالا مچھلیوں کا تیل بھرا ہے۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ صحت کی خوبصورت داستان کا انجام دکانداری پر ہوتا ہے۔

اور ہم ہیں کہ بازار میں گھٹیا ترین گھی یا استعمال شدہ تیل میں تلی گئی نہ تو سمندری نہ دریائی بلکہ صرف فارمی مچھلیاں کھا کر جیب ہلکی کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں اومیگا ۳ چکنائی حاصل ہوگئی۔

قارئین کرام ذہن میں رکھیے، جتنے گہرے سمندر کی مچھلی ہو، اتنی ہی اس میں چربی زیادہ ملے گی۔ یہی چربی اومیگا تھری کی حامل ہے۔ سمندر کی بالائی اور درمیانی سطح میں پائی جانے والی مچھلیوں میں چربی کم ہوتی ہے۔ لہٰذا اومیگا تھری بھی کم! نیز ان میں پارہ (مرکری) اور سیسہ (لیڈ) بھی زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا بیماریاں بھی زیادہ۔ اگر سمندری مچھلی نہیں مل رہی، تو دریائی ہی سہی، یہ سب سے بہترین ہے۔ تازہ پانی کے باعث اس میں آلائش بھی کم ہوتی ہے اور غذائیت سمندری مچھلی جیسی۔ صرف اومیگا تھری نہیں ہوتا مگر باقی خوبیاں موجود ہیں مثلاً اعلیٰ درجہ کی پروٹین! معیار کے لحاظ سے سب سے کم تر فارمی مچھلی ہے۔

کیا اچار مفید ہے؟

برصغیر پاک و ہند کے علاوہ دنیا بھر میں صدیوں سے اچار دسترخوان کی زینت بن رہا ہے۔ اچار بنانے کے کئی طریقوں میں زیادہ مستعمل تیل میں کچی سبزیوں کا ڈالنا، پانی میں مسالہ جات ملا کر سبزیاں و پھل ملانا یا سرکہ کے اندر پھول گوبھی، پیاز یا لہسن وغیرہ کا اچار بنانا وغیرہ شامل ہیں۔ تینوں طرح کے اچار میں ہم جو بھی سبزی و پھل، ڈالیں، ان کے غذائی اجزا کسی حد تک ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس کا انحصار تین باتوں پر ہوتا ہے: اول اچار ڈالنے کے لیے کس طرح کا مائع (تیل، پانی، سرکہ) استعمال کیا گیا۔ دوم اس میں سبزیاں وغیرہ کتنے عرصے تک ڈوبی رہیں اور سوم اچار میں کھٹاس ڈالی گئی یا مٹھاس؟

جہاں تک مائعات کی قسم کا تعلق ہے، تو پانی میں سبزیوں اور پھلوں کے وٹامن سی اور بی اس میں گھل جاتے ہیں۔ تیل میں سبزیوں سے وٹامن اے، ڈی، ای اور کے نکل کر اس میں جذب ہوتے ہیں۔ سرکے میں موجود تیزاب سبزیوں اور پھلوں میں موجود پروٹین اور معدنیات کی توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ لہٰذا اچار کی مدت

جتنی زیادہ ہو، تمام غذائی اجزا کا نقصان بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

بالفاظ دیگر کچی سبزیوں اور پھلوں میں وٹامن، معدنیات اور لحمیات کی مقدار کسی صورت اچار میں برقرار نہیں رہ سکتی۔ مندرجہ بالا غذائی اجزا کے علاوہ حرارے (توانائی) بھی خاصی مقدار میں ضائع ہوتے ہیں۔ پس ہم اچار کی شکل میں جو کچھ کھا رہے ہیں، وہ صرف ذائقہ دیتا ہے غذائیت نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مسالہ جات کے زائد استعمال سے بلڈ پریشر زیادہ ہو جائے۔ یا پھر میٹھے اچار (مثلاً پھلوں وغیرہ) سے ذیابیطس چمٹنے کا خطرہ رہتا ہے۔

اچار کا ایک فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس میں پھل و سبزیاں چھلکوں سمیت ڈالی جاتی ہیں۔ لہٰذا معدنیات و وٹامن کا خزانہ عموماً کچی سبزیوں سے زیادہ ہوتا ہے بشرطیکہ اچار زیادہ پرانا نہ ہو۔ چونکہ سبزیوں، پھلوں پر سیرے کا اثر بھی چھلکے پر زیادہ ہوتا ہے لہٰذا اچار کے مانعات وقت کے ساتھ ساتھ اس کا اثر زائل کر دیتے ہیں۔ ذہن میں رکھیے کہ مربے اور چٹنیاں وغیرہ بھی اچار ہی کا حصہ ہیں۔

کیا مٹی کی ہنڈیا پریشر ککر سے بہتر ہے؟

غذا کے اندر غذائیت (Nutrition) بشکل پروٹین، چکنائی، نشاستہ، وٹامن، معدنیات اور پانی موجود ہوتی ہے۔ کھانا پکانے کے دوران یہ غذائیت ضائع ہونے کا انحصار چھے عوامل پر ہے: بلند درجہ حرارت، طویل عرصے تک حرارت دینا، روشنی، ہوا، پانی میں بھگونا اور کھیت یا میں پکنے کے دوران کا وقفہ۔ بعض غذاؤں پر سارے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔

پریشر ککر استعمال کرنے کا مقصد وقت بچانا ہے۔ اس لیے بلند درجہ حرارت میں کھانا پکایا جاتا ہے۔ مٹی کی ہنڈیا کے پیچھے مقصد کھانے کا ذائقہ بہتر بنانا ہے۔ لہٰذا کم درجہ حرارت پر دیر تک کھانا پکایا جاتا ہے۔ لیکن سوال اگر غذائیت بچانا ہے، تو دونوں طریقے غلط ہیں کیونکہ تیز درجہ حرارت اور براہ راست غذا کا پریشر ککر کی دھاتی دیوار سے اتصال غذائی اجزا کی تباہی کا باعث بنتا ہے جن میں پروٹین خصوصاً لائسین (Lysine) شامل ہے۔ کم درجہ حرارت مگر مسلسل ملنے سے بھی غذائی اجزا کا اسی طرح نقصان ہوتا ہے جیسا پریشر ککر میں۔ ہاں ہنڈیا سے ذائقے میں انفرادیت ملتی ہے جو پریشر ککر سے ملنی ذرا مشکل ہے۔

قارئین کو شاید عجیب لگے مگر حقیقت یہ ہے، اگر مٹر کو ڈیڑھ گھنٹے تک ۶۲ ڈگری سینٹی گریڈ تک پکایا جائے، تو ۲۰ فیصد لائسین ضائع ہوتی ہے۔ مگر اسی درجہ حرارت پر ڈھائی گھنٹے پکانے سے چالیس فیصد ضائع ہو جاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے، لائسین جیسے امائنو ایسڈ اور دیگر وٹامن طویل عرصہ کم درجہ حرارت پر پکانے سے تقریباً تمام ضائع ہو سکتے ہیں۔

ہنڈیا پر آہستہ کھانا پکنے کا تب ہی فائدہ ہے کہ اس پر ڈھکن رکھا جائے۔ دراصل کئی غذائی اجزا کم درجہ حرارت پر غذا سے جدا تو ہو جاتے ہیں مگر ڈھکن موجود ہونے کے باعث شوربے (یا پانی) میں ہی موجود رہتے ہیں۔ پس غذائیت کے حوالے سے دیکھا جائے، تو ہنڈیا اور ککر میں خاص فرق نہیں۔ ہاں ذائقے کے لحاظ سے ہنڈیا قدرے بہتر ہے۔ لیکن صرف ان لوگوں کے لیے جو ہنڈیا کے ذائقے سے واقف ہوں!

روشنیوں کے جلو میں بلند ہوتی

اندھیرے کی لکیر

ایک لالچی و خود غرض نوجوان کی کتھا، اس نے دنیا پانے کے لیے کسی کا معصوم دل توڑ دیا

سلمان جمیل نعیم

میں اجازت لینے آگے بڑھا، تو اس نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے ایک لفظ کہنے کا موقع دیے بغیر اپنے قریب روکا اور دوسرے مہمانوں سے مصافحے کرنے میں مصروف ہو گیا۔

میری زندگی میں اتنی مکمل اور ایسی حسین شام پہلی مرتبہ آئی تھی۔ حسن اور زندگی، رنگ اور نور، نغمہ اور آہنگ، ان سب کا امتزاج تھی وہ شام! گلرنگ و گلبہار چہرے، دلوں کو شادابی اور تازگی جس سے میسر ہو وہ تبسم، وہ شام کیا تھی یوں سمجھیے کہ ایک مرصع غزل تھی۔ ایک جلتی دوپہر کی شام ایسی تابندگی اور صباحت کی ردا اوڑھ دینے کا سہرا میرے دوست کے سر تھا۔

لوگ ایک ایک کر کے جاتے رہے۔ رنگ بکھرتے گئے، مسکراہٹیں کم ہوتی گئیں۔ رات کے سائے پھیلتے گئے۔ روشنی مدھم ہوتی رہی۔ سکوت ترنم پر حاوی ہوتا رہا۔ میں گھبرا گیا۔ میں اس خوبصورت شام کا ایسا انجام دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اپنے دوست سے کہا ''میرے پاس وہ لفظ نہیں جن سے میں تمھارا شکریہ ادا کر سکوں۔ تم نے میرے تصور کی ایک جیتی جاگتی تصویر مجھے دکھا دی۔ میں صرف دعا ہی کر سکتا ہوں کہ تم ترقی کی اور منزلیں طے کرو تاکہ میں کچھ اور ان دیکھی حقیقتوں سے آشنا

ہوسکوں......اور......"

مگر میرے دوست نے مجھے آگے کچھ کہنے سے روک دیا، بولا "لفظوں سے نہ کھیلو۔ تم دوسرے لوگوں سے مختلف ہو۔ میرے درد کو سمجھو۔" اس نے جس طرح یہ جملہ ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا، میں اس سے متاثر ہونے کے بجائے ہنس دیا۔

"ہنسو مت، میں تمھیں ابھی اپنی کہانی سناؤں گا، تو پھر تم مسکرا بھی نہ سکو گے۔"

اس شام کی گدگداہٹ سے ابھی تک میرے ہونٹوں پر تبسم کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں فی الحال کوئی ایسی بات نہیں سننا چاہتا تھا جسے سن کر مسکرا بھی نہ سکوں۔ چناں چہ دوست کے اس جملے کو بھی تمسخر کے انداز میں اڑا دیا۔ کہا "تم ایک بینک منیجر ہو۔ اگر کوئی فراڈ وغیرہ ہو گیا ہے تو خود ہی ایک جاسوسی ناول لکھ ڈالو، تمھارے اکاؤنٹ میں چند ہزار روپے کا اضافہ ہو جائے گا۔"

اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ آخری مہمان کو بھی رخصت کرنے کے بعد وہ مجھے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بیٹھ گیا اور بولا "تم شہلا کو جانتے ہو؟"

"شہلا۔"

"ہاں۔ وہی جو......"

"سمجھ گیا۔ اچھی طرح جانتا ہوں۔ سیٹھ فاروق علی کی بیٹی جو کالج میں اپنی جہازی سائز بڑی کار سے آیا کرتی تھی۔ اس سے تمھارا کیا تعلق؟ رومانس بھی چل رہا تھا۔"

"ہاں وہی۔"

"کیا ہوا اس کو؟"

"اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی مگر بچ گئی۔"

"بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ ہر نیا فیشن اپنانے والی...... خودکشی بھی تو آج کل فیشن میں داخل ہو گئی ہے نا۔"

"بکواس نہ کرو۔" وہ نہایت سنجیدہ تھا۔

"آخر اس نے یہ کوشش کیوں کی؟"

"اس کا ذمے دار میں ہوں۔"

"آں......" حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا "ہاں میں۔"

میں سنبھل کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ چند لمحے اسے تکتا رہا، پھر اس سے مخاطب ہوا۔ "ہاں بینک منیجر صاحب۔ اب آپ اپنی کہانی سنا دیجیے۔"

"مجھ پر طنز نہ کرو۔" اس نے بہت ہی گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس ملازمت کی خاطر میں نے اپنی زندگی کی بھرپور مسرتیں اور دائمی خوشیاں ترک کی ہیں۔"

"یوں کہو کہ خوشیوں کو تم نے اپنی زندگی کے لیجر میں سے ڈیبٹ کر دیا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اگر تم اسی قسم کی فضول گفتگو کرنے کے موڈ میں ہو تو جہنم میں جاؤ۔ میں کچھ نہیں سناتا۔"

اس کو یوں ناراض کر دینے سے مجھے کچھ خوشی سی ہوئی۔ لیکن میں شہلا کی خودکشی کا پس منظر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس کو منایا اور کہانی سننے پر رضامند کر لیا۔

وہ بولنے لگا "تم جانتے ہو کہ میں نے تنگ مزاج اور زود حس ہونے کے باعث والد کی ذرا سی سرزنش پر ایم اے کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ پھر ملازمت ڈھونڈتا رہا۔ آخر مجھے بینک میں ملازمت مل گئی۔ شروع میں تو بینک والوں نے مجھے چھوٹے قصبوں میں بھیجا جہاں ان کی شاخیں تھیں۔ ان چھوٹی جگہوں میں نہ تو شہر کی سہولتیں تھیں اور نہ دیہات کی سی خوبیاں۔ دو چار ہزار کی آبادی میں مطلب کے آدمی تلاش کرنے کے باوجود نہ

ملتے۔ چھوٹے چھوٹے دکانداروں کے ساتھ واسطہ پڑتا۔"

"تم شہلا کی خودکشی سے متعلق بتاؤ۔"

اس نے مجھے جھڑک دیا۔ "خاموشی کے ساتھ جو کچھ میں کہتا ہوں، سنتے رہو۔"

میں چپ ہو گیا۔ وہ کہنے لگا "صبح سے شام تک میں بینک میں رہتا۔ شام کو تفریح کے لیے جانے کے بجائے تنگ بازاروں میں گھومتا۔ دکانداروں سے ملتا اور انھیں بینکاری کے متعلق بتاتا۔ رات کو کچھ دیر کتاب کے اوراق پر نظریں گھمانے کے بعد سو جاتا۔ اتوار کو قریب کے دیہات میں جاتا، وہاں کے زمینداروں سے ملتا اور زمین میں گڑی دولت بینک میں جمع کرنے کا مشورہ دیتا۔ یہ تمام تبدیلیاں مجھ میں بڑے غیر محسوس طریقے سے پیدا ہوتی رہیں۔

"شروع میں تو میں چھوٹے قصبوں میں جانے کے خیال سے بدکتا تھا۔ تبادلے کے لیے کوششیں کرتا مگر پھر کسی جہاں دیدہ باس کے سمجھانے سے مان بھی جاتا۔ اس ملازمت نے مجھ سے میرا پندار، میری خودسری اور انا چھین لی اور اس طرح کہ مجھے محسوس بھی نہیں ہوا۔ میں چھوٹے چھوٹے دکانداروں سے باتیں، اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے ان کی خوشامد کرنے اور چاپلوسی برتنے میں کوئی عار، شرم اور کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتا۔ بس ایک دھن تھی، لگن تھی کہ میں جہاں جاؤں، میرا بینک کامیاب رہے۔ لوگوں کو بینک کی افادیت معلوم ہو سکے۔

"رفتہ رفتہ مجھے اپنی ہر چھوٹی بڑی کامیابی پر یہ محسوس ہونے لگا جیسے بینک کی ملازمت ہی میرا نصب العین تھی۔ جیسے میں پیدا ہی اس کے لیے ہوا تھا۔ پانچ چھے برس تک میں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی جگہوں پر رہا۔ اس کے بعد مجھے اپنے شہر میں تبدیل کر دیا گیا۔"

جب وہ کہتے کہتے ذرا رکا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ "ان باتوں کا تعلق شہلا کی خودکشی سے کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تفصیل میں تمھیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم جب کہانی لکھنے بیٹھو تو نفسیاتی نقطۂ نظر سے کوئی بات سمجھنے میں الجھن سے دو چار نہ ہو۔ ہاں تو میرا تبادلہ اپنے شہر میں ہو گیا۔ اب بینک کی طرف سے مجھے یہاں زیادہ سہولتیں بلکہ آسائشیں میسر ہوئیں۔ میں بینک کا ڈیپازٹ بڑھانے کی طرف تن من سے لگ گیا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ سیٹھ فرقان علی ایک نئی مل قائم کر رہے ہیں، تو بہ حیثیت بینکر ان سے ملا۔ وہیں شہلا سے عرصے بعد ملاقات ہوئی۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی، وہی لیلیٰ شب کو شکست دیتے ہوئے گیسو، ستاروں کی سی چمک لیے ہوئے آنکھیں اور پیشانی پر اترا ہوا چاند۔ میں طویل عرصے بعد ملا تھا۔ بہت کچھ بدل گیا تھا مگر وہ وہی تھی اور اسے یاد بھی سب کچھ تھا۔ میں جب اس سے ملا تو میں نے بڑے اجنبی انداز میں اس سے پوچھا:

"آپ..... آپ یہاں کب سے آئی ہوئی ہیں؟"

اس نے پرانے انداز میں سر جھٹک کر بالوں کو ایک طرف کیا۔ اسی دلفریب اور من موہ لینے والے طریقے سے ہونٹوں کے گوشوں میں مسکراہٹ اور اپنائیت سے بھرپور لہجے میں کہا "تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے۔ آج ملے ہو تو غیروں کی طرح مخاطب ہو رہے ہو۔"

میں نے جو جواب دیا، اس سے میں خود بھی مطمئن

> کبھی خیال آتا کہ میں بھی کتنا مادہ پرست اور انسانی عظمتوں سے کتنا منحرف ہو گیا ہوں۔ ہر بات کو دولت کے پیمانے پر ناپ رہا ہوں۔

نہیں تھا' مگر شہلا مجھ سے مل کر بہت خوش ہوگئی۔ اس نے بیتے دنوں کی راکھ کرید کر پرانی یادوں کے انگاروں کو اپنے التفات سے ہوا دی۔ پھر یوں سمجھ لو ان انگاروں میں میری شخصیت کا وہ خول جل گیا جو میں نے پانچ چھے سال کے عرصے میں اپنی ذات پر منڈھ لیا تھا۔ اب میں وہاں جاتا تو صرف شہلا سے ملنے کے لیے! فون کرتا تو صرف شہلا کو! سارا دن سوچتا اور میری سوچ کا محور ہوتی تھی شہلا۔ میں راتوں کو عجیب سے سہانے سہانے خواب دیکھتا اور ان خوابوں کا مرکز ہوتی تھی شہلا۔

محبت کی یہ دھوپ اتنی پھیلی کہ مجھے اپنے فرائض کا سایہ تو درکنار خود اپنا نظر آنا مشکل ہوگیا۔ شہلا...... شہلا...... ہر وقت...... ہر لمحہ اس کا خیال رہتا۔ اس کی آواز کا جادو مجھ پر چھایا رہتا۔ آخر ایک دن میں نے طے کر لیا کہ اب شادی کر لینی چاہیے۔ شہلا نے مجھے مشورہ دیا ''تم ڈیڈی سے بات کرلو۔''

میں سیٹھ فرقان علی سے ملا۔ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ میں نے دبے لفظوں میں اپنی تمنا کا اظہار کیا۔ بولے ''تم کرتے کیا ہو؟''

''جی بینک منیجر ہوں۔''

''کون سے بینک میں؟''

میں نے بینک کا نام بتا دیا

پھر پوچھا ''کیا تنخواہ ہے؟''

''جی پچاس ہزار روپے۔''

''گاڑی تمھاری ہے؟''

''جی نہیں، بینک کی ہے۔''

''رہتے کہاں ہو؟''

میں نے علاقے کا نام بتا دیا۔

پھر کہنے لگے ''بنگلہ تمھارا ہے؟''

''جی نہیں، بینک نے کرائے پر لے کے دیا ہے۔''

انھوں نے پھر بہت ہی شفقت آمیز انداز میں پوچھا، ''تمھارا بینک بیلنس کتنا ہے؟''

میں نے شرمندگی سے گردن جھکا لی۔ انھوں نے آہستہ سے یوں ''ہوں'' کہا جیسے سب کچھ سمجھ گئے ہوں اور پھر مجھ سے کہا۔ ''میں اس معاملے میں شہلا سے بات کیے بغیر تمھیں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔''

پہلے میں نے سوچا کہ انھیں اس حقیقت سے بھی روشناس کرا دوں کہ شہلا ہی کے ایما سے میں یہاں آیا ہوں۔ ہم دونوں میں وہی رشتہ ہے جو پھول اور ڈالی، دریا اور کنارے، بادل اور ہوا میں ہوتا ہے۔ ہم دونوں آپس میں دلوں، دماغوں، آنکھوں اور زبان کا تبادلہ کر چکے۔ جو کچھ انھیں شہلا سے معلوم کرنا ہے وہ مجھ سے پوچھ لیں۔ جو کچھ وہ میرے متعلق جاننا چاہتے ہیں شہلا سے دریافت کریں۔ مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اچھا ہے، سیٹھ صاحب یوں بھی اپنا اطمینان کرلیں۔ دوسرے دن شہلا نے مجھے فون کیا اور فوراً ملنے کو کہا۔ جب میں اس سے ملا' تو اس نے کہا:

''میں رات بھر ڈیڈی سے الجھتی رہی ہوں۔''

''کیوں؟''

''وہ اس شادی کے مخالف ہیں۔ کہتے ہیں کہ تمھارے پاس نہ اپنا بنگلہ ہے نہ موٹر اور نہ دولت۔''

''وہ سچ کہتے ہیں۔''

''مگر تمھارے پاس وہ سب کچھ ہے جو میں چاہتی ہوں۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اگر انھوں نے اپنی ضد کو میری راہ کی رکاوٹ بنایا' تو میں خودکشی کرلوں گی......''

''بے وقوف نہ بنو۔ جذبات سب کچھ نہیں ہوتے۔

زندگی بڑی شے ہے۔ تمھارے ڈیڈی نے اس دنیا کے بہت سارے رنگ دیکھے ہیں۔ انھیں جو رنگ پسند ہے اسی میں وہ تمہیں بھی رنگا دیکھنا چاہتے ہیں اور......"

شہلا نے میری بات کاٹی اور کہا "تم مجھے نصیحتیں مت کرو۔ ڈیڈی کو زندگی کا جو رنگ پسند ہے، ضروری نہیں کہ وہ میری آنکھیں بھی قبول کر لیں۔"

اور پھر میں اور شہلا تمام دن دنیا، رنگوں، آنکھوں اور دلوں کی باتیں کرتے رہے۔ مگر وہ شام ایک مفلس عاشق کی طرح بڑی اداس تھی۔ اس شام کی اداسی ہمارے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اس کی اداس فضا کا سانس لیتا ایک حصہ بن گئے۔ شہلا نے تجویز پیش کی۔ "کیوں نہ ہم کورٹ میرج کر لیں۔"

شہلا سے یہ سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اب تک خود کو فریب دیتا رہا ہوں۔ یہ احساس اس لیے پیدا ہوا کہ جب کورٹ میرج کی بات سنی تو میں نے شہلا کے اندازِ فکر سے الگ ہٹ کر سوچا اور بہت سارے گوشوں کی طرف دیکھا۔

مگر شہلا کے دماغ میں تو جذبات کا چاند جگمگا رہا تھا۔ وہ تمام رکاوٹیں، سارے رشتے اور بندھن توڑ کر میری بن جانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا، دلاسہ دیا، اپنی محبت کا یقین دلایا مگر وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا "تم گھبراتے کیوں ہو؟"

"سنو شہلا! میں گھبراتا نہیں بلکہ یہ سوچتا ہوں کہ اگر ہم نے وقت اور حالات کی مخالفت کر کے اپنی من مانی کر ڈالی تو کہیں یہ ہمارے مخالف نہ ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو حالات ہمیں روند ڈالیں گے اور وقت ہمیں گرد کے مانند اڑا دے گا۔" لیکن وہ بضد تھی۔ پھر میں نے کہا "جیسی ضد تم مجھ سے کر رہی ہو، اسی طرح اپنی بات ڈیڈی سے کیوں نہیں منوا لیتیں؟"

یوں میں نے شہلا کے دل و دماغ میں اٹھنے والے طوفان کا رخ پلٹ دیا۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ وہ اپنی ضد کو ایسی آندھی بنا دے جس کے سامنے اس کے ڈیڈی کی ہٹ دھرمی کا دیا گل ہو جائے۔ پھر ہم دونوں جو زندگی گزاریں گے اس پر پریشانیوں اور پشیمانیوں کا سایہ تک نہیں ہوگا۔ شہلا میری بات مان گئی۔

اس رات اپنے دل میں عجیب سے وسوسے لیے، دماغ میں طرح طرح کے خیالات بسائے دیر تک زرد چاندنی اور ستاروں کی مریض روشنی میں جاگتا رہا۔ زندگی کے وہ لمحے میری نظروں کے سامنے آتے رہے جو میرے لیے ان دیکھے تھے۔ کبھی میں سوچتا، شہلا میرے لیے نہیں اپنے اسی کزن کے لیے موزوں ہے جس کا باپ کروڑوں روپے کی جائداد چھوڑ گیا ہے۔

کبھی خیال آتا کہ میں بھی کتنا مادہ پرست اور انسانی عظمتوں سے کتنا منحرف ہو گیا ہوں۔ ہر بات کو دولت کے پیمانے پر ناپ رہا ہوں۔ دلوں اور محبتوں کی قیمت میری نظر میں اپنی وقعت کیوں کھو چکی؟ محبت، انسان اور دل اس وقت بھی تھے جب دولت نہیں تھی۔ دل محبت اور انسان اس وقت تک رہیں گے جب دولت نہیں ہوگی پھر میں یہ کیسی کشمکش میں مبتلا ہوں؟ ذرا سی رکاوٹوں، اندیشوں اور پریشانیوں کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہوں کیوں؟

سوالوں کے بھنور تھے...... اور میرا دل تھا۔
اندیشوں کی پرتابی تھی...... اور میرا دماغ تھا۔
وسوسوں کی دلدل تھی...... اور میرا وجود تھا۔

صبح ہوئی مگر رات کو آسیب میرے وجود کو جھنجوڑ گیا۔ میں بڑے بوجھل قدموں سے ٹیلی فون کے قریب آیا۔ جب میں نے فون کیا تو معلوم ہوا شہلا نے اپنے آپ کو زخمی کر لیا ہے۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور اسی عالم میں اسے

آپ کے تعاون نے بدلی ہے ان کی زندگیاں

عبدالرشید

ربیعہ حمید

صائمہ گلزار

محمد بلال

فہد مسعود

دلشاد رشید

Meezan Bank	میزان بنک سمن آباد، لاہور پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0240 0100882859
BOP	بنک آف پنجاب سمن آباد، لاہور پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0110 002 000424 0003
THE BANK OF PUNJAB	بنک آف پنجاب شاہراہ فیصل کراچی پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0247 002 000827 0003

لاہور 19/21 بیکڑ اسکیم، ایوانِ اردو ڈائجسٹ سمن آباد، لاہور فون: 042-37522741-42 فیکس: 042-37552576

آفس موبائل: 0321-8461122, 0333-8461122, 0345-8461122 ای میل: info@kif.com.pk

کراچی آفس: 3/1 جی، بلاک 6، پی ای سی ایچ ایس، کراچی فون: 021-34382303 فیکس: 021-34532420 موبائل: 0300-9280487

اسلام آباد آفس: کمرہ نمبر 5، فرسٹ فلور مسرت آرکیڈ G-11 مرکز، اسلام آباد فون: 051-2220933 موبائل: 0300-8187044, 0321-5587250

USA Address: 'Karwan-e-ilm Foundation' 19-West 34th Street 1024, New York, NY 1001.
Ph: (212) 268-3500/3501, Fax: (212) 268-3502

روح افزا
گرم دودھ میں
پھر کیسی سردی کیسا جاڑا...
Roohafzapk
Brands Award
Blitz

لاہور بھیج دیا گیا۔ میں نے ٹیلی فون رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بجی۔ میں نے چونکا اٹھایا' تو سیٹھ فرقان علی کی آواز آئی ''کیا تم ابھی آسکتے ہو؟''

ان کے پاس پہنچا' تو وہ بڑے مصروف تھے۔ ایک نئی اور بڑی مل کا منصوبہ اپنے آخری مرحلے سے گزر رہا تھا۔ انھوں نے مجھے کہا ''میں ذرا کام سے فارغ ہولوں پھر تم سے بات کرتا ہوں۔''

وہ خاصی دیر مشغول رہے۔ میں کرسی پر پہلو بدلتا رہا۔ پھر انھوں نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا' تو حکم دیا ''اکاؤنٹنٹ کو بلاؤ۔''

اکاؤنٹنٹ آیا' تو سیٹھ صاحب نے پوچھا'' آپ نے روپیہ ٹرانسفر کرا لیا۔''

''جی ابھی تک تو بینک میں اکاؤنٹ ہی نہیں کھلا۔''

''تو یہ کام آج بلکہ ابھی کر ڈالیے اور پھر لاہور فون کیجیے۔ فی الحال کتنے روپوں کی ضرورت ہوگی؟''

''جی ضرورت تو مسلسل ہی پڑتی رہے گی۔ پچاس پچاس لاکھ کر کے منگا لیں گے۔''

سیٹھ جی نے جھنجھلا کر کہا ''نہیں نہیں، سب روپیہ ایک ساتھ منگا لیجیے اور جتنی بھی ضرورت ہو......''

میں یہ باتیں سن کر ایسے چونکا جیسے اب تک خواب کی دنیا میں تھا۔ میں نے کرسی پر پہلو بدلا، ٹائی کی گرہ درست کی اور بولا ''معاف کیجیے گا۔ میں کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں۔'' سیٹھ جی اور اکاؤنٹنٹ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا ''بینکاری سے متعلق آپ کے تمام کاموں کے لیے میں اپنی اور اپنے بینک کی خدمات پیش کر سکتا ہوں۔''

سیٹھ جی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اکاؤنٹنٹ سے کہا ''میں اس سلسلے میں آپ سے تھوڑی دیر بعد گفتگو کروں گا۔ ابھی ذرا ان سے بات کرلوں۔''

اکاؤنٹنٹ چلا گیا' تو سیٹھ صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''رات کو شہلا نے تمھارا ذکر کیا تھا۔ میں نے اس کو ایسی بہت سی باتیں سمجھائیں جو تمھیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں لڑکیوں کو زیادہ آزادی دینے کے خلاف ہوں۔ میں تمھارا یہاں سے کہیں اور تبادلہ بھی کرا سکتا ہوں' مگر فی الحال میں نے شہلا کو لاہور بھیج دیا ہے۔ ہاں! تو تم کیا کہہ رہے تھے؟''

میں نے ذرا سنبھل کر کہا ''میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر آپ اپنی مل کا اکاؤنٹ ہمیں دے دیں' تو......''

سیٹھ جی نے بھاؤ چکانے کے انداز میں کہا ''وہ تو ٹھیک ہے مگر شہلا کا کیا ہوگا؟ کیا تم اس کو یہ لکھ کر بھیج سکتے ہو کہ تم نے اس سے جو وعدہ کیا ہے، اسے پورا کرنے کی اب ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اگر تم ایسا کر سکو تو......تو ممکن ہے میرا تمام اکاؤنٹ تمھارے ہی بینک میں آجائے اور تمھیں ترقی کے امکانات نظر آئیں۔ ورنہ سوچ لو کہ میرا نام فرقان علی ہے اور میں شہلا کا باپ ہوں۔''

جتنی دیر میں سورج کی شعاعیں زمین کے رخسار کا بوسہ لیتی ہیں، اتنی دیر میں، میں نے فیصلہ کر لیا اور سیٹھ صاحب سے کہا'' مجھے منظور ہے۔''

اس کے بعد مجھ پہ کیا گزر گئی یہ تم لکھو گے۔ مجھے ابھی...... آج ہی معلوم ہوا ہے کہ شہلا نے میرا خط پڑھنے کے بعد دوبارہ خودکشی کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اپنی ترقی کی خوشی میں یہ جشن منایا۔ بتاؤ کیا تم نے اس گنگناتی فضا میں کوئی سسکی سنی؟ روشنیوں میں اندھیرے کی لکیر دیکھی......؟ بتاؤ...... خدا کے لیے کچھ تو کہو۔''

کاغذ اپنا سینہ کھولے قلم کی برچھی کھانے کو تیار ہے۔ اور میں بڑی دیر سے قلم ہاتھ میں لیے اس فکر میں ہوں کہ اس کہانی کو کیسے شروع کروں اور کہاں ختم؟ ◆◆◆

اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

✿ 560 روپے کی غیر معمولی بچت پائیے ✿ اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے

اُردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے

معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے

دِلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُر لطف بنایئے

قیمت فی پرچہ 100/- روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000 روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام ________________ فون نمبر ________________

پتا ________________ ای میل ________________

میں ماہ __________ 20 ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کروں گا۔

2۔ میں مطلوبہ رقم -/1000 روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔

3۔ میں نے -/1000 روپے اردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر 110-800380 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ اور اپنا ایڈریس ای میل کر رہا ہوں۔

4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔

5۔ ہمیں 0301-8431886 پر ایس ایم ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ ________________ دستخط ________________

اُردو ڈائجسٹ۔ سرکولیشن مینجر۔ سمن آباد۔ لاہور 54500۔ پاکستان: فون نمبر: 35290738-42-92+ 37589957-42-92+

ای میل: subscription@urdu-digest.com ویب سائٹ: urdudigest.pk فیکس: 35290731-42-92+

برف سے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر

اے ملکہ کوہسار مری!

وطن عزیز کے ان سیاحتی مقامات کی سیاحت جن کے فطری حسن کو برف چار چاند لگا دیتی ہے

پہاڑوں میں واقع پاکستان کا سب سے مشہور **پُرفضا** پہاڑی سیاحتی مقام مری، سطح سمندر سے سات ہزار پانچ سو ستر فٹ بلند ہے۔ کتاب ''پوٹھوہار'' کے مصنف عزیز ملک کے الفاظ میں ''۱۸۵۱ء میں گورے مری نارودرن کمانڈ کی برطانوی افواج کا گرمائی مستقر قرار پایا۔ مگر ابتدا میں یہ ٹھکانا تریت سے پیچھے اوپر سندکوٹ میں بنا تھا۔ سنتے ہیں، وہاں لوگوں نے انگریز فوجیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔''

سندکوٹ میں ان دنوں ایک سائیں صدقی رہتا تھا۔ کشمیر کا رہنے والا تھا۔ طبیعت کا جلالی مجذوب تھا۔ اس نے ایک انگریز افسر سے کہا ''صاحب بہادر! تم لوگ یہاں سے بوریا بستر باندھ کر یہیں اور ٹھکانہ کرو ورنہ انجام ٹھیک نہیں ہوگا۔''

اس بات کو مجذوب کی بڑ سمجھا گیا۔ چند ہی روز بعد کیمپ میں ہیضہ پھوٹ پڑا اور ساتھ ہی بے شمار سانپ بھی رینگنے لگے جن کے ڈسنے سے لاتعداد گورے موت کی آغوش میں چلے گئے۔ مرگِ انبوہ کے اس جشن میں عالمِ بالا سدھارنے والے انگریزوں کی ان گنت قبریں آج بھی سندکوٹ میں موجود ہیں۔

بالآخر انگریزوں کو وہاں سے کیمپ اٹھانا پڑا۔ اسی پہاڑ سے کچھ آگے جا کر انھوں نے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں

آج مری کی سبز پوش بستی آباد ہے۔ اس زمانے میں وہاں کا گھنیرا جنگل مسیاڑی والوں کی ملکیت تھا۔ انگریزوں نے ان سے ساٹھ روپے سالانہ پٹے پر چند کنال زمین خریدی، رفتہ رفتہ قدم جمائے اور پورے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ درخت کٹتے، بنگلے بنتے اور آبادی بڑھتی چلی گئی۔

ضلع راولپنڈی کے گزیٹیئر ۹۴۔۱۸۹۳ء کے مطابق جب دہلی میں جنگ آزادی لڑی گئی تو نواحی پہاڑیوں میں آباد ڈھونڈ قبائل مقامی لوگوں کی اعانت سے مری پر حملہ آور ہوئے۔ تاہم ان کے ارادوں کا قبل از وقت علم ہو جانے سے برطانوی حکمرانوں نے ان پر بآسانی قابو پا لیا۔ اسی واقعے کو عزیز ملک نے اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے لکھا:

''مری میں متعین یونٹوں میں شاید ہی کوئی دیسی سپاہی ہو، اس لیے وہاں حفاظتی انتظامات کی ضرورت نہ تھی...... مگر کوہسار مری کی زخم خوردہ سول آبادی نے ہتھیار اٹھا لیے۔ ۲ر ستمبر ۱۸۵۷ء کی رات مری کی سرسبز وادی آزادی کے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ کھنی طاق گاؤں کی ایک بڑھیا نے جس کا نام سنا تھا، کسی انگریز افسر کو بروقت خبر کر دی کہ ان پر حملہ ہونے والا ہے۔ اس لیے فوری طور پر کچھ انتظامات کر لیے گئے۔

ہزارہ کے قبیلہ کرال نے تین سو مجاہدوں کا دستہ مسلح کیا اور مری کی طرف آ گئے۔ دفتر خزانہ لوٹا اور کمشنر بہادر کے بنگلے کو آگ لگا دی۔ لیکن جونہی مال روڈ کی طرف آئے، گھات میں بیٹھے انگریز فوجیوں نے فائر کھول دیا۔ بہت سے مجاہد شہید ہوئے۔ ان کے قائد رحمت خان اور اس کے چند سرکردہ ساتھی گرفتار ہوئے اور ان پر مقدمہ چلا۔ پھر ایک صبح ان سب کو توپ دم کر دیا گیا۔''

۱۸۶۱ء میں مری میں پہلی سڑک بنی جو پنڈی پوائنٹ اور کشمیر پوائنٹ کو ملاتی تھی۔ یہ سڑک کچی تھی جس پر تانگے اور یکے چلا کرتے۔ یوں مری میں تعینات برطانوی فوجیوں اور ان کے اہل خاندان کو دوسری جگہ جانے میں سہولت حاصل ہو گئی۔

اس سڑک کی تعمیر کے دس سال بعد مری میں میونسپل کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اسی دور میں وہاں مختلف تعلیمی ادارے، سرکاری دفاتر اور چرچ قائم ہوئے۔ ڈاک خانہ، عدالتیں، تار گھر، تھانہ، بازار، الائنس بنک آف شملہ کی ایک شاخ...... یہ سب کچھ وہاں اولین برسوں ہی میں بن گیا۔

۹۴۔۱۸۹۳ء میں مری کی آبادی ایک ہزار سات سو اڑسٹھ نفوس پر مشتمل تھی۔ آج بھی اس کی مستقل آبادی بہت زیادہ نہیں تاہم موسم گرما شروع ہوتے ہی ملک بھر سے لوگوں کی آمد شروع ہو، تو بہت بڑھ جاتی ہے۔ موسم سرما میں پھر سکڑ کر بیس پچیس ہزار رہ جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ اس دوران مری کے رقبے میں قابل ذکر توسیع نہیں ہوئی بلکہ آبادی رہائشی علاقوں ہی میں گنجان ہوتی چلی گئی۔

مری آنے والے سیاحوں میں ملک کے تمام صوبوں اور علاقوں کی تہذیب و ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے۔ چناں چہ سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سبھی اپنے اپنے رنگ میں اس کافر ادا موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چودہ اگست کو مری کی رونقیں عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ اس روز مری کے تمام ہوٹل مکمل طور پر بُک ہوتے ہیں۔ کئی سیاح منہ مانگا کرایہ دینے کو تیار رہتے ہیں پھر بھی انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چناں چہ کئی لوگ یہ رات اپنی گاڑیوں میں سو کر گزارتے ہیں۔

اس روز مری جانے والے تمام راستوں پر ٹریفک کا بے ہنگم ہجوم ہوتا ہے۔ پارکنگ کے لیے جگہ نہیں ملتی اور

ریستوران اور جنرل اسٹور اشیائے ضرورت کی قیمتیں بہت بڑھا دیتے ہیں۔ تاہم سیاحوں کی تعداد میں کمی کے ساتھ نرخوں میں قدرے اعتدال آ جاتا ہے۔

برف باری ہوتے ہی مری کی زندگی میں پھر جولانی آتی ہے۔ قدرت کے اس انمول کرشمے سے لطف اندوز ہونے کے خواہشمند اواخر دسمبر یا جنوری کے شروع ہی میں مری ڈیرا ڈالتے ہیں۔ جوں ہی برف باری کا سلسلہ شروع ہو، وہ "میدان عمل" میں اتر آتے ہیں۔ برف کے ساتھ کھیلنا بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی دلچسپ تجربہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے مری کی سڑکوں پر ہر عمر کے مرد و زن ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینکتے نظر آتے ہیں۔

ربع صدی پہلے تک جاگیرداروں، خوانین اور بڑے بڑے صنعتکاروں اور سرمایہ داروں نے مری میں اپنے محل نما بنگلے بنا رکھے تھے۔ یہ لوگ گرمیوں کا موسم اہل خانہ کے ساتھ مری میں گزارتے۔ اب وسائل کی فراوانی اور ذرائع رسل و رسائل میں سہولت نے ان لوگوں کو مری سے دور کر دیا ہے۔ امرا و رؤسا تو سیر و تفریح کرنے یورپ اور امریکا چلے جاتے ہیں۔ البتہ متوسط طبقہ کے لوگ مری کے دامن میں کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ جو لوگ ہوا کا گرشہیدوں میں شامل ہونا چاہیں، صبح مری جا کر شام تک گھر لوٹ آتے ہیں۔ ان کی جیب مری میں قیام کے لیے اخراجات کی متحمل نہیں ہو پاتی۔ لہٰذا وہ چند گھنٹے وہاں گزار کر دل کی حسرت پوری کر لیتے ہیں۔

مری میں وفاقی اور پنجاب حکومت کے تقریباً ہر محکمے کے ریسٹ ہاؤس موجود ہیں۔ موسم گرما میں وہ اعلیٰ سرکاری حکام اور ان کے عزیز و اقارب سے بھرے رہتے ہیں۔ عوام الناس ہوٹلوں اور مسافر خانوں کا رخ کرتے اور مول تول کے بعد کوئی نہ کوئی جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

مری کی رونق سے محظوظ ہونے والوں کے لیے مال روڈ پر واقع ہوٹلوں سے بڑھ کر کوئی اور بہتر جگہ نہیں۔ کنٹونمنٹ بورڈ کا ملکیتی ہوٹل مرحبا اس مقصد کے لیے موزوں ہے۔ کون کس کا کیا لگتا ہے اور کون کس ارادے

سے مری آیا ہے، اس ہوٹل کی بالکنی سے دیکھنے والی نگاہوں سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ اپنی دھن میں مگن سیاح، خریداری میں مصروف عورتیں، خوانچہ فروش اور ان کی صدائیں، من پسند چیزوں کے لیے ضد کرتے بچے اور انھیں مناتے ہوئے والدین، کافی، آلوؤں کے چپس، آئس کریم اور کھانے پینے کی ایسی ہی چیزوں سے دل بہلاتے نوجوان اور بوڑھے دیکھ کر زندگی کی رنگارنگی کا احساس اور گہرا ہو جاتا ہے۔

پنڈی پوائنٹ کی بلند پہاڑیوں میں ٹی وی بوسٹر کے پہلو میں مریاں نامی کسی بزرگ خاتون کی قبر ہے۔ بعض

لوگ کہتے ہیں یہاں حضرت مریم علیہ السلام مدفون ہیں اور یہ کہ ان ہی کے نام پر بستی کا نام مری مشہور ہوا۔ پتریاٹہ کا مشہور تفریحی مقام مری سے پچیس کلومیٹر دور ہے۔

چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن

پتریاٹہ پاکستان کے سیاحتی مقامات میں قدرے نوعمر ہے لیکن فطری حسن و جمال کے ساتھ ساتھ یہاں سیاحوں کے آرام و آسائش کے لیے قریباً تمام ضروری سہولتیں موجود ہیں۔

اس مقام کو زیادہ شہرت لفٹ چیئرز اور کیبل کاروں

کے باعث ملی جو ایک غیر ملکی فرم کے تعاون سے نصب ہوئیں۔ یوں تو ایسا سفر ہر سیاح کے لیے سنسنی خیز ہوتا ہے، لیکن نوآموز سیاحوں اور بچوں کے لیے تو یہ تجربہ بالخصوص خوفناک، ناقابلِ فراموش اور ہیجان انگیز ہے۔

"ابو! ہم کتنی دیر لفٹ چیئر میں بیٹھے رہیں گے؟" بیٹی نے مری سے روانہ ہوتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"بیٹے! زیادہ عرصہ نہیں۔" میں نے جواب دیا "یوں سمجھو کہ لفٹ چیئر ایک ہزار تین سو میٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ جبکہ کیبل کار مزید ایک ہزار آٹھ سو میٹر آگے جاتی ہے۔ یوں ہم مجموعی طور پر تین کلومیٹر سے کچھ زیادہ فاصلہ طے کر کے پنجاب کے بلند ترین مقام پر جا پہنچتے ہیں۔"

"ان میں بیٹھ کر زیادہ خوف تو نہیں آتا؟"

"فکر نہ کرو! لفٹ چیئر اپنی مخصوص دھیمی رفتار سے مسلسل حرکت میں رہتی ہے۔ اس سفر کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لفٹ چیئر میں اعتماد سے بیٹھو، کسی قسم کی اچھل کود نہ کرو اور نیچے مناظر پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے علاقے کے قدرتی حسن سے لطف اندوز ہو۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ سفر بہت محفوظ ہے اور شاذ ہی کوئی حادثہ ہوا ہوگا۔ دعا کر کے بیٹھو گی تو ان شاء اللہ ہم ہر تکلیف سے محفوظ رہیں اور بخیر و عافیت واپس آ جائیں گے۔"

پتریاٹہ کی لفٹ چیئرز پر بیک وقت ایک سو چالیس افراد سفر کر سکتے ہیں۔ کیبل کاروں پر ایک وقت میں چھیانوے افراد بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ یوں ایک وقت میں دو سو چھتیس افراد بلندیوں کے اس سفر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ عام حالات میں تو شائقین کو اپنی باری کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا، لیکن موسم گرما میں لفٹ چیئر پر بیٹھنے کے خواہش مندوں کی لمبی قطار لگ جاتی ہے۔
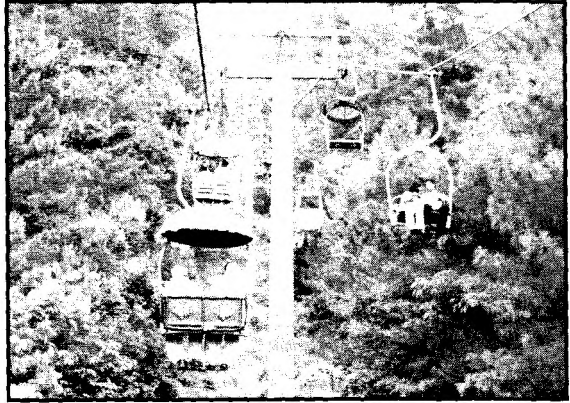
بیس کیمپ یعنی وہ جگہ جہاں سے لفٹ چیئرز کا سفر شروع ہوتا ہے، خوبصورت مقام ہے۔ وہاں کے سبزہ زار، مشروبات اور سنیکس کی چھوٹی چھوٹی دکانیں، گھنے درخت اور ان کے درمیان جابجا پڑی بنچیں بہت بھلی لگتی ہیں۔ لیکن جب لفٹ چیئر دھیرے دھیرے حرکت کرتے سیاحوں تک پہنچے تو بچے اور ناتجربہ کار افراد ساری خوبصورتی بھول کر سوچنے لگتے ہیں کہ وہ ان پر کیوں کر بیٹھیں؟

"ابو! آپ نے مجھے لفٹ چیئر پر خود بٹھانا ہے۔" عینی نے صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ نہ ہو میں گر کر خود کو زخمی کر لوں۔"

"تم گھبراؤ نہ بیٹے!" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "میرے ہوتے تمھیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ میں اس طرف کھڑا ہوتا ہوں، تم دوسری طرف کھڑی ہو جاؤ۔ جوں ہی لفٹ چیئر قریب آئے، آرام سے سوار ہو جانا۔"

ایک بار لفٹ چیئر پر بیٹھنے کے بعد سیاح بالعموم سنبھل جاتے ہیں۔ وہ مخالف سمت سے واپس آنے والے سیاحوں کو ہاتھ ہلا ہلا اور باہم مزاح پرسی کر کے زیادہ پراعتماد نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کم از کم ہمیں کوئی چیختا چلاتا ہوا سیاح نظر نہیں آیا۔

فولادی تار پر دھیمی رفتار سے چلتی لفٹ چیئر سیاحوں کو بلندی پر لے جاتی ہے۔ لیکن نیچے نظر آنے والی گہری کھائیاں کمزور دل سیاحوں کو خوفزدہ کر دیتی ہیں۔ "اگر اس وقت بجلی بند ہو جائے تو کیا ہم یہیں لٹکتے رہ جائیں گے؟" عینی نے سوال کیا۔

"بیٹے! ویسے تو انتظامیہ نے متبادل انتظام ضرور کر رکھا ہوگا لیکن دعا کرو بجلی بند نہ ہو کیونکہ ایسی بات ہمارے لیے وجہ پریشانی ضرور بن سکتی ہے۔"

تین منٹ میں سیاح اس سفر کی پہلی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ لفٹ چیئر سے اترتے ہوئے بھی چابک دستی کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے۔ بصورت دیگر اترنے والے اوندھے منہ گر بھی سکتے ہیں۔

لفٹ چیئر سیاحوں کو مڈاسٹیشن پر اتار واپس چلی جاتی ہے۔ مڈاسٹیشن سے اطراف کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ وہاں سے چربان اور اس کی پشت پر مسکری پہاڑ نظر آتا ہے۔ اس سے ذرا آگے مری واقع ہے۔ جہاں نصب پاکستان ٹیلی ویژن کا بلند و بالا ٹاور دکھائی دیتا ہے۔ موسم صاف ہو تو بہت دور برف پوش پہاڑ، گنگا کی چوٹی اور اس کے قریب آزاد کشمیر کے شہر، باغ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

"ابو! کیا ہم یہیں سے واپس چلے جائیں گے؟"

"بیٹے! اب ہم کیبل کار میں بیٹھیں گے۔ چند ہی منٹ میں وہ ہمیں پتریاٹہ کی چوٹی پر پہنچا دے گی۔"

اس جگہ سے راول جھیل اور اسلام آباد کی بعض عمارتیں مثلاً شہید ملت سیکرٹریٹ، یوبی ایل بلڈنگ، سعودی پاک ٹاور، ایوان صدر اور پارلیمان ہاؤس، نمایاں نظر آتی ہیں۔ چوٹی سے ذوقِ نظارہ کی تسکین کے بعد کیبل کار اور لفٹ چیئر کے ذریعے واپس بیس کیمپ آیا جاتا ہے۔

پتریاٹہ میں کم خرچ اور گراں، دونوں اقسام کے ہوٹل موجود ہیں۔ کھانے پینے کی اشیا وافر ملتی ہیں۔ البتہ ایسی کوئی شے دستیاب نہیں جسے بطور سوغات ہمراہ لے جایا جا سکے۔ ہاں! شاپنگ کا ارادہ ہو تو واپسی پر مری رکنا پڑے گا۔

بقول شخصے، پتریاٹہ پاکستان کے تفریحی مقامات کا بے تاج بادشاہ ہے۔ وہاں گزرا وقت کبھی فراموش نہیں ہوتا اور اس کی یادیں دل کو ہمیشہ سرخوشی کے عجیب احساس سے مخمور رکھتی ہیں۔

جب ہم پتریاٹہ سے واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے تو عینی نے پوچھا "پاکستان میں کسی اور جگہ بھی ایسی لفٹ چیئرز ہیں؟"

"بیٹے! جہاں تک میرا علم ہے سب سے پہلے لفٹ چیئرز ایوبیہ میں لگائی گئی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں اب وہ قابل استعمال حالت میں ہیں یا نہیں۔ ویسے تو مری میں بھی ایسی ہی لفٹ چیئرز موجود ہیں جو پنڈی پوائنٹ سے شروع ہو کر کافی نیچے تک چلی جاتی ہیں۔"

(مصنف کے سفر نامہ "منزل نہ کر قبول" سے ایک باب جو بصد شکریہ لیا گیا)

◆◆◆

معاشرت

مجرم جو جرم کرکے بھی کہلایا

بے گناہ

اندھے قانون کے خود غرض ہاتھوں میں پھنس جانے والے ایک ستم رسیدہ غریب کا ماجرا

سہراب اسلم

اس روز پولیس چوکی کے انچارج نے دتو کمہار کو مرغی چرانے کے الزام میں پکڑ لیا۔ پھر اس گدھے کا انتظار ہونے لگا جس پر دتو کمہار کو پورے قصبے میں گھمایا جانا تھا۔ سردست منہ کالا کرنے کے لیے توے کا انتظام ہی ہو سکا تھا یا پھر پانچ چھتروں کی سلامی جو دتو کمہار کو دی جا چکی تھی.....!

انچارج چوکی ایک سخت سید بادشاہ تھے اور شکاری کتے پالنے کے بہت شوقین۔ تبدیل ہو کر جس علاقے

میں جاتے، تحفتاً کتے وصول کرتے اور یوں کتوں کی اپنی فوج میں اضافہ کرتے رہتے۔ اگرچہ ان کا چہیتا کتا صرف موتی ہی تھا۔

موتی کے اختیارات خود انچارج سے زیادہ تھے۔ انچارج صرف چوکی کی صدر کرسی پر بیٹھ کر تھانے داری کرتا تھا۔ مگر موتی اس میز پر بھی بیٹھ جاتا جو حکومت نے سید بادشاہ کو سرکاری کام کے لیے مہیا کی تھی۔ کس ماتحت کی کیا مجال جو موتی کو بخش کہہ کر میز سے نیچے اتارے؟

کتوں کی فوج ظفر موج کی رعایت سے چوکی انچارج کا نام کتوں والی سرکار پڑ چکا تھا۔ حیرانی کی بات یہ کہ انچارج کو اس نام پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ یہ نام سن کر وہ ایک طرح کی مسرت کا اظہار کیا کرتا۔

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دفعہ ۵۴ ضابطہ فوجداری کے تحت پکڑے جانے والے مشتبے دن رات ان کتوں کی بٹالین کی چاکری کیا کرتے۔ قصبے کے تمام قصابوں کا فرض تھا کہ علی الصباح تازہ گوشت انچارج کے کتوں کو ارسال کریں۔ شیر فروشوں پر لازم تھا کہ وہ دودھ میں ڈالے جانے والے پانی کے حساب سے خالص دودھ مہیا کریں۔ اسی طرح نان بائی میدے میں ملاوٹ کے حساب سے نان حاضر کرتے۔ البتہ پھل فروشوں کو آزادی تھی کہ وہ صرف تہوار کے موقع پر کتوں کے لیے تحفے لے آیا کریں۔ کتے پھلوں سے شوق نہ فرماتے مگر شاہ جی عقیدت مندوں کا دل توڑنے کے قائل نہیں تھے۔

کتے پالنا کتوں والی سرکار کا واحد شغل نہیں تھا۔ انھیں ایک شوق اور بھی لاحق تھا اور وہ یہ کہ ضرورت بے ضرورت لنگوٹ کس کر بیٹھ جانا اور مشتبوں سے مالش کرانا...... مالش کرانے کے اوقات مقرر نہیں تھے۔ نصف شب ہو یا دن، اگر شاہ جی کو مالش یاد آ گئی، تو پھر سرکاری کام معطل اور مالش شروع! دنیا کی کوئی طاقت انھیں اس شغل سے باز نہیں رکھ سکتی تھی، ساری بات شاہ جی کے موڈ کی تھی۔

جب دتو کمہار کو پولیس چوکی لایا گیا، تو شاہ جی ایک مخبر دوست کو اپنی تھانے داری کے کارنامے سنانے میں مصروف تھے۔ وہ فخر یہ کہہ رہے تھے کہ ریگلر ہیں، کسی سفارش سے یا رشوت دے کر تھانے دار نہیں بنے۔ سپاہی سے ترقی کی اور اس اعلیٰ عہدے تک پہنچے۔ ان کی دھوم پنجاب بھر میں ہے۔ وہ ملزم کی چال دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ ملزم گنہگار ہے یا بے گناہ...... مجرم کا چہرہ اندھیری رات میں بھی شناخت کر سکتے ہیں اور ہزاروں کے مجمع میں تیبی آدمی کو یوں نکال باہر کرتے ہیں جیسے دودھ میں سے مکھی۔

شاہ جی جب مخبر کو اپنے کارنامے سنا چکے تو حوالدار نے دتو کمہار کو پیش کیا۔ بھیگی بلی بنے ہوئے دتو نے شاہ جی کو سلام کیا۔ جواب میں انھوں نے فرمایا "اوئے کھوتے کے پتر! تجھے علم نہیں، اس علاقے کا انچارج کون ہے؟"

"کتوں والی سرکار صاحب!" دتو کمہار نے ادب سے جواب دیا۔

"اوئے جب تجھے اتنی خبر ہے تو مرغی چرانے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"معافی دے دیں سرکار، بندے بشر سے غلطی ہو ہی جاتی ہے......"

جواب میں دتو کمہار کی کمر پر زوردار دو ہتڑ کی تان ٹوٹی اور آواز آئی "اوئے کھوتے کے پتر...... معافی؟ اوئے تجھے خبر نہیں کتوں والی سرکار نے معافی والا رجسٹر

ہی پھاڑ ڈالا ہے......؟''

''غ......ل ل ل......غلطی ہو گئی سرکار!'' دتو مہار بلبلایا۔ شاید شاہ جی کو کچھ ترس آیا اور حکم صادر ہوا:

''معافی کی بات تو ہوگی معافی کے وقت، پتر! پہلے تیری ''ترائی'' ہوگی......تو نرا مرغی چور ہے یا تجھے کچھ اور بھی آتا ہے؟''

یہ کہہ کر شاہ جی نے حوالدار کو لنگوٹ اور سرسوں کے تیل کی شیشی لانے کو کہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مالش شروع ہو گئی۔ اس دوران موتی میز پر بیٹھا اونگھتا رہا۔

دتو مہار نے الٹے سیدھے ہاتھ چلانا شروع کیے۔ شاہ جی بدمزہ ہو گئے۔ دتو مہار کی پشت پر ٹھڈا رسید کرتے ہوئے فرمایا ''اوئے آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ تو گدھوں میں رہ کر گدھا بن چکا۔''

دتو مہار اوندھے منہ زمین پر گرا تو شاہ جی گرجے ''ڈراما نہ کر...... اٹھ اور مرغا بن جا ورنہ ابھی تیری حالت ادھیڑتا ہوں......''

پھر ایک منشی کو آواز دی: ''اوئے غلام رسول! آج جتنی تیرے ہاتھوں میں بہت رس ہے۔ یہ کھوتے کا پتر کیا جانے مالش کیا ہوتی ہے؟''

غلام رسول مشتبہ ڈھنگ سے مالش کرنے لگا، تو شاہ جی کچھ موج میں آ گئے اور اپنے مخبر دوست کو اپنی تھانے داری کے کارنامے سنانے لگے۔ وہ بات بات پر کہتے ''جو رنگڑ ہوتا ہے ناجی، وہ رنگڑ ہی ہے۔ یہ ڈائریکٹ تھانے دار کیا جانیں، تھانے داری کیا شے ہوتی ہے۔'' کبھی وہ ان سات ڈاکوؤں کا قصہ سناتے جنھیں تن تنہا شاہ جی نے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا۔ کبھی ان چوروں کی کہانی جو سخت مار پڑنے پر بھی اپنا جرم قبول نہیں کرتے تھے۔ مگر شاہ جی کا پہلا چھتر پڑنے پر ہر شے برآمد کرنے پر راضی ہو جاتے۔ کبھی کہتے ''تھانیداری کرنا جن بھوت نکالنے سے مشکل کام ہے۔ مگر تان وہیں ٹوٹتی ''جو رنگڑ ہوتا ہے ناجی وہ رنگڑ ہی ہے!''

مالش جاری رہی اور شاہ جی کا مار دھاڑ سے بھرپور تھانے داری کا پروگرام بھی! اتنے میں کار خاص نے حاضر آ کر بتایا گیا کہ گدھے کا انتظام ہو گیا ہے۔ یہ اطلاع پاتے ہی شاہ جی کی توجہ دتو مہار کی طرف پھر مبذول ہوئی جو کان پکڑنے کے بجائے زمین پر بیٹھا کان کھجا رہا تھا...... شاہ جی کا پارہ چڑھ گیا۔ مکوں، ٹھڈوں اور گالیوں کی برسات شروع ہو گئی۔ دتو مہار کی چیخوں سے پولیس چوکی لرزنے لگی۔ اب کی بار شاہ جی ایک اور اعلان کرتے تھے: ''اوئے کھوتے کے پتر...... تجھے خبر نہیں جہاں کتوں والی سرکار تعینات ہو وہاں ہوا بھی سلام کر کے گزرتی ہے......!''

ممکن ہے اچھے تھانیداروں کے مسکرانے پر محکمے نے پابندی لگا رکھی ہو؟ شاہ جی کو نہیں مسکرانا تھا سو نہ مسکرائے، ہنسنے کی تو بات ہی دور تھی۔

شاہ جی کا مخبر دوست بار بار کہتا ''بے شک...... بے شک!''

اور دتو مہار پٹتا رہا۔ اس کی چیخیں آسمان میں شگاف ڈالتی رہیں مگر کسی نے یہ نہ کہا، شاہ جی اسے معاف کر دو۔ ظاہر ہے یہ فقرے پولیس چوکیوں اور تھانوں میں نہیں کہے جاتے۔ سو ہر دھمکے کے انجام پر ایک ہی آواز سنائی دیتی:

''بے شک بے شک! اور بھی''

جب شاہ جی نے دتو کمہار کو آخری ٹھڈا مارا تو وہ زمین پر یوں لڑھکا جیسے فٹ بال لڑھکتا ہے۔ سب ہنسنے لگے مگر شاہ جی کے چہرے پر مسکراہٹ تک نمودار نہیں ہوئی۔ ممکن ہے اچھے تھانیداروں کے مسکرانے پر محکمے نے پابندی لگا رکھی ہو؟ شاہ جی کو نہیں مسکرانا تھا سو نہ مسکرائے، ہنسنے کی تو بات ہی دور تھی۔

جب "فٹ بال" ساکن ہو گیا، تو شاہ جی نے دتو کمہار سے پوچھا "اوئے اب بتا..... اس چوکی کا انچارج کون ہے؟"

"ک ک ک کتے شاہ سرکار....." وہ ہکلایا۔

بھوکے شیر کی طرح شاہ جی اس کی طرف لپکے۔

"اوئے کھوتے کے بچے! نام تو پورا لے۔"

دتو کمہار خطرہ بھانپ چکا تھا۔ اپنی ہکلاتی ہوئی زبان پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "کتے شاہ جی... سرکار!"

شاہ جی کے مخبر دوست نے لقمہ دیا "اوئے کہہ کتوں والی سرکار" لیکن اس بار گھبراہٹ میں دتو کمہار کے منہ سے نکلا "شاہ جی کتوں والی سرکار!"

ایک بار پھر شاہ جی اور دتو کمہار میں فٹ بال میچ شروع ہو گیا اور پولیس چوکی کھیل کے میدان میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن یہ میچ یک طرفہ رہا۔ اسی اثنا میں کارخاص گدھا ہانک لایا۔ اب شاہ جی اپنی کرسی پر آن بیٹھے اور پھولا دم برابر کرنے لگے۔ موتی میز سے نیچے اتر شاہ جی کے پاؤں چاٹنے میں مصروف ہو گیا۔ قدرے توقف کے بعد شاہ جی نے کارخاص کو حکم دیا "اس کھوتے کے بچے کا منہ کالا کر کے اس پہ بٹھاؤ اور قصبے میں گھماؤ۔"

"بے شک..... بے شک....." مخبر دوست نے حسب عادت کہا۔

ادھر موئے دتو کمہار کو کارخاص نے دیگر ملازموں کی مدد سے گدھے کی پشت پر الٹے منہ بٹھایا۔ حوالدار نے آگے بڑھ کر توے کی ساری سیاہی اس کے چہرے پر مل دی۔ ہانپتے ہوئے شاہ جی نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے حکم صادر کیا:

"لے جاؤ اس مرغی چور کو میری نظروں سے دور!"

دتو کمہار کا جلوس پولیس چوکی سے رخصت ہوا، تو شاہ جی نے مخبر دوست کی طرف توجہ دی "اصلاح معاشرہ کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے جی!"

"بے شک..... بے شک؟"

قصبے کے بچے بالے شاہ جی کی عادت سے واقف تھے۔ اس لیے کافی دیر سے چوکی کے باہر دتو کمہار کے جلوس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ جونہی اس کی سواری چوکی سے برآمد ہوئی، وہ نعرے لگانے لگے: "دتو ساڈا شیر اے، باقی ہیر پھیر اے۔"

جلوس کی قیادت کرنے والے حوالدار نے بچوں کے لیڈر سے کہا "اوئے یہ مرغی چور ہے، شیر کس طرح بن گیا؟"

بچوں کے لیڈر نے جواب دیا "منشی جی! پہلے یہ مرغی چور تھا، چوکی میں آ کر شیر بن گیا ہے۔"

حوالدار شاید کچھ اور کہتا مگر بچوں کے لیڈر نے اس کی مہلت ہی نہ دی اور اب نعروں کے ساتھ بچوں کا رقص بھی شروع ہو گیا۔

"دتو ساڈا شیر اے..... باقی ہیر پھیر اے۔"

تالیوں کی تھاپ پر یہ گاتا ناچتا جلوس قصبے کی مختلف گلیوں سے گزرنے کے بعد جب بازار پہنچا، تو انجمن اتحاد المسلمین کے صدر نے بڑھ کر پرانے جوتوں

کا ہار دِتو کمہار کے گلے میں ڈال دیا۔ بچے بدستور نعرے لگاتے رہے:

''دِتو ساڈا شیر اے..... باقی ہیر پھیر اے!''

جلوس کے دونوں طرف کھڑے لوگ ہنستے رہے اور جلوس چلتا رہا۔ مگر جب اصلاحِ معاشرہ کا یہ جلوس چوک والی جامع مسجد کے سامنے سے گزرا تو امام صاحب نے قیادت کرنے والے حوالدار کو روک کر مشورہ دیا۔ ''منشی جی! یہ سزا کافی نہیں، اس پر حد لاگو کرو۔ آپ جانتے ہیں نا اسلام میں چوری کی سزا کیا ہے؟''

مگر اس سے پہلے کہ حوالدار امام صاحب کو کوئی جواب دیتا، بچوں نے نعرہ لگایا: ''مولوی ساڈا شیر اے، باقی ہیر پھیر اے۔''

اس پر امام صاحب کی بتیسی کھل گئی اور وہ بولے ''بھاگ جاؤ شیطانو..... مجھے مرغی چور سے ملا رہے ہو؟''

امام صاحب کی اس سرزنش پر بچے باز آئے اور چہکے۔ وہ پہلے سے بھی بلند آواز میں کہنے لگے ''مولوی ساڈا شیر اے..... باقی ہیر پھیر اے۔''

جب امام صاحب کی زوجہ چہارم کے کانوں میں نعروں کی آواز پہنچی، تو وہ گھونگھٹ سنبھالتی حجرے کی چار دیواری سے گردن بلند کرنے پر مجبور ہوگئی۔ خوش ہوئی کہ قصبے کے بچے شوہر نامدار کو شیر کے لقب سے یاد کر رہے ہیں۔ جلد یہ جلوس آگے بڑھ گیا۔ امام صاحب کی واپسی کے خوف سے زوجہ محترمہ پھر حجرے میں دبک گئیں۔

جلوس قصبے کی میونسپل کمیٹی کے دفتر کے سامنے پہنچا۔ چیئرمین صاحب نے دِتو کمہار کے استقبال کا پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ جلوس قریب آیا، تو چیئرمین صاحب نے کمیٹی کے کلرک کو اشارہ کیا۔ اس نے نیلے رنگ کے پانی کی بالٹی اس کے سر پر انڈیل دی اور بولا: ''حوالدار جی، صرف منہ کالا کرنے سے کام نہیں چلتا، اس کے پاؤں بھی نیلے ہونے چاہئیں۔''

دِتو کمہار نے ٹھنڈے پانی کی وجہ سے ایک کپکپی لی اور پھر گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ البتہ بچے بالوں نے اس دوران نعرہ بدل دیا:

''چیئرمین ساڈا شیر اے..... باقی ہیر پھیر اے!''

چیئرمین امام مسجد کی طرح ذہین نہیں تھا، وہ سمجھا کہ آنے والے الیکشن کے لیے اس کے ووٹ پکے ہو رہے ہیں۔ اس نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا، بطور انعام بچوں کے لیڈر کو دیا اور پھر اس کے کان میں کہا: ''کسی اور کے نعرے نہیں لگانے، واپسی پر دس کا نوٹ اور دوں گا۔''

تمام دن جلوس قصبے کے باسیوں میں قہقہوں کی سوغات بانٹتا رہا۔ مگر کسی بھلے آدمی نے زحمت گوارا نہ کی کہ دِتو کمہار سے پوچھے کہ وہ گنہگار ہے بھی یا نہیں!

یہ کہہ کر چیئرمین نے ازراہِ تفنن ایک چپت دِتو کمہار کی گدی پر رسید کر دی اور جلوس آگے بڑھ گیا۔

یہ جلوس قصبے کا چکر لگا کر واپس لوٹا، تو شاید ہی کوئی فرد ایسا ہوگا جو دِتو کمہار کی ہیئت کذائی پر ہنسا مسکرایا نہ ہو۔ تمام دن جلوس قصبے کے باسیوں میں قہقہوں کی سوغات بانٹتا رہا۔ مگر کسی بھلے آدمی نے زحمت گوارا نہ کی کہ دِتو کمہار سے پوچھے کہ وہ گنہگار ہے بھی یا نہیں!

دن ڈھلے جلوس چوکی واپس پہنچا، تو شاہ جی منتظر بیٹھے تھے۔ انھوں نے کتوں کی بٹالین کو نہلانے کے لیے صابن و پانی کا وافر انتظام کر رکھا تھا۔ جلوس کے واپس آتے ہی شاہ جی نے دِتو کمہار کو حکم دیا ''اوئے مرغی چور، باری باری سب کتوں کو نہلا ورنہ تیری چمڑی

ادھیڑ دوں گا......!''

چونکہ اُسے تھوڑا بہت آرام مل چکا تھا۔ زخموں سے خون رسنا بھی بند ہوگیا تھا اس لیے خاموشی سے گدھے کی پشت سے اترا اور چوکی سے ملحق جگہ پر کتے نہلانے لگا۔ اب بچے بالوں نے نعرہ بدل دیا: ''کتا ساڈا شیر اے، باقی ہیر پھیرا اے!''

شاہ جی نے اپنے کتوں کی تحسین کا نعرہ سنا، تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ انھوں نے بچوں کے لیڈر سے مخاطب ہو کر کہا ''اوئے کاکا...... نعرہ ذرا زور سے لگا، مجھے سنائی کم دیتا ہے!''

لیڈر کو نعرے لگانے کی فیس کا پتا چل چکا تھا، اس لیے ساتھیوں کی آنکھ بچا کر دس انگلیاں فضا میں بلند کر دیں۔ شاہ جی اشارہ سمجھ گئے اور بولے ''اوئے کم بخت لے لینا دس روپے۔ پہلے نعرہ تو لگا......'' اس پر بچوں کے لیڈر نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے نعرہ بلند کیا: ''کتا ساڈا شیر اے'' بچوں نے جواب دیا ''باقی ہیر پھیرا اے!''

فلک شگاف نعرہ سن کر شاہ جی کی طبیعت خوش ہو گئی۔ انھوں نے دس کا نوٹ بچوں کے لیڈر کی طرف اچھالتے ہوئے کہا ''اچھا سب بھاگ جاؤ...... ہم نے مرغی چور سے تفتیش کرنی ہے۔''

کچھ بچے چلے گئے اور باقی بدستور نعرے لگاتے رہے۔ شاہ جی ٹہلتے ٹہلتے دتو کمہار کے پاس جا کر کھڑے ہوگئے جہاں کارخاص کتوں کی نہلائی کی نگرانی کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد شاہ جی خاموش کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ جب بچوں کا شور تھما، تو انھوں نے ہولے سے اپنے کار خاص سے پوچھا ''اوئے روفے خاں، صبح سے اس کھوتے کے پتر کو کوئی چھڑانے نہیں آیا۔ بہت دیر ہوگئی، کب تک انتظار کرنا پڑے گا؟''

کارخاص نے نرمی سے جواب دیا ''شاہ جی آتا ہی ہوگا اس بچارے کا باپ! آپ جانتے ہیں، غریبوں کو تو کوئی جلد رقم بھی ادھار نہیں دیتا۔ ایسے کاموں میں دیر سویر ہوجاتی ہے۔ غریبوں کا کچھ تو لحاظ کرنا چاہیے۔''

کارخاص کے یہ بول دتو کمہار نے بھی سن لیے۔ وہ کتوں کو نہلاتے ہوئے رک گیا۔ صبح سے گالیوں اور طعنوں کے زہریلے تیر خاموشی سے سہتا رہا تھا۔ اب جو ایک ہمدردانہ آواز کانوں میں پڑی، تو اس کا من بے قابو ہوگیا۔ سوجی ہوئی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو امڈ آئے۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے سرگوشی کی:

''ربا تیرا شکر! دشمنوں کے اس لشکر میں کوئی تو ہے جس کے ہاتھ میں نیزہ نہیں......!''

یہ کہہ کر وہ پھر کتے نہلانے میں مصروف ہوگیا۔

◆◆◆

فضول خرچ

ایک کنجوس باپ اپنے بیٹے سے: ''کیا کر رہے ہو؟''

بیٹا: ''کچھ نہیں پاپا!''

باپ: ''تم کچھ لکھ رہے ہو گے؟''

بیٹا: ''جی نہیں پاپا۔''

باپ غصے سے: ''تو پھر چشمہ اتار کیوں نہیں دیتے۔ تمھیں فضول خرچی کی عادت پڑ گئی ہے۔

(مرسلہ: فاطمہ سعد، واہ کینٹ)

غمگین ہیں یا دکھی پھر بھی آپ

ذرا مسکرائیے......

فوٹوگرافی کے اس حکم کو

مطلق العنان بادشاہ بھی ٹال نہیں پاتا

یوسف ناظم

جلسہ ہو یا مشاعرہ، قوالی کی محفل ہو یا کوئی سرکاری تقریب، کھیل کا میدان ہو یا سیاست کا ایوان، ایسی تمام جگہوں پر دعوت اور ٹکٹ کے بغیر داخل ہو جانے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ گلے میں ایک ناکارہ کیمرا لٹکا لیا جائے۔ کیمرا لٹکا رہے تو گردن سیدھی رہتی ہے اور راستہ بھی سیدھا ملتا ہے۔ کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ کیمرا مین سے یہ دریافت کرے کہ آپ یہاں کس خوشی میں تشریف لائے؟

فوٹوگرافر ہی وہ واحد شخص ہے جو دن کے وقت سورج اور رات کے وقت بجلی کی روشنی میں، چیف کی کرسی کے عین سامنے جلسہ گاہ میں نقب لگاتا ہے۔ چیف عقب میں چپ چاپ کھڑی رہتی ہے۔ فوٹوگرافر سے یہ بھی نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس کے خوب صورت کیمرے میں فلم بھی ہے یا نہیں؟ یہ فوٹوگرافر کا پیدائشی حق ہے جو [illegible] نہیں لیا جا سکتا۔

فوٹوگرافر [illegible] [illegible] میں عجیب [illegible] لوگ بھی مسکرا دیتے ہیں [illegible] آئے ان کی اپنی تصویر [illegible]

میں مارے جاتے ہیں۔ جس طرح کسی فوجی افسر کی زبان
سے 'اٹین شن' کا لفظ سن کر پوری بٹالین بے ضرورت سینہ
تان دیتی ہے۔ اسی طرح فوٹوگرافر کی معمولی رسمی فرمائش
پر، جس میں کوئی خلوص و درد نہیں ہوتا، سبھی کی باچھیں کھل
جاتی ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے اسی طرح کسی فوٹوگرافر
کے کہنے پر ایک حسینہ کو مسکراتے دیکھ لیا، تو برجستہ فرمایا تھا:

یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

(بعد میں انھوں نے مصرعے کو ایک رباعی میں جمع
کر کے اس کا حلیہ بدل دیا)

فوٹو کھنچواتے وقت ہر شخص کا مسکرانا اب خود
فوٹوگرافروں کو بھی پسند نہیں۔ فوٹوگرافر اب اتنے بااختیار
ہوگئے ہیں گویا دستور کی بیالیسویں ترمیم پارلیمان میں انھی
کے لیے اتری تھی۔ گروپ فوٹو کھینچتے وقت پہلے تو لوگوں کو
شکل وصورت، قدوقامت اور لباس و پوشش کے معیار پر
جانچ کر دو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جن کا قد
بہت زیادہ لمبا ہو یا جو صورت سے مسکین اور دوسرے
درجے کے شہری نظر آئیں انھیں زمین پر بٹھا دیتے ہیں۔
کسی کے حالات کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں،
اسے کرسی پر بیٹھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کرسیوں پر بیٹھنے
والوں کے دست و بازو پر اتنی کڑی نظر رکھتے ہیں کہ ڈر
لگنے لگتا ہے، انھیں نظر نہ لگ جائے۔ اور کرسیوں کے پیچھے
کھڑے رہنے والوں کو اس طرح کھڑا کرتے ہیں کہ وہ
اپنے انداز ہی سے وظیفہ یاب دکھائی دینے لگتے ہیں۔

فوٹوگرافر اپنے تمام "سامعین" کو اس طرح ترتیب
دیتے ہیں جیسے کہ بہ لحاظ قسم کے مطابق گلدان میں پھول
سجائے جاتے ہیں۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا اور لوگ اس
بندوبست کے عادی بھی ہیں۔ لیکن بعض فوٹوگرافروں نے
اپنے اختیارات میں اب اس اختیار کا اضافہ کرلیا ہے کہ وہ
گروپ کی تصویر میں سے کسی سے بھی کہہ دیتے ہیں کہ فلاں
صاحب نہ مسکرائیں، اور کسی کو اپنی مسکراہٹ کا والیوم کم
کرنے کی ہدایت بھی دیتے ہیں..... کوئی فوٹوگرافر یہ گوارا
نہیں کرسکتا کہ دستور کی بیالیسویں ترمیم ضائع ہوجائے۔

وہ ہمیشہ ایک فوٹو دو مرتبہ کھینچتے ہیں۔ بعض لوگ یہ
سمجھتے ہیں کہ فوٹوگرافر ایک ہی تصویر دو قسطوں میں مکمل
کرتے ہیں، لیکن یہ غلط ہے۔ پہلی تصویر صرف مسودہ ہوتی
ہے۔ فوٹوگرافروں نے اصل میں دہرانے کا یہ طریقہ
شاعروں سے سیکھا۔ شاعر اپنے ہر شعر کا پہلا مصرع دو
مرتبہ پڑھا کرتے ہیں۔ (یہ اور بات کہ فائدہ کچھ نہیں
ہوتا)

ایک شاعر اور ایک فوٹوگرافر میں یوں تو کئی باتیں
مختلف ہیں۔ لیکن ان دونوں حضرات میں دو فرق اہم
ہیں۔ ایک تو یہ کہ فوٹوگرافر کو اپنے متعلق کوئی غلط فہمی
نہیں ہوتی۔ دوسرا یہ کہ فوٹوگرافر پر ہوٹنگ کا رواج نہیں
بلکہ اب تو یہ حال ہے کہ شاعر کے بجائے فوٹوگرافر "دیدۂ
بینائے قوم" ہوگیا۔ کیمرے کی آنکھ چشم پوشی کی عادی نہیں
ہوتی۔ آج اجتماعی اور انفرادی زندگی میں فوٹوگرافر کا وہی
درجہ ہے جو غزل میں ردیف اور قافیے کا ہوتا ہے۔ بس کسر
اتنی رہ گئی ہے کہ فوٹوگرافر کا نام آپ کے راشن کارڈ میں
درج نہیں ورنہ عملاً وہ ہر خاندان کا رکن ہے۔

پہلے بات اور تھی آدمی اپنی شکل آئینے میں دیکھ کر
خوش ہولیتا۔ اب اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ اپنی تصویروں کا
ایک پورا البم رکھنا پڑتا ہے جس کا دن میں ایک مرتبہ مطالعہ
ضروری ہے۔ جس خاندان کا فیملی البم نہ ہو لوگ اس کے
افراد کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔
سوچتے ہیں کہ یہ لوگ خاندانی ہیں بھی یا نہیں!

یوں بھی جب سے اعمال و افعال کی نوعیت بدل گئی

ہے، تصویروں کی اہمیت بڑھ چکی۔ اب ہر قدم پر آدمی کو اپنی تصویر پیش کرنی پڑتی ہے، خواہ اس کا چہرہ تصویر کے لائق ہے یا نہیں۔ وہ تصویر کے بغیر زندگی کے کسی بھی شعبے میں دخل نہیں دے سکتا۔ امتحان دینا ہو تو شناختی کارڈ پر اپنی تصویر لگانی پڑے گی۔ یہ اور بات کہ طالب علم کی جگہ اس کا کوئی خیرخواہ امتحان گاہ میں داخل ہو اور جوابی پرچا لکھ آئے۔ پھر زندگی کے دیگر بہت سے اشغال کی خاطر بھی شناختی کارڈ ہی بنوانا پڑتا ہے جس پر اپنی تصویر لگانی ضروری ہے۔ بعض لوگ بھولے سے شناختی کارڈ پر اپنی وہ تصویر لگوا دیتے ہیں جو انھوں نے شادی سے پہلے کھنچوائی تھی، پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

نظم و نسق کی کسی خرابی کی وجہ سے ملازمت مل جانے کا خدشہ بھی رہتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی دو تین درجن تصویریں درکار ہوتی ہیں۔ ورنہ پاسپورٹ کے لیے تو چند تصویریں ہونی ہی چاہئیں۔

یہ تو خیر جبریہ تصویریں ہوئیں لیکن شوقیہ تصویریں بھی ہیں جن کے بغیر زندگی ایسی کہانی نظر آتی ہے جس پر ''باقی آئندہ'' لکھا ہو۔ جو تصویر ملازمت کی درخواست کے واسطے ہو، شادی کی مہم کے لیے ناموزوں سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ ہوتی دونوں ہی ملازمتیں ہیں۔ لیکن شادی کے باب میں جو تصویریں کھینچی جائیں ان کا انداز، اسلوب اور لہجہ الگ ہوتا ہے۔ یہ نکتہ آپ کو فوٹوگرافر ہی تفصیل سے سمجھا سکتا ہے۔

پھر شاعروں اور ادیبوں کی مخصوص انداز والی تصویریں ہیں۔ ادبی رسائل میں پہلے صرف کلام یا مضمون کی اشاعت کافی سمجھی جاتی تھی۔ قارئین بھی مطمئن ہو جاتے' لیکن اب تصویر کے بغیر کسی تحریر کی اشاعت اس لیے بھی ممکن نہیں کہ کم سے کم ایک چیز تو غنیمت ہونی چاہیے۔

صاحبِ مضمون

اُردو کے ممتاز مزاح نگار، یوسف ناظم کا اصل نام سید محمد یوسف تھا۔ آپ مہاراشٹر کے ایک گاؤں جلنا میں ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے ایم اے اُردو کیا۔ پھر سرکاری ملازم ہو گئے اور ڈپٹی لیبر کمشنر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ دورانِ ملازمت مزاحیہ مضامین اور کالم لکھتے رہے۔ مزاح کی دو درجن کتب شائع ہوئیں۔ آپ اپنے منفرد مزاحیہ اسلوب کے مالک تھے اور مزاح نگاروں اور اُردو مزاح نگاروں میں نمایاں مقام پایا۔ ۲۵ جولائی ۲۰۰۹ء کو وفات پائی۔

شاعر اور ادیب اب اپنے نتیجہ فکر اور اس کے انتخاب پر اتنا وقت صرف نہیں کرتے جتنا اپنی تصویر منتخب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ فوٹوگرافر بھی ایسی تصویروں پر کم محنت نہیں کرتے، اپنا خون پسینا ایک کر دیتے ہیں تب کہیں جا کر شاعر اور ادیب آدمی نظر آتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چند دن بعد ایڈیٹر ہر تصویر کے نیچے یہ جملہ بھی چھاپنا شروع کر دیں گے کہ ایڈیٹر کا فوٹوگرافر سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

کسی بڑے آدمی یا بڑی خاتون کو عام جلسے میں ہار پہنانے کا اعزاز حاصل کرنے کے بعد بعض لوگ منہ مانگے دام ادا کرتے ہیں۔ اس موقع کی جو تصویر کھنچے وہ ان کے ڈرائنگ روم میں ہر وقت لٹکی رہتی ہے۔ جب ذرا گردن اٹھائی، دیکھ لی۔ یہی قیمتی تصویر بعض اوقات ایسی

معلوم ہونے لگتی ہے جیسے سر پر تلوار لٹکی ہو۔ یہ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ پورے ماحول کی تصویر بدل جاتی ہے اور آدمی خود تصویرِ حیرت بن جاتا ہے۔

اب تو ضرورت کی کوئی چیز خریدیے، اس کی بوتل یا ڈبے پر موجد کی تصویر موجود ہوگی یا پھر کوئی ماڈل اپنی زلفوں، دانتوں، ہاتھوں اور اس قسم کی دوسری اشیا کی نمائش میں مصروف نظر آئے گا۔

پیکنگ پر اگر تصویریں نہ ہوں، تو بہتوں کو تو خبر بھی نہ ہو کہ دنیا میں کیا کیا چیزیں ایجاد ہوگئی ہیں۔ ان ڈبوں اور بوتلوں کو آپ قرینے سے گھر میں سجا دیں، تو ایک آرٹ گیلری بن جائے۔

الیکشن کے امیدواروں پر بھی اب لازم ہے کہ وہ اپنے اپنے پوسٹروں پر اپنی تصویر ضرور چھپوائیں۔ کہتے ہیں امریکا میں جمی کارٹر صرف اپنی تصویر کی وجہ سے الیکشن جیت گیا۔ اگر کوئی امیدوار پوسٹر پر صرف اپنا نشان انتخاب چھاپ دے اور نشان انتخاب کوئی جانور ہو تو غلط فہمی کا امکان رہتا ہے۔

سنا ہے فوٹوگرافر بھی اب اپنے اسٹوڈیو کے شوکیس میں صرف انہی لوگوں کی تصویریں نمائش کے لیے رکھتے ہیں جو پابندی سے ہر ماہ اُن کا کرایہ ادا کریں۔ بعض تصویریں البتہ ہوتی ہی نمائش کے لیے ہیں۔ یہ ان مہ رُخوں کی ہیں جن سے ملنے کے لیے غالب نے مصوری سیکھنے کی کوشش کی تھی۔

یوں تو فوٹوگرافر ہر جگہ آ جا سکتا ہے لیکن ایسی جگہ جانا ممنوع ہے جہاں مکان ڈھانے کے لیے بل ڈوزر گشت کر رہا ہو، یا کسی مجسٹریٹ کے حکم پر عوام پر گولی چلائی جا رہی ہو۔ یہ پابندی بھی صرف اس لیے ہے کہ فوٹوگرافر اگر وہاں آ بھی گیا، تو کس سے کہے گا: "ذرا مسکرائیے!" ◆◆◆

معدوم ہونے کے
خطرے سے دوچار

افریقا کے بونے

ان پست قامت انسانوں کا تعجب خیز حال جو دور جدید میں بھی جنگل کو اپنا مسکن بنائے بیٹھے ہیں

فرزانہ نکہت

ایک گورا افریقی بونوں کے ساتھ

زانگا سنگھا کے مخصوص قطعۂ اراضی کی بیرونی حدود میں گھنے درختوں کے جھنڈوں کی قطار سے پرے موساپولا گاؤں واقع ہے۔
جمہوریہ وسطی افریقا میں واقع ایک ہزار سات سو میل کے رقبے پر پھیلا، یہ جنگل افریقی براعظم کی عظیم شکار گاہ ہے۔ ساتھ ہی یہ مشہور عالم افریقی بونوں کا مولد و مسکن بھی ہے جن کی نسل اب معدومیت کے خطرے سے دوچار ہو چکی۔

یہ بونے ہزاروں برس سے براعظم افریقا کے مالک

چلے آ رہے ہیں۔ اب ان نیم بدوی جانوروں کو گھیر کر شکار کرنے والوں کی تعداد صرف ایک لاکھ کے لگ بھگ رہ گئی ہے۔ ان کی جنگلی زندگی کا غالب رقبہ سبززاروں (Savannas) میں تبدیل ہو چکا۔ انھیں اپنے پڑوسیوں کی طرف سے بھی خطرات لاحق ہیں۔

موساپوالا کے اسّی فیصد باشندے شہد کی مکھیوں کے چھتے کی صورت بنی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ وہ پتوں اور گارے سے بنائی جاتی ہیں۔ جھونپڑیوں کے باہر بچوں کی ٹولیاں کھیلتی کودتی دکھائی دیتی ہیں۔ مرد و زن اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر حقیقتاً یہ انتہائی غربت اور بدحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ طبی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے ان میں گلہڑ سمیت کئی بیماریاں عام ہیں۔ ہر پانچ نومولود بچوں میں سے ایک بچہ ایک سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ بچوں کی اموات کے اسباب زیادہ تر ملیریا، اسہال اور وبا ہیں۔

ان بونوں کے بچے دس بارہ سال کی عمر تک نارمل قد و جسامت کے ہوتے ہیں۔ پھر ان کے قد نہیں بڑھ پاتے۔ سائنس دان اب تک نہیں جان سکے کہ ان کی نشوونما تھم جانے کا راز کیا ہے۔ ان کی کوتاہ قامتی نے غالبًا ہزاروں برس سے جنگلوں میں بودوباش رکھنے کے سبب جنم لیا۔ جنگلوں میں رہنے والے لوگ کوتاہ قامت ہی ہوا کرتے ہیں مگر ان بونوں جیسے نہیں...... ایک اوسط بونے کا قد چار فٹ تک ہوتا ہے۔ جبکہ عورت ڈیڑھ فٹ چھوٹی ہوتی ہے۔

ان بونوں میں شادی بیاہ کے لیے ایک میلا منعقد کیا جاتا ہے۔ اس میں مرد عورتیں اپنی پسند کے ساتھی چن لیتے ہیں۔ پھر ان کی آپس میں شادیاں ہوتی ہیں۔ اس موقع پر قدیم رسوم و رواج کے مطابق خوب گایا بجایا جاتا ہے۔ تمام قبیلے کی دعوت کی جاتی ہے۔ خوبصورتی بڑھانے کے لیے دلہنوں کے اگلے دانت ریتی سے گھسا کر نوکیلے بنائے جاتے ہیں۔

افریقی بونے شکار کے دیوانے ہیں۔ ان کے محبوب شکاری جانور چھوٹے ہرن اور بارہ سنگھے ہیں۔ انھیں یہ جال لگا کر پکڑتے ہیں۔ یہ جنگل میں بہت اندر جا کر اس کی گہرائی میں اتر جاتے ہیں۔ وہاں گھنے درختوں کے سبب دن کو بھی رات جیسی تاریکی ہوتی ہے اور زمین پر پتوں کا قالین سا بچھا ہوتا ہے۔

یہ بونے زبردست قسم کے کھوجی بھی ہیں۔ الجھی ہوئی بیلوں، گھنی جھاڑیوں، گھاس پھونس اور کیچڑ میں بآسانی اپنا راستہ بناتے اور معلوم کر لیتے ہیں کہ وہاں سے ابھی کون جانور گزرے ہیں۔ جو بونا سب سے زیادہ ماہر شکاری اور کھوجی ہو، اسے تمام بونے اپنا سردار تسلیم کرتے ہیں۔ جانوروں کا شکار کرنے کے لیے یہ ایک موزوں جگہ دیکھ کر وہاں جال بچھاتے ہیں۔ یہ جال انگور کی بیلوں سے بنتے ہیں۔

جال کے ذریعے جانوروں کا شکار آسان نہیں۔ کیونکہ چھوٹے ہرن اور دوسرے جانور جب شکاریوں کی آوازیں سنیں تو فوراً بیل بوٹوں میں چھپ جاتے ہیں۔ شکاری انھیں خوف زدہ کرنے کے لیے خوب شور مچاتے اور انھیں جال کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ جب کوئی جانور جال میں پھنس جائے، تو وہ خوب اچھلتے کودتے ناچتے گاتے ہیں۔

یہ بونے بھی عام انسانوں کی طرح راگ اور موسیقی کے رسیا ہیں۔ ایک امریکی لوئیس سارنو نے ان

کے گیت ریکارڈ کیے۔ وہ کہتا ہے ''بونوں کے بچے بولنے کے ساتھ ہی گانا بھی سیکھنے لگتے ہیں۔ گیبون سے لے کر کانگو تک تمام بونے ایک ہی لے میں گاتے ہیں۔''

بونوں کی زندگی گروہی ہے۔ شکار کی صورت انھیں جو خوراک ملے، وہ اسے مل جل کر کھاتے ہیں۔ ان میں خاندانی روابط بے حد مضبوط ہیں۔ ہر گروہ اپنے اصولوں کی سختی سے پاسداری کرتا ہے۔ ان سے روگردانی شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ بونوں میں لڑائی جھگڑوں کی نوبت نہیں آتی۔ وہ کبھی دوسرے گروہوں سے بھی نہیں لڑتے۔

بارشوں کے دنوں میں شکار کی فراوانی ہوتی ہے۔ لیکن ان دنوں بونے شکار سے زیادہ اپنی زمینوں پر سبزیاں کاشت کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ چار سو سال قبل خوردنی تیل کے کچھ پودے برازیل سے افریقا لائے گئے تھے۔ ان کی کاشت اب بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔

یہ بونے جنگل سے باہر بانٹو کسانوں سے مال کے بدلے مال کے طریقے پر تجارت کرتے ہیں۔ یہ گوشت، جنگلی شہد اور کھمبیوں کے بدلے ان سے اشیائے ضرورت لیتے ہیں مثلاً اناج، کپڑے وغیرہ۔ بانٹو قبائلی دراز قامت ہیں۔ انھوں نے جب پہلی مرتبہ ان بونوں کو دیکھا تو بمشکل ہی یقین کیا کہ وہ واقعی سرزمین افریقا میں اپنا وجود رکھتے ہیں۔ انھوں نے بونوں کو شرمیلا، بے ضرر اور اپنے ہی خول میں بند رہنے والا پایا۔

بونے بانٹو لوگوں کی انوکھی چیزوں مثلاً کھانا پکانے کے برتنوں، دھاتی نیزوں، تیروں اور خنجروں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے حصول کی خاطر وہ کئی ماہ جنگل کی رہائش ترک کر بانٹوؤں کے کھیتوں میں کام کرتے اور معاوضے میں یہ چیزیں حاصل کر لیتے ہیں۔ صدیوں تک بانٹو زمین داران بونوں کو اپنے موروثی زرعی غلام سمجھتے رہے۔ ان کے درمیان تعصب کی دیوار اب تک کھڑی ہے۔ مغرور اور اونچے دماغ والے بانٹو بونوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

انسانی حقوق کی انجمنیں ہر جگہ مظلوم، دبے کچلے ہوئے اور ناانصافی کے شکار لوگوں کو انصاف دلانے اور ان کی حالت سدھارنے کے لیے سرگرم عمل رہتی ہیں۔ لیکن جمہوریہ وسطی افریقا کے بونوں کو وہ نظر انداز کر رہی ہیں۔ روانڈا، کانگو اور گیبون میں آباد بونوں کے ساتھ بھی بڑی بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ انھیں اپنی محنت کا خاطر خواہ معاوضہ نہیں ملتا۔ آجر ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک بھی نہیں کرتے۔ حکومتیں جنگلوں پر ان کے حقوق مالکانہ تسلیم نہیں کرتیں حالانکہ وہ صدیوں سے وہاں آباد ہیں۔

بونے جنگل کی زندگی ترک کرنے کو تیار نہیں۔ پھر بھی وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجنا پسند کرتے ہیں۔ ایک بونا کہتا ہے ''میں اپنے بچوں کو دونوں دنیاؤں میں زندگی گزارنے کی تعلیم دلاؤں گا۔ ایک جنگل کی دنیا' دوسرے شہر والی...... یہ قدیم رسوم و رواج پر کاربند رہتے ہوئے جدید دنیا کے تقاضے پورے کرنے کی بہترین مثال ہے۔ لیکن کیا اسکولوں میں تعلیم پا کر نکلنے والے بونے بچے جنگلی زندگی کی طرف پلٹ سکیں گے؟ پتھر کے زمانے سے لے کر کتاب کے زمانے کے

درمیان واقع خلا پھلانگنا آسان بات نہیں۔

بچوں کی تعلیم زیادہ تر پرائمری کی سطح تک ہی محدود رہتی ہے۔ چند ایک ہی ثانوی اسکولوں میں جا پاتے ہیں۔ ان بونوں کی جدید زمانے میں کامیاب ترین چھلانگ موساپولا سے تیس میل دور جانب شمال موناساؤ کے کیتھولک مشن میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہاں ایک ہزار کے لگ بھگ بونے بانٹوؤں کی مداخلت بے جا سے آزاد مونگ پھلی اور دیگر نقد آور اجناس کی کاشت کاری میں مصروف ہیں۔ اس محنت کے بدلے انھیں اشیائے ضرورت دینے کے ساتھ ہی مسیحیت قبول کرنے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے جسے قبول کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔

بونے بے یاکا نامی ایک عظیم ہستی کی عبادت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ موکونڈی یعنی ارواح جنگل کو بھی مقدس سمجھتے ہیں۔ ان میں سب سے طاقتور موکونڈی ''اہجنگی'' ہے۔ یہ مخصوص راتوں میں جنگل میں نزول کرتی ہے۔ جب اس کے نزول کا وقت ہو، تو ہر سو خاموشی چھا جاتی ہے۔ سب لوگ چپ چاپ کھڑے جنگل کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ پھر درجن بھر بونے ایک ایسی مخلوق کو اپنے درمیان لیے جنگل سے نمودار ہوتے ہیں جو سر تا پا لمبے لمبے تنکوں میں ملفوف ہوتی ہے۔ اس کے کوئی خدوخال اور اعضا وغیرہ نہیں ہوتے۔ یہی ''اہجنگی'' ہے۔

اس کے نمودار ہوتے ہی سب لوگ شدید عالم خوف میں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ''اہجنگی'' اپنے منہ سے کچھ نہیں بولتی، ہمراہی اس کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ جنگل سے باہر کھلی جگہ پر نکل کر ''اہجنگی'' ناچنے کودنے لگتی ہے۔ ساتھ ہی ڈھول بجنا شروع ہوجاتے ہیں۔ ڈھولوں کی تھاپ میں تیزی آنے کے ساتھ اہجنگی کا رقص بھی تیز تر ہوجاتا ہے۔ تمام بونے بھی جنونی انداز میں ناچنے لگتے ہیں۔ یہ رقص ساری رات جاری رہتا ہے۔ صبح ہوتے ہی ''اہجنگی'' اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جنگل میں غائب ہو جاتی ہے۔

◆◆◆

نصیر الدین طوسی

☆ دوست ہزار بھی کم ہیں اور دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔
☆ جو شخص ناممکن کے پیچھے بھاگتا ہے وہ ممکن سے بھی رہ جاتا ہے۔
☆ آنکھیں بند کر لینے سے سورج کی روشنی کم نہیں ہو جاتی۔

یعقوب بن اسحاق الکندی

☆ جو شخص جتنا اچھا ہوتا ہے اس کے دشمن اور حاسد اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔
☆ جو شخص تیری باتیں خوشدلی سے نہیں سنتا تو اس کے سننے کا احسان اپنی باتوں سے اٹھا لے۔
☆ ہر حسین چیز اچھی نہیں ہوتی لیکن ہر اچھی چیز لازماً حسین ہوتی ہے۔
☆ بیمار کی عیادت خدا کی عبادت ہے۔

(انتخاب: عابد شفیع، لاہور)

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ اس کی 3 بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بغور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے 2 سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو "اردو ڈائجسٹ" کے 6 شماروں کی اعزازی ترسیل کے علاوہ منشورات کی 2 خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتا: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ** 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

ماہ دسمبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز 1۔ (الف) پونجا جناح (ب) ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء، ۱۱ دسمبر ۱۹۴۸ء

قصہ کوئز 2۔ (الف) امی بائی (ب) ۱۹۱۸ء

درست جوابات دینے والوں کے نام

علی زیب احمد (قصور)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ خان (لاہور)، ثاقب محمود بٹ (راولپنڈی)، اویس شیخ (ٹوبہ ٹیک سنگھ)، محمد الیاس (منڈی بہاؤالدین)، شمیم اختر (فیصل آباد)، عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)، طاہرہ عنایت (پشاور)، منظور احمد بھٹیو (نواب شاہ)، منور سعید خانزادہ (سکرنڈ)، محمد اسحاق زہری (ٹمیاری سندھ)، محمود منور خان (سرگودھا)، اویس حبیب (فیصل آباد)، محسن حبیب (فیصل آباد)، محمد حبیب (فیصل آباد)، حیان کاشف (حیدرآباد)، محمد تنزیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، محمد شکیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، محمد وسیم (میر پور خاص)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)، نصیر احمد رضا (فیصل آباد)، محمد زاہد انور (فیصل آباد)، وحید نذیر (بورے والا)، اسدق امین (اسلام آباد)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- محمد اسحاق زہری (ٹمیاری سندھ)
- عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)

آپ کو 6 ماہ تک اُردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گے

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام و پتا اور موبائل یا پی ٹی سی ایل نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔ اس کے بغیر کوریئر سروس کا نمائندہ آپ تک نہیں پہنچ پاتا۔ (ایڈیٹر)

قصہ کوئز/۱

30 رمضان المبارک 256 ہجری کو عظیم محدث کی ازبکستان کے شہر بخارا میں وفات ہوئی۔ آپ کا پورا نام محمد بن اسماعیل ابوعبداللہ الجوفی ہے۔ سترہ سال کی عمر میں والدہ کے ساتھ حج کرنے گئے تو تحصیل علم کے لیے وہیں اقامت گزین ہو گئے۔ سالوں کی محنت کے بعد ایک ایسی کتاب مرتب کی جس نے آپ کا نام عالم اسلام میں زندہ و تابندہ کر دیا۔ وہ حدیث کی مستند ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ آپ نے اس کتاب کی تدوین و تالیف کے لیے اسلامی دنیا کے متعدد سفر کیے اور قریباً اسی ہزار اشخاص سے حدیثیں جمع کیں۔ آپ کو چھ لاکھ کے قریب احادیث پورے متن و اسناد سمیت زبانی یاد تھیں۔

1۔ ان محدث کا نام بتائیں وہ کس ملک میں پیدا ہوئے؟

2۔ ان کی کتاب کا نام بتائیں جو قرآن پاک کے بعد دوسری معتبر کتاب مانی جاتی ہے؟

قصہ کوئز/2

وسطی ایشیا کا اہم ترین اسلامی ملک تقریباً ایک صدی تک روس کے زیر اثر رہنے کے بعد اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور اب ایک آزاد ملک ہے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کے بہت سے مراکز اور تاریخی مقامات یہاں واقع ہیں۔ ہندوستان کا پہلا مغل بادشاہ بابر ازبک تھا۔ یہاں کی موجودہ آبادی دو کروڑ 42 لاکھ کے قریب ہے۔ مسلمانوں کی تعداد 88 فیصد ہے جن میں زیادہ ترسنی ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں اس پر سکندر اعظم نے قبضہ کیا۔ آٹھویں صدی کے دوران میں یہاں کے ترک قبائل نے عرب فاتحین کے زیر اثر اسلام قبول کیا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں چنگیز خان کی سرکردگی میں منگولوں نے پے در پے حملے کر کے یہ علاقہ سلجوق ترکوں سے ہتھیا لیا۔ روس نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے تحت ان پر بہت حملے کیے، آخر کار انیسویں صدی کے وسط میں روسی افواج نے اس کے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا۔

1: کونسے ملک کا تذکرہ ہے اور اس کا دارالحکومت کونسا شہر ہے؟

2: اس ملک نے روس سے اپنی خودمختاری کا اعلان کب کیا؟

قصہ کوئز/3

ترکی کا ایک شہر جو براعظم یورپ میں واقع ہے۔ اس کا نام قسطنطین اعظم کے نام پر 11 مئی 330ء کو رکھا گیا تھا۔ اسلامی دور میں اسے قسطنطنیہ کے نام سے پکارا گیا البتہ عثمانی حکمرانوں احمد ثالث سے سلیم ثالث تک سکوں پر اس شہر کا نام لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس شہر پر مسلمانوں کا پہلا حملہ 51ھ/672ء میں یزید بن معاویہ کے ہاتھوں ہوا۔ سات سال کے محاصرے کے بعد وہ ناکام لوٹ گیا۔ اس محاصرے کو اس لحاظ سے شہرت حاصل ہے کہ اس میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ شہید ہوئے اور شہر کی دیواروں تلے دفن ہوئے۔ 782ء میں خلیفۃ المہدی کے فرزند ہارون نے اپنے لشکر کے ہمراہ ایشیائے کوچک سے کوچ کیا اور ملکہ ایرین سے خراج وصول کیا۔ اس نے شہر کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا۔ مگر شہر پر قبضہ کی پہلی کوشش عثمانی سلاطین کے عہد میں ہوئی جب کہ بایزید اول نے 1396ء میں اس شہر کا محاصرہ کیا جو چند ماہ تک جاری رہا تھا۔

1: کس شہر کا ذکر ہے اور یہ کس ملک میں واقع ہے؟

2: اس شہر میں موجود دو مشہور عجائب گھروں کے نام بتائیں؟

◆◆◆

حضرت ابوبکر صدیقؓ

مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: انجم سلطان شہباز۔
ناشر: بک کارنر، بک اسٹریٹ جہلم، فون: ۰۵۴۴-۶۱۴۹۷۷۔ قیمت: ۷۸۰ روپے۔

علما و دانش وران امت مسلمہ کے زوال کی مختلف وجوہ بیان کرتے ہیں۔ راقم کے خیال میں ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مسلمان حکمران حقیقی اسلامی تعلیمات سے کنارہ کشی اختیار کر چکے۔ انھوں نے اس طرز حکمرانی کو خیر باد کہہ دیا جسے نبی کریمﷺ نے اپنایا اور جس پر خلفائے راشدین بھی کاربند رہے۔

خلیفہ اول، حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی کی مثال لیجیے۔

آپ کا شمار قریش کے دولت مندوں میں ہوتا تھا۔ مگر جب اسلام لائے، تو اپنی ساری دولت اس نئے عظیم الشان مذہب کی ترقی و ترویج میں لٹا دی۔ حضور اکرمﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: "مجھے اور اسلام کو سب سے زیادہ ابوبکرؓ نے فائدہ پہنچایا۔" (مسند احمد)

حضرت ابوبکر صدیقؓ جب خلیفہ بنے، تو تا وفات درویشی زندگی بسر فرمائی۔ آپؓ کو پیوند لگے کپڑے پہننے سے بھی عار نہ تھا۔ دورانِ خلافت آپؓ نے کوئی محل نہیں بنایا، اونٹوں کے گلے کھڑے نہیں کیے اور نہ ہی مال جمع کیا بلکہ آپؓ کی تمام تر توانائی ترویج اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی و فلاح کے کاموں پر مرکوز رہی۔ یہ ہے سچا و حقیقی اسلامی طرز حکمرانی!

زیر تبصرہ کتاب انہی جلیل القدر خلیفہ اول کی حیات مبارکہ نہایت تفصیل سے ہمارے سامنے لاتی ہے۔ مصری محقق نے پیدائش سے لے کر وفات تک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زندگی کے سبھی واقعات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ یوں ایک ایسی سبق آموز زندگی ہمارے سامنے آتی ہے جس پر چلتے ہوئے ہم بھی
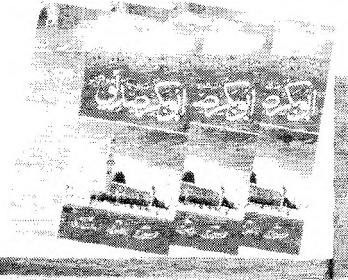
اپنی زندگیوں کو مثالی و اسلامی بنا سکتے ہیں۔

ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب صوری و معنوی لحاظ سے بھی دیدہ زیب ہے۔ سیرت خلفائے راشدین سے دلچسپی رکھنے والے اسے من پسند کتاب پائیں گے۔

اسلامی فلاحی ریاست

مصنف: محمد وقاص خان۔ ناشر: محنت پبلی کیشنز، مرکز تحریک محنت، جی ٹی روڈ، واہ کینٹ۔ فون: ۰۵۱۔۴۹۰۴۰۵۲۔۵۳۔ قیمت: درج نہیں۔

مغربی دانشور خود لکھتے ہیں کہ دور جدید کی مغربی حکومتوں نے شوریٰ (جمہوریت)، انسانوں کی مساوات اور فلاح و بہبود کا تصور اسلام سے لیا ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں وہ فلاحی اور عوام دوست حکومت وجود میں آ چکی تھی جس نے چودہ سو برس بعد یورپ میں جنم لیا۔

لیکن مغربی جمہوری حکومتوں میں اللہ تعالیٰ نہیں، عوام کو مقتدر اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی لیے ان حکومتوں کا نظام دنیاوی و مادہ پرستانہ زیادہ ہے۔ جبکہ اسلامی مملکت ان حدود و قیود پر عمل کرنے کی پابند ہے جو قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں۔

دور حاضر کے مغربی دانشور اکثر مطالبہ کرتے ہیں کہ ایک اسلامی ملک میں کس قسم کا حکومتی نظام نافذ کیا جائے؟ وہ اس ضمن میں اسلامی فرقوں کے مابین پائے جانے والے اختلافات نمایاں کرتے ہیں۔ اب جناب محمد وقاص نے زیرنظر کتاب اسلامی ریاست کا منصوبہ بڑے جامع انداز میں پیش کیا ہے۔اس منصوبے کی خاصیت ہے کہ یہ ان خامیوں و قباحتوں سے پاک ہے جو مغربی حکومتوں میں عام ہو چکیں۔ اس کا مقصد صرف عوام کی ترقی، بھلائی و خوشحالی ہے۔

کتاب صوری و معنوی لحاظ سے عمدہ ہے۔ اسلامی ریاست سے دلچسپی رکھنے والے مرد و زن اسے مرغوب کتاب پائیں گے۔

سو عظیم مسلم شخصیات
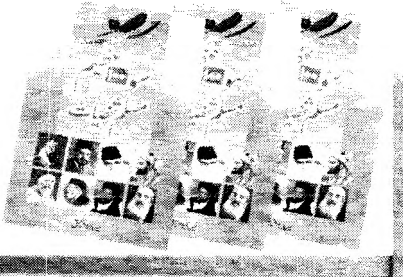
مصنف: میر بابر مشتاق۔ ناشر: عثمان پبلی کیشنز، اے۔۸، بلاک بی۔۱۳، ریلوے ہاؤسنگ اسکیم، گلشن اقبال، کراچی۔ فون: ۰۳۶۴۔۴۸۷۴۰۷۴۔ قیمت: ۵۴۰ روپے۔

امریکا کے مشہور صدر، تھیوڈور روز ویلیٹ کا قول ہے: ''آپ کو ماضی کے متعلق جتنی زیادہ معلومات ہوں گی، آپ مستقبل کو اتنا ہی بہتر بنا سکیں گے۔'' یہ

خوبصورت بات علم تاریخ کی اہمیت بخوبی اجاگر کرتی ہے۔خصوصاً ہم مسلمانوں کے لیے اپنی تاریخ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

وجہ یہ ہے کہ محض ایک ہزار سال قبل مسلمان دنیا میں سپر پاور کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ہر شعبے ہائے زندگی میں چھائے ہوئے تھے اور انھوں نے انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کئی عظیم کارنامے انجام دیے۔لیکن بوجوہ مسلمان زوال پذیر ہو گئے اور اب تک دنیا میں پہلے جیسا مقام حاصل نہیں کر سکے۔

جناب میر بابر مشتاق ایک دردمند مسلمان اور عمدہ محقق ہیں۔آپ اپنی تحریروں میں اغیار کی سازشیں آشکار کرتے اور مسلمانوں کو زوال سے نکلنے کی تدابیر بتاتے ہیں۔ زیرتبصرہ کتاب بھی اسی سعی کی ایک کڑی ہے۔ مرتب نے کتاب میں ان قابل رشک اور یادگار زمانہ اسلامی شخصیات کو جمع کر دیا ہے جنھوں نے مذہب' اخلاق' سائنس' فقہ' قانون' حکومت اور سیاست کے شعبوں میں زبردست کارنامے انجام دیے۔

ان عظیم شخصیات کے بارے میں پڑھنے سے افشا ہوتا ہے کہ جمہوریت اور انسانی حقوق کے فروغ سے لے کر سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی تک مسلمانوں نے کئی میدانوں میں اپنے کمالات فن دکھائے اور انسانی تہذیب وتمدن کو بنا سنوار دیا۔ یہ کتاب اسلامی عظمت کے اسی عہد رفتہ کو بڑی خوبصورتی سے عیاں کرتی اور ہمیں فخر و حوصلہ بخشتی ہے۔

سو عظیم مسلم شخصیات میں خلفائے راشدین' حضرت خالدؓ بن ولید' علمائے کرام' فقہائے کرام اور دور حاضر کی مشہور شخصیتوں مثلاً مولانا مودودیؒ' حسن البنا' سید قطب شہید' مولانا محمد الیاس' ڈاکٹر نجم الدین اربکان وغیرہ پر سیر حاصل خاکے موجود ہیں۔

کتاب کی پیش کش عمدہ ہے اور کاغذ معیاری! تاریخ اور سوانح حیات سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اس تصنیف کو پسند کریں گے۔

ایک ہی مٹی کے لوگ
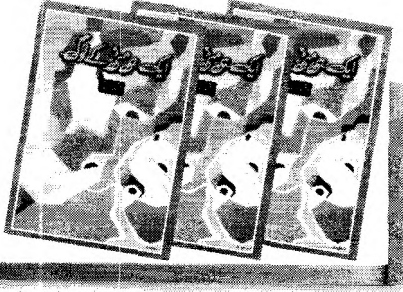
مصنف: سلطان جمیل نسیم۔ ناشر: بختیار اکیڈیمی، A/49-3، گلشن اقبال کراچی۔ قیمت: ۴۰۰ روپے

ٹیری پرائیسٹ (پ:۱۹۴۸ء) برطانیہ کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنی ایک تحریر میں کہانی کی اہمیت کچھ یوں اجاگر کرتے ہیں: ''لوگ سمجھتے ہیں کہ انسان کہانیاں تخلیق کرتے ہیں، حالانکہ معاملہ اس کے الٹ ہے۔'' گویا پرائیسٹ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کہانیاں انسان کی زندگی سنوارنے اور اسے درست راہ دکھلانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اصلاحی کہانیوں کا یہ بڑا مثبت روپ ہے۔

جناب سلطان جمیل نسیم بھی ایسی کہانیاں تخلیق کرتے ہیں جو انسان کے کردار کی تشکیل میں معاون بن سکیں۔ اسے نیک و بد کے مابین تمیز کرنا سکھائیں اور معاشرے کا مفید شہری بنا دیں۔ آپ مشہور شاعر، صبا اکبر آبادی کے فرزند اکبر ہیں۔

صاحبِ کتاب طویل عرصے سے شاندار افسانے لکھ رہے ہیں، تاہم ''پبلک ریلشننگ'' کمزور ہونے کے باعث ویسی شہرت نہ پا سکے جس کے آپ حق دار تھے۔ راقم کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ شہرت یا دولت کمانے نہیں اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے افسانے لکھتے ہیں۔ ذہنی محنت و مشقت سے ایک خوبصورت و موزوں افسانہ تخلیق کر کے انھیں جو سچی مسرت وخوشی ملے، شاید وہ اسی کو شافی و کافی سمجھتے ہیں۔

آپ کے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے، زیرتبصرہ پانچواں مجموعہ ہے۔ اس میں چودہ افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا موضوع سلگتا کراچی ہے جہاں سیاسی راہنما اپنے مفادات کی خاطر لسانی و مذہبی فسادات کراتے رہتے ہیں۔ نارِفسادات نے عروس البلاد، کراچی کو کسی لٹی پٹی بیوہ کی صورت دے ڈالی مگر افسوس' مفاداتی لڑائی اب بھی جاری ہے۔

''ایک ہی مٹی کے لوگ'' کے افسانے ہمیں جدید دور کے مسئلوں سے آگاہ کرتے اور برہنہ سچائیاں سامنے لاتے ہیں۔ افسانے پڑھنے کے شوقین اس مجموعے کو قابل مطالعہ اور پسندیدہ پائیں گے۔ کتاب کی اشاعت و طباعت معیاری ہے اور اس لحاظ سے قیمت چنداں زیادہ نہیں۔

اونٹ: جدید طبی فوائد

منصف: ڈاکٹر سید صلاح الدین قادری۔ ناشر: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اردو بازار کراچی، فون: ۳۲۶۹۷۲۴-۰۲۱۔ قیمت: درج نہیں۔

قرآن پاک میں ارشادِ الٰہی ہے: لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ انھیں کیسے پیدا کیا گیا؟'' (الغاشیہ: ۱۷)

جب اونٹ کی گوناگوں خصوصیات دیکھی جائیں، تو بہ مصداق قرآن پاک وہ واقعی اللہ تعالیٰ کے معجزے کی جیتی جاگتی نشانی نظر آتا ہے۔

جناب ڈاکٹر صلاح الدین قادری جامعہ ملیہ ڈگری کالج، کراچی میں لیکچرار حیوانیات ہیں۔ انھوں نے محنت شاقہ کے بعد زیرتبصرہ کتاب مرتب کی ہے جس میں اونٹ کی عمومی معلومات دینے کے علاوہ اس کے گوشت اور دودھ کے طبی فوائد بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ یہ معلومات واضح کرتی ہیں کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ انسانی صحت کے لیے بہت مفید ہے۔

محقق موصوف کی تحقیق افشا کرتی ہے کہ دودھ سرطان، ہیپاٹائٹس، استسقا، تپ دق اور گردوں کی بیماریوں میں شافی ہے۔ یہ کتاب گویا اونٹ کا مختصر انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں اس جانور سے دلچسپی رکھنے والوں کو بہت سی قیمتی معلومات مل جائیں گے۔ کتاب کی طباعت و پیش کش بہت عمدہ ہے۔ اپنی تندرستی کو فوقیت دینے والے مرد وزن اسے مفید کتاب پائیں گے۔

دوا، غذا اور شفا

مصنف: ڈاکٹر آصف محمود جاہ۔ ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد۔ قیمت: ۱۳۰ روپے۔

حدیث نبوی ﷺ ہے کہ ہر مرض کی شفا موجود ہے۔ لیکن صحت پانے کے لیے ضروری ہے کہ علاج سے مدد لی جائے۔ دورِ حاضر میں علاج کرانا خاصا مہنگا

اور کٹھن مرحلہ بن چکا۔ مزید برآں بعض اوقات بدپرہیزی یا بدعملی سے معمولی بیماری بھی بڑھ کر خطرناک مرض بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر آصف محمود جاہ خدمت انسان کو عین عبادت سمجھتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے بہ سلسلہ علاج لوگوں کو مختلف مسائل میں گرفتار پایا، تو ان کی زندگی آسان بنانے کے لیے زیرتبصرہ کتاب لکھ ڈالی۔

دوا، غذا اور شفا میں بتایا گیا ہے کہ خدانخواستہ انسان کو کوئی بیماری چمٹے، تو کیونکر نمٹا جائے۔ چناں چہ اس میں مختلف بیماریوں میں استعمال ہونے والی ادویہ، ان کے مضر اثرات اور انتخاب سے متعلق بڑی مفید معلومات دی
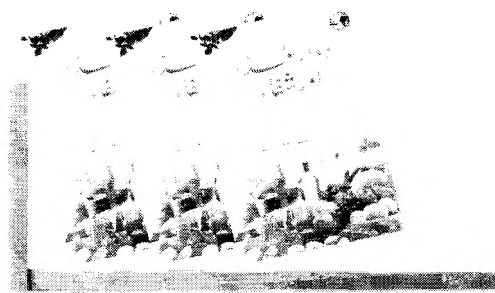
گئی ہیں۔ یہ خوبی کتاب کو عام گھرانوں کے لیے بہت مؤثر بنا دیتی ہے۔

جن گھرانوں میں خصوصاً بچے ہوتے ہیں، ان میں یہ کتاب موجود ہونی چاہیے تاکہ کسی طبی مسئلے یا آفت کی صورت اس سے بروقت نمٹا جا سکے۔ کتاب کی پیش کش معیاری ہے اور اپنی افادیت کے پیش نظر بہت کم قیمت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے امراض کا سمندر گویا کوزے میں سمیٹ دیا ہے۔

(تبصرہ نگار: سید عاصم محمود)

غلاموں کی نماز

(تُرکی وفدِ ہلالِ احمر لاہور میں)

کہا مجاہدِ تُرکی نے مجھ سے بعدِ نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمھارے امام

وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد
خبر نہ تھی اُسے کیا چیز ہے نمازِ غلام

ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دُنیا میں
انھی کے ذوقِ عمل سے ہیں اُمتوں کے نظام

بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مُرور غلاموں کے روز و شب پہ حرام

طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجّب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام!

فسطینی عرب سے

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

تیری دَوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

سنا ہے میں نے، غلامی سے اُمتوں کی نجات
خود کی پرورش و لذت نمود میں ہے!

(اقبالؒ)

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

''بھائی جی''

اردو ڈائجسٹ سے معلوم ہوا کہ قریشی برادران کے برادر بزرگ، گل حسن انتقال فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ الطاف حسن قریشی صاحب کے مقالہ خصوصی، بھائی جی سے مرحوم کی زندگی کے حالات پڑھ کر اوصاف حمیدہ سے واقفیت ہوئی اور یہ طمانیت ملی کہ انھوں نے خاندان کی سربراہی انتہائی خوبی سے نبھائی۔ اب ہم عمر کے ایسے حصے میں داخل ہو چکے کہ دم واپسیں کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ بھائی گل حسن جیسے صاحب کردار لوگوں کے سائے سے محرومی نے اس احساس میں مزید شدت پیدا کر دی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کے درجات بلند اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

محترمہ صغیرہ بانو شیریں کے انتقال سے بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ ان کا ''مشورہ حاضر'' بہت انہماک سے پڑھا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

(احسان الحق، مدیر بلوچستان ٹائمز)

بھائی جی کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ جل شانہ انھیں جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ الطاف صاحب کا تحریر کردہ ''بھائی جی'' پڑھا تو ہمارے دل میں رنگ و نور کا سیلاب اُبل پڑا۔ ہم مرحوم اور سارے مسلمانوں کے لیے اللہ جل شانہ سے عافیت طلب کرتے ہیں۔ (عبداللہ، لاہور)

معیاری تحریروں سے سجا گلدستہ

شمارہ دسمبر نظر نواز ہوا۔ یہ دلچسپ اور معیاری تحریروں سے سجا گلدستہ دل کو بھا گیا۔ محترمہ نسرین جلیل کا انٹرویو محنت، کردار اور اخلاق سے عبارت تھا۔ ''مشورہ حاضر ہے'' کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہو سکے تو کھیلوں کے پاکستانی ہیروؤں کے بارے میں بھی لکھیے۔ آخر میں پوری ٹیم کو اتنی اچھی کاوش پر مبارک باد۔ (محمد اویس دانش خانزادہ، سکرنڈ، نواب شاہ)

کرپٹ ملازمین

اردو ڈائجسٹ کے تمام صفحات اور تصاویر میں نکھار ہے اور کتابت بہت عمدہ۔ پروفنگ کا معیار بھی بہتر ہے۔ رسالے میں وقتاً فوقتاً میری کہانیاں شائع ہوتی ہیں جن کا مناسب اعزازیہ بھی موصول ہوتا ہے۔ تاہم اعزازی شمارہ

درمیان میں غتر بود ہو جاتا ہے۔ محکمہ ڈاک کے ملازمین شاید انھیں اپنے دوستوں کو بطور تحفہ دے ڈالتے ہیں۔ نجانے کرپشن کی یہ شکل کب ختم ہو گی؟ (بشیر احمد بھٹی، بہاول پور)

دو غلطیاں

شمارہ دسمبر میں شائع شدہ اپنی آپ بیتی زیر مطالعہ رہی۔ اس میں دو غلطیاں رہ گئیں جن کی تصحیح ضروری ہے۔ اول میرا نام "گہر اعظمی" ہے جبکہ مضمون میں "گوہر اعظمی" لکھا گیا۔ دوم میری آپ بیتی کا پہلا حصہ اگست نہیں ماہ اکتوبر میں شائع ہوا تھا۔

(گہر اعظمی، ڈیفنس، کراچی)

ناروے کے صوفی اصغر

یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے جب چک نمبر ۴۴۴، سمندری، فیصل آباد سے صوفی میاں محمد اصغر ناروے پہنچے۔ پھر انھوں نے اس مغربی ملک میں اسلام کی اشاعت کرتے ہوئے تن من دھن وار دیا۔

جب صوفی صاحب اوسلو میں مقیم ہو گئے، تو کسی بھی مسلمان کی رہائش گاہ میں تفہیم القرآن لے کر درس دینے لگے۔ شروع میں بہت کم مرد و زن تھے، پھر خدا تعالیٰ کے فضل سے ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

چناں چہ ایک عمارت، فولکیٹ ہاؤس میں ۴۰ کراؤن کرائے پر ایک کمرا لے لیا گیا۔ رفتہ رفتہ کئی پاکستانی اوسلو میں مقیم ہو گئے۔ ان کی اکثریت درس قرآن میں شریک ہوتی۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ شہر میں اسلامی مرکز تعمیر کیا جائے۔

۹۰ء کی دہائی کے آغاز سے اسلامی مرکز کی تعمیر کے لیے چندہ جمع کیا جانے لگا۔ اس مہم میں صوفی صاحب پیش پیش رہے۔ وہ کوئی غیر معمولی شخصیت نہیں تھے، مگر اسلام سے محبت اور ایمانی جذبے کی بدولت انھوں نے مخلص احباب کی ایک جماعت تیار کر لی۔

شبانہ روز جدوجہد رنگ لائی اور اسلامی مرکز کی تعمیر کے لیے مطلوبہ رقم جمع ہو گئی۔ آج اوسلو کے مرکز میں واقع "اسلامک کلچرل سینٹر" ہزارہا ناروژی مسلمانوں کی مذہبی و تہذیبی ضروریات بخوبی پوری کر رہا ہے۔ شہید دوسروں کی خاطر جان دیتا جبکہ محسن دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے، تو دوسرے کا تحفہ زندگی۔ صوفی صاحب ناروژی مسلمانوں کے لیے محسن ثابت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین (محمد ارشد فخر الدین، اوسلو، ناروے)

ہچکی کا نسخہ

شمارہ ستمبر میں حکیم عبدالوحید سلیمانی نے اپنے مضمون "مشورہ حاضر ہے" میں ہچکی دور کرنے کا نسخہ بتایا۔ ایک نسخہ میرے علم میں بھی ہے جو ڈاکٹر اسماعیل کی وساطت سے معلوم ہوا۔ آپ لال کرتی (راولپنڈی) میں مطب کرتے تھے۔

ایک دن ان کے پاس بیٹھا تھا کہ ایسا مریض آیا جسے دو دن سے مسلسل ہچکی آ رہی تھی اور بند ہونے کا نام نہ لیتی۔ مطب کے سامنے پھل والا کھڑا تھا۔ ڈاکٹر اسماعیل نے ملازم سے بڑا سا خاکی لفافہ منگوایا اور مریض سے کہا کہ اس سے اپنا منہ ڈھانک لو۔

مریض نے لفافہ چہرے پر ایسے لگایا کہ منہ اور ناک اس کے اندر آ گئے۔ تب ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ لفافے کو پکڑے کچھ دیر ایسے ہی بیٹھے رہو۔ چناں چہ مریض لفافے کے اندر ہی سانس لینے لگا۔ دس منٹ بعد اس کی ہچکی بند ہو گئی۔

اس نسخے کا فائدہ یہ ہے کہ اسے اپنانے میں کوئی نقصان نہیں۔ خدانخواستہ آرام نہ آئے، تو حکیم صاحب کے تیر بہدف نسخے سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ (جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی)

نوٹ

قارئین کرام بذریعہ ای میل بھی اپنی آرا اور تجاویز بھیج سکتے ہیں۔ قارئین کے تبصروں سے ہمیں رسالے کا معیار بڑھانے اور بہتری لانے میں مدد ملتی ہے۔ ہمارا ای میل پتا یہ ہے: editor@urdu-digest.com

(ادارہ اُردو ڈائجسٹ)

گوشۂ سوشل میڈیا

آج کل کے دور میں فیس بک زندگی کا اہم جزو بن چکی۔ لاکھوں پاکستانی اپنی خوشی، غمی اور دلچسپ معلومات وغیرہ اسی سوشل سائٹ کے ذریعے دوستوں سے شیئر کرتے ہیں۔ اُردو ڈائجسٹ ۵۴ سال سے اُردو زبان کی ترویج کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ موجودہ دور کی ضرورت مدنظر رکھتے ہوئے اُردو ڈائجسٹ بھی فیس بک پر شاعری، نثر، اقوال، احادیث و فرمان الٰہی اور مختلف اسلامی، سائنسی، سیاسی، معاشی، سماجی واقعات شیئر کر رہا ہے۔ یوں نہ صرف اُردو زبان کی ترویج ہو رہی ہے بلکہ دوسری زبانوں والے بھی اس سے آشنا ہو رہے ہیں۔

بہت سے قارئین ای میل، فیس بک اور بذریعہ ڈاک ہمیں اُردو زبان کی بہتری کے لیے تجاویز دیتے اور شاعری و نثر میں اپنی کاوشیں بھی بھیجتے ہیں۔ ہم قارئین کی تجاویز، تحسین و تنقید کو دل سے اپناتے اور اس بات پر اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ اُردو کی ترویج میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ آپ اپنی تجاویز، ستائش و تنقید اور تحریریں ہمارے ای میل، فیس بک اور دفتری پتے پر بھجوائیں جن کا ہم خیر مقدم کریں گے۔ ہمارا پتا یہ ہے: ۳۲۵ جی-III جوہر ٹاؤن لاہور۔ ای میل editor@urdu-digest.com (ادارہ)

پاک دھرتی کا قرض

ہم اس سوہنی دھرتی پر نئی صبح جگائیں گے
[illegible] شفاف سوچوں کو باہم کر کے نئی تقدیر بنائیں گے
ہم اس ارضِ وطن پر ریشمی خواب جگائیں گے
اور اِن خوابوں کے در پردہ نیا دور دکھائیں گے
ہم اس پاک دھرتی کا قرض کیسے چکائیں گے؟
اب پرچم کے سائے میں نئی جستجو کا سفر ہے
ہم محبت خیز جذبوں کے نئے دیپ جلائیں گے
اب سر پر ہو سایہ فگن مذہب عظیم
ہم قرآن کی روشن شمعوں سے نفرت کو مٹائیں گے
ہم سا سوہنی دھرتی پر نئی صبح جگائیں گے
(سعدیہ نوشین نثار، شکاگو، امریکا)

۱۔ آپ کا ڈائجسٹ بہت اچھا ہے۔ ۲۰۰۰ء سے پڑھ رہا ہوں۔ براہِ مہربانی اس میں شاعری بھی شامل کریں۔
(محبوب اقبال)

۲۔ اس میں بہت معلوماتی مضامین ہوتے ہیں۔ میں اردو ڈائجسٹ کو پسند کرتی ہوں۔ (کنول مہک)

۳۔ تصویر کے نیچے اپنا ٹیگ نہ لگایا کریں تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ شیئر کر سکیں۔ (بلال)

(ہمارے خیال میں امیج شیئر کرنے میں ٹیگ کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ بس ذرا وسیع القلبی کا مظاہرہ کریں۔)

۴۔ میں اردو ڈائجسٹ کا مستقل قاری ہوں اور اس کی ترقی و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ (وسیم ریاض)

۵۔ اردو ڈائجسٹ کے لیے لکھنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے کیا طریقہ کار ہے اور کیا میری کہانیاں اس میں شائع ہو جائیں گی۔ (ملیحہ نجم)

(اپنی کہانیاں ایڈیٹر کے ای میل ایڈریس یا پوسٹل ایڈریس پر بھیج دیں۔ شائع کرنے کا فیصلہ مضمون پڑھنے کے بعد کیا جائے گا۔)

۶۔ ایڈمن سے گزارش ہے کہ روزانہ دس تصویروں سے زیادہ نہ لگائیں کیونکہ میں ہر امیج شیئر کرتا ہوں۔ اس طرح میرے لیے ممکن نہیں رہتا۔ (کامران خان)

۷۔ میں اردو ڈائجسٹ کی گھر بیٹھے رکن کیسے بن سکتی ہوں۔ کیا یہ چھے ماہ تک میرے گھر ماہوار بھیجا جا سکتا ہے۔ طریقہ کار بتا دیں۔ (فاطمہ زاہد)

(ضرور آ سکتا ہے۔ آپ اُردو ڈائجسٹ کی سالانہ خریدار بن کے گھر بیٹھے ڈائجسٹ حاصل کر سکتی ہیں۔)

۸۔ مجھے اردو ڈائجسٹ پسند ہے۔ کیا آپ مجھے اس کی ایک کاپی بھیج سکتے ہیں۔ (فرح ذیشان ملک)

(اس کے لیے آپ کو اُردو ڈائجسٹ سالانہ خریداری کا رکن بننا ہوگا۔)

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: سجاد قادر

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر 18 سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ دسمبر میں دیے گئے اسلامی کوئز کے درست جوابات

اسلامی کوئز ۱۔(الف) ملتزم (ب) بیت اہل اسلامی کوئز ۲۔(الف) انکار کرنا (ب) اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی کو شریک کرنا

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ بشریٰ حبیب، کراچی 2۔ محمد بلال حسن، سرگودھا 3۔ اشتیاق احمد، مالاکنڈ 4۔ اظفر وقاص، ضلع راولپنڈی

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

ثاقب محمود بٹ (راولپنڈی)، اویس شیخ (ٹوبہ ٹیک سنگھ)، عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)، ظاہرہ عنایت (پشاور)، منور سعید قائزادہ (سکرنڈ)، محمد اسحاق زہرہ (ٹیاری سندھ)، اویس حبیب (فیصل آباد)، محسن حبیب (فیصل آباد)، بشریٰ حبیب (کراچی)، محمد منیر (حیدرآباد)، طٰہٰ یٰسین (حیدرآبا)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، ناعمہ تحریم (کراچی)، ماہ رخ (حیدرآباد)، اقبال سلیم (حیدرآباد)، احسن کمال (واہ کینٹ)، (واہ کینٹ)، فاطمہ سعد (واہ کینٹ) اظفر وقاص (ضلع راولپنڈی)، توصیف احمد (حیدرآباد)، محمد تنزیل عباس (سرگودھا)، محمد شکیل عباس (سرگودھا)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)، محمد بلال حسن (سرگودھا)، اشتیاق احمد (مالاکنڈ)

اسلامی کوئز1

حضرت بلالؓ ابن رباح کے مالک کو جب پتا چلا کہ حضرت بلالؓ مسلمان ہوگیا ہے تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے سزا دے کر اپنی بزدلی کا مظاہرہ کرے گا۔ اس نے کھجور کے ریشوں سے ایک پھندا بنوایا اور اس میں حضرت بلالؓ کی گردن پھنسا کر اسے ان لڑکوں کے ہاتھ میں تھما دیا جو رحم و ہمدردی کے نام تک سے ناآشنا تھے۔

(الف) حضرت بلالؓ کو رہا کس نے کرایا؟ (ب) حضرت بلالؓ کے مالک کا نام بتائیں؟

اسلامی کوئز2

حضرت سمیہؓ اسلام کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ مگر یہ ثابت قدمی اور ایسا صبر و استقلال تمام اسلام لانے والوں میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ چند مومنین ایسے بھی تھے جنھیں ظلم و تشدد کا نشانہ اس حد تک بنایا گیا تھا کہ وہ کمزور پڑ گئے ثابت قدم نہ رہ سکے اور آزاد کر دینے کی یقین دہانی پر ان کے منہ سے کفر والحاد کے الفاظ رواں ہوگئے تھے۔

(الف) حضرت سمیہؓ کو شہید کس نے کیا؟ (ب) عورتوں میں سب سے پہلے ایمان کون لائیں؟

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے درست لکھیں اور ساتھ میں اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر دینا لازم ہے ورنہ TCS پہنچ نہیں پاتا اور گزشتہ کئی ماہ سے ہمیں TCS واپس مل رہے ہیں۔ (مدیر اُردو ڈائجسٹ لاہور)